ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی ﷺ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد ششم

مشتمل بر تعلیمات اخلاقی

اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی اور اسلامی فلسفہ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے اور پھر اسلامی اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا ہے

(تالیف)

(مولانا) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

باہتمام مولانا مسعود علی ندوی

(طبع چہارم) در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ مطبوع گردید (۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء)

(کتبہ اقبال احمد)

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم

مضمون	صفحہ

اسلام کی اخلاقی تعلیم
کا
تکمیلی کارنامہ
۱۱۳ — ۱۸۵

تعلیمِ اخلاق کے طریقے اور اسلوب
۱۸۶ — ۲۰۲

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں
۲۰۳

حقوق وفرائض
۲۰۴ - ۳۵۰

فضائل اخلاق
۳۵۱ - ۵۸۷

رذائل
۵۸۸ - ۶۸۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الکتاب والحکمۃ والصلوۃ والسلام علی رسولہ
نبی الرحمۃ وعلی آلہ واصحابہ اولی العزم والھمۃ

اے تو، بہین صفت سزاوار	نام تو گرہ کشاے ہر کار
اے کردہ ز گنج خانۂ راز	بر آدمیان در سخن باز
عالم ز تو شد بحکمت آباد	حکمت ز تو یافت آدمی زاد

در قربت حضرت مقدس	پیغمبر پاک رہبرم بس
گنجینۂ کیمیاے عالم	بیش از ہمہ پیشواے عالم
نامش بسریر پادشاہی	توقیع سپیدی و سیاہی

(خسرو)

سیرت نبوی کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے، یہ ان اخلاقی تعلیمات

کی تفصیل اور تشریح میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی، اور سکھائی گئیں، یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں، اسی لئے عوام کے اس وہم کو دور، اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جزء اخلاق کی صحیح تربیت ہے،

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاقِ حسنہ اسمائے حسنیٰ کا پرتو ہیں، بار بار اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق خالقِ تعالیٰ کی کسی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہوسکتی، ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے، بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے، اس پر اُس صفت کا اطلاق مجازاً کردیتے ہیں، جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے، مگر خدا کی اس صفتِ علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں، حالانکہ حقیقی صفتِ علم خدا میں ہے، بندہ میں نہیں لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کردیتا ہے اسلئے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں[1]، ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے، اسلئے بہت سے اہلِ حق اور اہلِ تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے معارفِ لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ص ۲۷ مطبوعہ مدینہ بجنور،

اوصاف کا اشتراک، اشتراک بادنی مناسبت ہو اور بس، لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (شوریٰ)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آگیا ہے، اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے، اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں، جو آج اُن کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں، یا اُن کے موجودہ پیرو اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبرِ صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے، اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی وہ اس کے لئے بالکل مناسب تھی، یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُس کی ہمیشہ کے لئے تکمیل فرمادی گئی،

کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آگئے ہیں، چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے، اس لئے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھا نہیں گیا ہے، ایسے موقع پر اگر شک و شبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے،

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے، پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں، پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے،

فضائل، رذائل، اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیقِ کار مولانا عبد السلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے، موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گذار ہوں،

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط، اور مصالح و حکم کی تشریح میں اپنے ذوق و فکر

(۶)

کی رہبری سے چارہ نہ تھا، سہو و خطا انسان کی فطرت ہی، پھر کیونکر دعوی کروں کہ اس سے میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے،

سلسلۂ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا، اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے، تو میں نے اُن کو خواب میں دیکھا، کہ اُن کے سامنے اس کے بعض اجزار پڑے ہیں، اور وہ اُس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں، اور مسکرا رہے ہیں، رحمہ اللہ تعالیٰ،

دعار ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت میں اس آئینۂ محمدیؐ کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل وصورت کی تزئین وآرایش کا ذوق پیدا کرے، اور وہ سمجھیں کہ ایمان وعبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق وعادات کی درستی ہے،

طالبِ رحمت

سید سلیمان ندوی

۴ر ذیحجہ ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین،

تعلیماتِ نبوی کا تیسرا باب (۳)

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبویؐ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے، اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے، انسان جب اس دنیا میں آتا ہے، تو اُس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اُس کا تعلق پیدا ہوجاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے، اُس کے اپنے ماں باپ، اہل وعیال، عزیز ورشتہ دار، دوست واحباب، سب سے تعلقات ہیں، بلکہ

ہراُس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ، وطن، قومیت، جنسیت، یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اُس کے تعلقات ہیں، اور اُن تعلقات کے سبب سے اُس پر کچھ فرائض عائد ہیں،

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی، اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو حکومت وجماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں، تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لئے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ اُن کے قدم کو سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہ دے، دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب اسلام نے بھی یہی کیا ہے، آیندہ ابواب میں اسلام کی ان ہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے، اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے، اُس کو تفصیل سے بتانا ہے،

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے، چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا، اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی، اور ظلم برائی ہے، خیرات نیکی، اور چوری بدی ہے، لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے، خود آپ نے ارشاد فرمایا :-

بُعِثْتُ لاتمم حسن الاخلاق	میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں،
(موطا مالک حسن اخلاق)	

یہ امام مالکؒ کی موطا کی روایت ہے، مسند احمد بیہقی اور ابنِ سعدؒ وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں، آپ نے فرمایا :-

انما بعثت لاتمم مکارم	میں تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ

۱؎ کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۵ حیدرآباد، و زرقانی شرح موطا جلد ۴ ص ۲ و مطبعہ کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ،

الاخلاق،   کی تکمیل کروں،

چنانچہ آپؐ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کردیا، ابھی آپ مکہ ہی میں تھے، کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کیلئے مکہ بھیجا انھوں نے واپس آکر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی، وہ یہ تھے،

رأیتہ یامر بمکارم الاخلاق[1]   میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے.

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلواکر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی، اس کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا...... اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں[2]"

[1] صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲ صفحہ ۳۴۹ مصر [2] ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲، و مستدرک حاکم حیدرآباد ج ۲ ص ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعۂ ہجرت.

اسی طرح قیصرِ روم کے دربار میں ابو سفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا، کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ پاکدامنی اختیار کریں، سچ بولیں، اور قرابت کا حق ادا کریں[۱]"

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، (جمعہ - ۱)	یہ پیغمبر ان ان پڑھ جاہلوں کو پاک و صاف کرتا، اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے،

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں، ایک پاک و صاف کرنا، جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت،

۱- تزکیہ کے لفظی معنی پاک و صاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے، کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے، سورہ والشمس میں ہے،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا. فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا. قَدْ أَفْلَحَ	قسم ہے نفس کی، اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی

[۱] صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد، ۱۲،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (شمس)

الہام کردی، بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا، وہ کامیاب ہوا، اور جس نے اس کو مٹی میں ملایا، ڈوبا۔

دوسری جگہ ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ (اعلیٰ)

بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا، اور اپنے رب کا نام لیا، اور نماز پڑھی،

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکّی کے لفظ سے ادا کیا ہے،

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ (عبس)

پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا، اور تجھے کیا خبر ہے، شاید کہ وہ سنور جاتا، یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا،

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس "تزکیہ" کا مفہوم کیا ہے جس کو اُس نے پیغمبر اسلام علیہ السّلام کی خاص خصوصیت قرار دی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت ورسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دیں، اُن کو بُرائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور اُن کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں، چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دعوت

اور دشمن دونوں آپ کی اس خصوصیت کے قائل تھے،

۲۔ **حکمت**، اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے، گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے، مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم و عرفان کے معنی میں ہے جو نور الٰہی کی صورت میں نبیؐ کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے، اور جس کے آثار و مظاہر رسولؐ کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے اُن عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے، جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں، سورۂ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم، قرابت داروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے، اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے، اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے،

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (ع ۔ ۴)	یہ حکمت کی اُن باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا،

سورۂ لقمان میں ہے کہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۔ (ع ۔ ۲)	اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا کر،

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امور خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلم ہے، اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں "حکمت" کہا گیا ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو "حکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور قرآن پاک کے اس اظہار حقیقت سے کہ وحیِ محمدی کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے، یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں، خود قرآنِ پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا	اے ایمان والو، رکوع کرو، سجدہ کرو،
وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَ	اپنے رب کو پوجو، اور نیکی کرو، تاکہ تم
افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، (الحج - ۱۰)	فلاح پاؤ،

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوتِ محمدی کے جسم کے دو بازو ہیں، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا، اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے،

حقوقِ عباد کی اہمیت ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم محمدیؐ نے اخلاق

کی اہمیت کو، عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے، اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے، اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیئت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں، بلکہ اُن بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے، جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو، اور ظاہر ہے کہ اُن سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی، جو اس ارحم الرّاحمین کی بے نیاز ذات سے ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اُس (ظالم بھائی) کو چاہئے کہ اسی دنیا میں وہ اُس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرالے، ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی، اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں، ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ جائیں گی۔[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں نامۂ اعمال کی تین فردیں ہوں گی، ایک وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کرے گا، دوسری وہ جس میں سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑیگا، اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا، جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے، وہ شرک ہے، اور جس فرد کی کوئی پرواہ اس کو نہ ہوگی، تو وہ ظلم ہے، جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے، اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے، جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو، یا نماز نہ پڑھی ہو، تو اللہ تعالیٰ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۶

جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کردیگا، اور بخش دے گا، لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا، وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسری بندہ پر کیا ہوگا (مسند احمد و حاکم عن عائشہ رضؓ) اس سے معلوم ہوا کہ معاملاتِ انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟ چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے، جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے[1] اور زکوٰۃ بندہ کے اُسی مال میں فرض کی ہے، جو اُس کے اور اُس کے اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا، جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآنہ ہولیا،

اسلام کے ارکانِ پنجگانہ اور اخلاق

بعض اُن حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے، اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہوگیا ہے، حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتاچکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کردیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اُس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بُری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے، کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی

[1] یہ اصولِ فقہ کا مسئلہ ہے، دیکھو ہدایہ کتاب الحج ص ۲۱۳، مرتبہ مولانا عبدالحی مرحوم،

اور غمخواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل، اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرّیٰ ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں، قرآن پاک اور تعلیمِ نبوی کے جو اشارات اس باب میں ہیں حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں انکی پوری تشریح کردی ہے امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:۔

"خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لئے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو، اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہیں جنھوں نے گو شراب نہیں پی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو خدا اس کے گناہ کو معاف کر دیگا، پھر فرمایا کہ نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی، اور شرمندگی کا نام ہے اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ اے میرے اللہ جس نے یہ بات نہیں پیدا کی اسکی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا ہوں اسکی نماز قبول

کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہو، میری بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا، اور جو بھوکے محتاج کو میرے لئے کھانا کھلاتا ہے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز اسی لئے فرض کیگئی اور اسی لئے حج کے ارکان بنائے گئے تاکہ خدا کی یاد کیجائے" تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہو تو اس یادِ الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہو؟ حدیث میں ہو کہ آپ نے فرمایا کہ "جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہو"[1]

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہلِ تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے، اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ جس کو اسکی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے، اس کی نماز ہی نہیں[2]، اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ نے فرمائے ارشاد ہوا کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے، تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے[3]"، ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہو،

اخلاقِ حسنہ اور ایمان

اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہو کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہو لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے، جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں، اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لئے اس ایمان کی پہچان اسکے نتائج و آثار یعنی

[1] جلد اول باب فضیلۃ الخشوع [2] تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت آیتِ مذکور [3] صحیح بخاری و جامع ترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ کتاب الصوم،

اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے، جن پر اُن کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، الَّذِیْنَ	بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب
ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ،	ہوئے، جو اپنی نماز میں خضوع وخشوع
وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	کرتے ہیں، اور جو کمی بات پر دھیان
وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ	نہیں کرتے، اور جو زکوٰۃ دیا کرتے
وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ	ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
حٰفِظُوْنَ............	کرتے ہیں............
وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَ	.........اور جو اپنی اماتوں
عَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِیْنَ	اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں،
عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ہ	اور جو اپنی نمازوں کی پابندی
(مومنون-۱)	کرتے ہیں،

ان آیتوں میں اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاک دامنی اور ایفاے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے،

اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی

نیکیوں کی محرک تقویٰ ہے، وحی محمدی نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں، جن کے یہ اوصاف ہیں،

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	منہ پورب یا پچھم طرف کرو، بلکہ اصل
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	نیکی اس کی ہے جو خدا، قیامت پر،
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى	لایا، اور مال کی خواہش کے باوجود (یا
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافروں
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي	کو، مانگنے والوں کو، اور غلاموں کے
الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	آزاد کرنے میں دیا، اور نماز ادا کرتا
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ	رہا، اور زکوٰۃ دیتا رہا، اور جو وعدہ
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا	کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں،
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ	اور جو مصیبت، تکلیف اور لڑائی
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ	میں ثابت قدم رہتے ہیں، یہی وہ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ	ہیں، جو راستباز ہیں، اور یہی
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ، (بقرہ-۲۲)	تقویٰ والے ہیں،

اس سے ظاہر ہوا کہ راستبازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے اسی طرح اُن کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفاے عہد، اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاق حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پاک تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیئے گئے، جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں، اور وہی باتیں خدا کے نزدیک اُن کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں، چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ	اور رحم والے خدا کے بندے وہ
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا	ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں
خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا	اور جب نا سمجھ لوگ اُن سے بات کریں
سَلٰمًا، وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ	تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار
لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا	کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	میں رات گذارتے ہیں، اور جو کہتے
اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ	ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے
اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا،	جہنم کا عذاب دور کر کہ اس کا عذاب
اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ	بڑا تاوان ہے، اور جہنم برا ٹھکانا
مُقَامًا، وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا	اور مقام ہے، اور جو خرچ جب کرتے ہیں

لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ
بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا، وَالَّذِينَ
لَا يَدْعُونَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ
وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ
اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ ج
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا

....

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّوْرَ
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا
وَالَّذِينَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ
لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا
وَالَّذِينَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ
لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا
قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ
اِمَامًا،

(فرقان - ۶)

تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں،
بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے
گذریں اور جو خدا کے ساتھ کسی اور
خدا کو نہیں پکارتے، اور جو کسی جان
کا بے گناہ خون نہیں کرتے جس کو خدا
نے منع کیا ہے، اور نہ بدکاری کرتے
ہیں، کہ جو ایسا کریگا وہ گناہ سے پیوستہ ہو
...... اور جو جھوٹے کام میں شامل
نہیں ہوتے، اور جب کسی لغویات پر گذر
رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے
ہیں، اور جب خدا کی نشانیاں اُن کو
سُنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ
ہو پڑیں، اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے
ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیوی بچوں
سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش، اور ہم کو
پرہیزگاروں کا پیشوا بنا،

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگذر و میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری

نہ کرنا، اور مکروزور میں شریک نہ ہونا، وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں،

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہیں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی اُن کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں،

وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کھتے ہیں، اور جو بڑے بڑے گناہوں، اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں، اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں، اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور اُن کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں، اور ہم نے اُن کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور جب اُن پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں، اور بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے تو جو کوئی معاف کر دے، اور نیکی کرے، تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو پیار

النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيْمٌ، وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ
ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ

(شوریٰ)

نہیں کرتا، اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ
لے لے، تو اُس پر کوئی ملامت نہیں،
ملامت تو اُن پر ہے جو لوگوں پر از خود
ظلم کرتے ہیں، اور زمین میں ناحق فساد
مچاتے ہیں، اُن کیلئے بڑا دردناک عذاب
ہے، اور بے شبہہ جو مظلوم ہونے پر بھی (
ظالم کو معاف کردے، سے تو یہ ہمت کے کام ہیں،

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ
فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِيْنَ
الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(اٰلِ عمران - ۱۴)

جنت اُن پرہیزگاروں کے لئے تیار
کی گئی ہے، جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں
میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اور
جو غصّہ کو دباتے ہیں، اور لوگوں کو
معاف کرتے ہیں، اور خدا اچھے کام
کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

أُولٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ
مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَإِذَا
سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوْا عَنْهُ
وَقَالُوْا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

یہ وہ ہیں جن کو دُہرا ثواب ملیگا اسلئے
کہ انھوں نے صبر کیا، اور وہ بُرائی کو
بھلائی سے دور کرتے ہیں، اور جو ہم نے
دیا ہے، اس سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ
کرتے ہیں، اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے
ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہدیتے ہیں کہ

اَعْمَالُکُمْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ لَا	ہمارے لئے ہمارا عمل اور تمھارے لئے
نَبْتَغِی الْجٰھِلِیْنَ،	تمھارا عمل ہے، تم سلامت رہو، ہم جاہلوں
(قصص - ۶)	کو نہیں چاہتے،
وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ	اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے
مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ہ	مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا
(دھر - ۱)	دیتے ہیں،

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی، وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاقِ حسنہ کا درجہ اسلام میں اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو دعا مانگتے تھے، اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا،

وَاھْدِنِی لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ	اور اے میرے خدا تو مجھ کو بہتر سے
لَا یَھْدِی لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ	بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی
وَاصْرِفْ عَنِّی سَیِّاٰتِھَا لَا	بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا
یَصْرِفُ عَنِّی سَیِّاٰتِھَا اِلَّا اَنْتَ	سکتا، اور بُرے اخلاق کو مجھ سے پھیر
(مسلم باب الدعاء فی الصلوٰۃ)	دے، اور اُن کو نہیں پھیر سکتا لیکن تو،

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے، وہ حسن اخلاق ہے،

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں لیکن اسکی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے فرمایا

اکمل المومنین ایماناً احسنھم	مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے
خلقاً ہ	جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے،

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابو داؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسن اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے،

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی اُن کی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوا،

انّ الرّجل لیدرک بحسن	انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا
خلقه درجة قائم اللّیل	ہے، جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر
وَصائم النّھار ،	عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے،

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابو داؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے، وہی درجہ حسنِ خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، حُسن اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادت کی کثرت

سے بڑھا دیتی ہے،

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، فرمایا:۔

خیارکم احسنکم اخلاقاً	تم میں سب سے اچھا وہ ہے، جس کے
(بخاری کتاب الادب)	اخلاق سب سے اچھے ہوں،

ایک اور حدیث میں ہے:۔

مامن شئی یوضع فی المیزان	(قیامت کی) ترازو میں حسن خلق
اثقل من حسن الخلق فان صاحب	سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی،
حسن الخلق لیبلغ به درجة	کہ حسن اخلاق والا اپنے حسن خلق سے
صاحب الصوم والصلوٰة	ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ
	حاصل کرسکتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں ان ہی الفاظ کے ساتھ ہے لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) میں مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے، یعنی یہ کہ "حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں" اس حدیث نبویؐ نے پوری طرح واضح کردیا کہ اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے، اس میں حسن اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے۔

خیر ما اعطی الناس خلق حسن،	لوگوں کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں،

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابن ماجہ، ابن حنبل، طبرانی، اور ابن ابی شیبہ میں ہے، اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنا دیا، ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اَحَبّ عباد اللّٰہ الی اللّٰہ اَحسنھم اخلاقًا (طبرانی)	اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں

اس سے معلوم ہوا کہ حسنِ خلق خدا کی محبت کا ذریعہ ہے، اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے، فرمایا:-

اِنّ احبکم الیّ واقربکم منی فی الآخرۃ مجالس محاسنکم اخلاقًا وان ابغضکم الیّ و ابعدکم منی فی الآخرۃ مساویکم اخلاقًا (ابن حنبل وطبرانی وحبان وشعب الایمان بیہقی[1])	تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں، اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بداخلاق ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں، ایک رات بھر

---

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال جلد ثانی کتاب الاخلاق باب اول سے ماخوذ ہیں،

نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں، اور صدقہ دیتیں، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کئے رکھتی تھیں، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں، اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں، مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا، تو آپ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ "اس میں کوئی نیکی نہیں، وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی،" اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ "وہ جنتی ہوگی"[۱]، ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں، وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کردیتے ہیں،

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں، کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی، کہ مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت کو لیجائے، فرمایا: "انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا، اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کرسکے، تو بھوکے کو کھلا، اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا، اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کرسکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک[۲]"۔ غور کیجئے، کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے،

ایمان کے اوصاف و لوازم

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے، کہ فلاں فلاں اوصاف و اخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے نشان

---

[۱] ادب المفرد امام بخاری باب من لا یوذی جارہ [۲] مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۴ ص ۳ حیدرآباد دکن

میں زیادتی وکمی ہوگی یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن ہے جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا، آپ نے فرمایا :-

۱- ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جن میں سے ایک حیا ہے،

۲- ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں، جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے، اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو۔ (تاکہ تمھارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو)

۳- جس میں تین باتیں ہوں اُس نے ایمان کا مزہ پایا، جس کو خدا اور اس کا رسول سب سے پیارا ہو، جو دوسرے کو صرف خدا کے لئے پیار کرے، اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴- جس میں یہ تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا، حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا، اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا،

۵- تین باتیں ایمان کا جز ہیں مفلسی میں بھی خدا کی راہ میں دینا، دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا، اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا،

۶- تم میں سے کوئی اُس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے جب تک اپنے بھائی

کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے، جو اپنے لئے کرتا ہے،

۷۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں، اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اُس کی امانت میں دے دیں،

۸۔ ایک شخص اگر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا بھوکوں کو کھانا کھلانا، اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا، (سلام کرنا)

۹۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسولؐ! اسلام کیا ہے، فرمایا اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا، پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر کرنا، اور اخلاقی جوانمردی دکھانا (سماحت)

۱۰۔ مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے اور جو نہ دوسروں سے الفت کرتا، اور نہ کوئی اُس سے الفت کرتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں،

۱۱۔ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے، نہ کسی کو بد دعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے،

۱۲۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر وہ ظلم کرے، اور نہ اُس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا خدا اس کی مدد میں ہوگا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائے گا،

۱۳۔ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی اُس وقت تک جنت میں نہیں جاسکتا، جب تک اُس کا پڑوسی

اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو،

۱۴- جو صاحبِ ایمان ہو اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے،

۱۵- بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہیں، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔

ان مذکورۂ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہئے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے،

اخلاقِ حسنہ صفاتِ الٰہی کا سایہ ہیں

لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں، اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں، حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا حسن الخلق خلق اللّٰہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے، ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں، جو صفاتِ ربانی کا عکس ہیں، اور انہی کو برا کہتے ہیں، جو خدا کی صفات کے منافی ہیں، البتہ یہ ظاہر ہے، کہ خدا کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں، جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں، اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جا سکتا، جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پُرجلال صفتیں بھی ہیں، جو صرف خدا ہی کو زیبا ہیں،

---

[1] یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتبِ حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں، مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے،

جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ اُن کی مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں، خدا کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو، اور خدا کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے، کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا، اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے[1]، اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز

اخلاقی معلّموں میں

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلّم پیدا ہوئے، جن کے مکتب میں آکر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہ کیا، اور آداب و اخلاق کے وہ سبق اُن سے حاصل کئے، جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک اُن کو یاد ہیں، اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کا کوئی کا نمونہ موجود ہے، وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے، مگر ایک تنقیدی نظریہ بتا دیگی کہ ان اخلاقی اُستادوں اور معلّموں میں باہمی نسبت کیا ہے، ؟ اُن کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے، اور اُن میں درس گاہِ عالم کے سب سے آخری معلّم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے،

---

[1] ہم نے اسماءِ الٰہی کی بحث میں، اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کردی ہے، دیکھو سیرۃ جلد چہارم طبع اوّل صفحات ۳۸۴، ۴۰۵،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی، جیسے عام انبیاء علیہم السلام اور بعض مذہبوں کے بانی، دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ و حکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان میں سے اول کو انبیاء اور مصلحین دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کرسکتے ہیں، ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کئے، پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ "حکم خداوندی" کو قرار دیا، اور اس حکم و فرمانِ الٰہی کے سوا اُن کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں، نہ اُن کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے، اور نہ ان احکام و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض و غایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے، اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر،

ع یارِ ما این دارد و آن نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکمِ خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امرِ ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے،

انبیاء اور حکماء میں جو اصلی فرق و امتیاز ہے، وہ یہ کہ انبیاء کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اُن کی معصوم زندگی، اُن کے مقدس کارنامے اور اُن کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض نیکی بن بن ہو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے، اور پیاسوں کو

سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے، اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اُس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی، وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا، وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے، مگر خود عمل کی ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہی، وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا، وہ سچائی اور راست بازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دیسکتا ہے، مگر وہ خود سچا راستباز نہیں ہوتا،

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہیں، اس لئے اس کے منھ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی، بلکہ ہوا کے تموّج میں مل کر بے نشان ہوجاتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، جو اُن کی تعلیم ہے وہی اُن کا عمل ہے، جو اُن کے منھ پر ہے، وہی دل میں ہے، اسی لئے اُن کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہمنشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء، اور حکماء یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام اور سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحبِ اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں، جو موسیٰ، عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر

پہنچیں، اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کی کوئی کرن ہے وہ نبوت ہی کے کسی مطلعِ انوار سے چھن کر نکل رہی ہے،

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکساں نہیں ہیں، بلکہ اُن کے مختلف مدارج ہیں، اُن کی علمی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے، کہ اُن کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق اُن کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں، اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں، تاکہ بعد کے آنے والے بھی اس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لیے حسبِ ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے،

۱- اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو،

۲- اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو،

۳- اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لئے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو،

بے پردہ زندگی

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاءؑ اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں، تو معلوم ہوگا، کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی حیاتِ پاک کے برابر جامعِ کمالات نہیں، دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانیِ مذہب ایسا نہیں ہے، جس کی اخلاقی زندگی ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے

سامنے موجود ہی، توراۃ کے پیغمبروں میں سے کونسا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں، اُن غیر اخلاقی قصّوں کا ذکر فضول ہے، جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے، اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰ علیہما السلام تک تورات کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ، اُن کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں، اور کیا اُن کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری تشبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی ؟

حضرت عیسیٰؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس[۳۳] برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے، اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اُن کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں ؟

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلّم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے، اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کیمبال (سیرتِ محمدؐ) پورے دن کی روشنی ہے، جس میں محمدؐ کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے،[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور

---

[۱] باسورتھ اسمتھ کی کتاب سیرت محمد ص ۱۰۸

عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمانِ راز کو اجازت تھی، کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اس کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو حجرہ میں کہتے سنو، اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو، الا فلیبلغ الشاھد الغائب،

قول کے ساتھ عمل اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے، ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہِ زیتون کے پُرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰؑ) کی معصومانہ باتیں، سچائی، اور راست بازی کی نصیحتیں، اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں، اور اُن کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "سب کچھ جو تمہارے پاس ہو جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے"[1] کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "شریروں کا مقابلہ نہ کرو" کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "دشمنوں کو بھی پیار کرو" کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر" کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی

[1] انجیل،

تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو" کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو" کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے،

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ	کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو
اَنْفُسَكُمْ (بقرہ ۵-۵)	اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو،

اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ	تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی
كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا	بیزاری ہے، اللہ کے یہاں کہ کہو وہ
مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (صف - ۱)	جو نہ کرو،

ایک شخص نے آکر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا، کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا، کان خلقہ القرآن[1] جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا، اگر

[1] ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل،

غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا، تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں کیا، جنھوں نے آپ پر تیر برسائے، اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی اُن پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی، سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں، اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، اور مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے نہ صرف اقوال و نصائح کو، بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور اُن کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہمعصروں کے سامنے پیش نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن	(اے منکرو!) میں تمہارے درمیان
قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ	اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں
(یونس - ۲)	کیا تم نہیں سمجھتے،

پھر آپ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا گیا،

اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (اے محمد!) بیشک تو اخلاق کے

(ن-۱) درجہ پر ہے،

کامل و مکمل | اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو، اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگ دلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے، یا اس میں تھی جس کی نسبت اُس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا،

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ-۱)

وہ اُن کو خدا کی باتیں سناتا اور انکو پاک و صاف بناتا اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے مُعلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف

مصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اُس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اُس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے، اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، تیئیس ۲۳ برس کے بعد وہ اخلاق کے اُس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیم اخلاق کا تنوع | اگر کسی معلّم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو، پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں، بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے دوسرے معلّمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو ودرگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو ونما پا رہی ہے، خود معلّم کی ذات ایک پوری پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم وفن ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے، ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔

آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار،

ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوے ادب تہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، مدینۃ النبیؐ کی اس درس گاہ اعظم کو غور سے دیکھو، جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبویؐ تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے فرماں روا زیر تعلیم ہیں، کہیں حضرت طلحہؓ و زبیرؓ و معاویہؓ و سعدؓ بن معاذ و سعدؓ بن جبیر جیسے ارباب رائے و تدبیر ہیں، کہیں حضرت خالدؓ، ابو عبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص اور عمروؓ بن العاص جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمراں، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے، جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، ابوذرؓ، سلمانؓ و ابو درداؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو "مسیح اسلام" کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑیاں لاکر بیچتے اور گذارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت جیسے فقیہ و محدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہر عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی

سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا، اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے، اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں؛[1]

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصول کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفۂ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اُس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اور اُس کے ذہنی وجسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، اُن کے اسباب وعلل کی تلاش، اُن کے اصول و قوانین کی تحقیق، اور اُن کی غرض وغایت کی تعیین، یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی، اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب وعلل، اصول و قوانین اور غرض وغایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے، ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے، اور نئے نئے فرقے اور اصول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے، تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب ان ہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں جنھیں یونانی اصطلاح میں "رواقیہ" اور "لذتیہ" کہا گیا ہے، موجودہ اصطلاح میں پہلے کو "ضمیریہ" اور دوسرے کو "افادیہ" کہہ لیجئے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ

[1] اس موقع پر مدراس والے میرے چھے خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے،

سے یوں کہیے، پہلا فریق اخلاق کی بنا "جذبات" پر قرار دیتا ہے، اور دوسرا "عقل" پر، پھر اس منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے، ارسطو اور اُس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے،

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل ماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں، علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون کہکر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت اُن کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں، یا کسی بیرونی ماخذ سے، جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ لاسکے، انھوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر، جنھوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انھوں نے باختلافِ مذاق انسان کی اصل فطرت کو، انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو، اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا، جنھوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انھوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشا کے حکم اور سوسائٹی کے رسم ورواج کو ان کا ماخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کے حکم یا بادشاہ کے حکم، یا سوسائٹی کے رسم ورواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لیے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا، ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا، جو اخلاق

کے اہمات مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جا سکتا ،

بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے ، اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے ، تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکام الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے ، فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے ، تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں ، ہو سکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات ضمیر ، فطرت ، وجدان اور عقل سب ہوں ، اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے ، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض وغایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے ، یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے ، یا اس کے ساتھ کسی مصلحتِ عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو ، اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو ، اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہو سکتی ہیں ،

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد خدا کا بھی ہے ، اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے ، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے ، اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے ، جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے ، ساتھ ہی

اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں، اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے، اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے موقع بھی ہوسکتے ہیں، جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو، اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جارہی ہو، اور اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لائق ہے،

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیئے، وجدان کہیئے، حاسۂ اخلاقی کہیے، ضمیر کہیے، اس فلسفیانہ تنقیق سے اس کو بحث نہیں، اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے، اسکی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہو کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں، جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا، خصوصیات اقلیم، زبانیں، مذہب رسم ورواج، طرز حکومت، وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلادلیل متفق اور متحد ہیں، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے، جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں، اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات، اور لموسات وغیرہ کے لیے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے، جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانیات

جیسے حسن و قبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا، یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے، جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے، اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا بُرا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی،

تعلیم محمدیؐ نے گو اخلاق کے ان اصول و مبادی کی طرف کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیے ہیں، مگر اُس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی اُن کے علم و فلسفہ میں نہیں، بلکہ اُن کے عمل میں ہے، اس لیے "علم بلا عمل" کی کوئی قدر و قیمت اُس کی نگاہ میں نہیں، لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلا علم" کو بھی اُس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے، اسی بنا پر اس نے ان امور کی طرف اشارے تو کیے ہیں، مگر اخلاق کے باب میں اُن کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے،

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں، وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں، انہی احکامِ الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ اور عقل ہیں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہئے، ہونا چاہیے، ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی، اسی قدر انسان کا رُوحانی کمال بلند ہوگا، اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی، اسی حد تک اس کے کمال ہی نقص ہوگا،

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے، پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے، اُس کا وجدان بھی یہی ہو، اُس کو وہ

اپنا فرض بھی جانے، اُس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے، اور اسکی پیروی میں نوعِ انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے، الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہوگی، اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا، اور جس قدر اس توافق میں کمی ہوگی کہ خدا کا حکم سمجھکر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو، یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے، یا اس سے اُس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحانی و ایمانی کمال میں نقص پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دیں، لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا، اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سجھاتی ہو تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے، اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصولِ مسرت یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے، اگر خدا کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیۂ رُوح کا ذریعہ نہیں،

بے غرضی چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے، اس لیے اُس کی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے، اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں، اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی، مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ

ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے، اسی قدر وہ قابلِ قدر ہوتا ہے، ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں، اور اس کے سامنے کتنے ہی الوانِ نعمت چن دیں، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہ میں ذاتی نفع، یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے، تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی، تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدمِ اخلاص کے یہ اثرات ہیں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت اسی لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے، بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی، ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے، یا سخت تکلیف پہنچائیں گے، اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا، اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی، تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے

میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڈھے یا کنوئیں میں گر کر مر گیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا، گو کہ جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی،

ایک دوسری مثال فرض کیجئے، میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوا تھا، اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا، جب میں راستہ سے واپس پلٹا، تو ایک بٹوا پڑا دیکھا، اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے، چپکے سے اٹھا لیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا، لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا، تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو، پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہی

راستہ میں کوئی چل رہا ہو، اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی، یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھا کہ وہ اس کی بیوی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہگار ہو چکا، اور دوسری صورت میں اس کی بیگناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا، اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لیے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورۂ آل عمران میں ہے:-

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ	اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ
مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ	دیں گے، اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا
نُؤْتِهٖ مِنْهَا (آل عمران - ۱۵)	اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو، اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا	اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو
صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى	احسان دھر کر اور ستا کر برباد
كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ	نہ کرو جس طرح وہ اپنے مال کو برباد
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ	کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	لیے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت
(بقرہ - ۳۶)	پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں:

انما الاعمال بالنیات	انسان کے اعمال اس کی نیت پر
(صحیح بخاری باب اول)	موقوف ہیں۔

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى فَمَنْ	ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی وہ

كانت هجرته الى الله و رسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها او امرءة يتزوجها فهجرته الى ما هاجر اليه[1]

نیت کرے، توجس کی ہجرت خدا و رسول کی طرف ہے تو اسکی ہجرت خدا و رسول کی طرف ہی، اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے، جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی،

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمامتر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے، اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑا سا بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف وستایش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے،

فلسفۂ اخلاق کی تائید

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان، ایس میکنزی اپنی تصنیف "مینول آف اتھکس" کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے،

جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے وہ صاف ہے یعنی فعل ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا ہے یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات کو شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام

[1] صحیح بخاری جلد اول باب ماجاء ان العمل بالنیۃ،

تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے، جس فعل میں ارادہ شامل نہیں، اس کی اخلاقی حیثیت نہیں..... اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہے۔

اسی لیے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے، اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ "بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں، بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو علی الاطلاق یا بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے"[1]

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنیاد ارادہ و نیت یعنی قلب کے عمل پر ہے تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں، تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اُس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں، دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمراں ہیں، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمراں ہے، پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اُس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جوابدہ ہونا ہے، اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا، یا سزا ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے، اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے، اسی لیے وحی محمدیؐ نے

[1] علم اخلاق، کتاب اول باب ششم ترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۴۱ھ۔

خدا اور قیامت پر ایمان لانا، ہر ایک عمل کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا، اور نمائش بن جاتا ہے، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا	اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر
صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ	یا ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ
كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ	برباد کرتا ہے جو اپنے مال کو لوگوں کے
وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	دکھانے کو خرچ کرتا ہے، اور خدا اور
(بقرہ ۳۶-۳۶)	آخری دن پر یقین نہیں رکھتا،

یہی ایمان صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے، آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے، جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں،

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ	اور جو خدا اور قیامت کو نہیں مانتے،
كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ	ان کے کام ایسے ہیں، جیسے میدان میں
مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ	ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے، جب
شَيْئًا ، (نور ۵-۵)	وہاں وہ جائے تو اس کو کچھ نہیں پائے،

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے، اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو،

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ	یا (خدا اور قیامت کے) نہ ماننے والوں
مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ	کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے

فَوْقِهٖ سَحَابٌ ط ظُلُمَاتٌ	ہیں گہرے دریا میں اُس کو لہر ڈھانکے
بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط اِذَآ	ہے، اس لہر پہ دوسری لہر ہے، اس پر
اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا ط	گھٹا چھائی ہے تاریکیاں ہیں، ایک
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا	پر ایک، جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھا
فَمَالَهٗ مِنْ نُّوْرٍ	نہیں، اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں
(نور ۵-۷)	دی، اس کو کہیں روشنی نہیں،

جب تک کسی واقفِ اسرارِ عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اُس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس، اور جوابدہی کا یقین نہ ہوگا، دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہوسکتی، اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے،

غرض وغایت اسی لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت کاملہ میں نفسِ عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے، جس کی غرض وغایت صحیح ہو، عمل قالب ہے، تو صحیح غرض وغایت اُس کی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے، حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض وغایت سے خالی نہیں ہوتا لیکن یہ غرض وغایت ہو کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہو سکے، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لیکر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں،

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے؟ بلکہ اس سے بحث ہے؟

کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہونی چاہیئے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ پست اور بلند متعدد غرضیں اور غایتیں ہو سکتی ہیں، ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اُتار کر خود اٹھا لیتے ہیں، اور اس کو اُس کے گھر تک با آرام پہونچا دیتے ہیں، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہو سکتی ہے، کہ گھر پہونچ کر بڈھا خوش ہو کر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا، یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے، یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے، کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے، یہ بھی غرض ہو سکتی ہے، کہ آج اگر جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے، بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعًا خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی خوشی کے لئے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں، اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں، غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہو سکتے ہیں، لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں، اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی ونفسانی غرض وغایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابلِ قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے، اس کے بعد عزت وشہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لئے کرنا بھی گو

پست مقصد ہے، مگر پہلے سے بلند ہے پھر روحانی خوشی، اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلّی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے، مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے یہ بالکل فطری بات ہے، کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے، مگر جب اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی، تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے،

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنّت کی طلب قرار دیسکتے ہیں لیکن درحقیقت اس میں بھی گو اس دنیا کی نہیں لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے، اس لئے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لئے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیمِ محمدیؐ میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دی گئی ہے، یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں،

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کے بہشت کو

ضمیر کی آواز یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ بُرائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے، اور جس کے سبب سے اُس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے، غریب و لاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر

میں ہے، ہر اچھے یا بُرے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے لیکن بُری صحبت، بُری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہجاتی ہے، اور اس کی پشیانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے،

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصول اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اس کے نتائج ہیں، قرآن کہتا ہے:-

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، ہر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے،

(الشمس)

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے، اور جو ہم کو ہمارے ہر بُرے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحی محمدیؐ کی اصطلاح میں اُس کا نام نفسِ لوّامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے، اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامت میں ہے،

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان

(قیامت - ۱۰) کو اُس کی بُرائیوں پر ملامت کرتا ہے،

آگے چل کر فرمایا

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ، وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ
کہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، گرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے،

(قیامت - ۱)

نواس بن سمعانؓ انصاری ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں، آخر ایک دن اُن کو موقع مل گیا اور انھوں نے دریافت کیا، فرمایا، "نیکی حُسنِ اخلاق کا نام ہے، اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے، اور تجھ کو پسند نہ ہو، کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں" اسی طرح وابصہؓ بن معبد نام ایک صاحب خدمتِ نبوی میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے، چاروں طرف جان نثاروں کا ہجوم تھا، اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ اُن کو روک رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا، "وابصہ قریب آجاؤ" جب وہ قریب جاکر بیٹھے تو فرمایا "اے وابصہ میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو، یا تم بتاؤ گے،" عرض کی حضور ہی ارشاد فرمائیں" فرمایا "وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو" عرض کی سچ ہے یا رسول اللہ! فرمایا :-

یا وابصۃ استفت قلبک	اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کرو،
و استفت نفسک البرّ	اپنے نفس سے فتوی لیا کر، نیکی وہ ہے،
ما اطمأنّت الیہ القلب	جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا
واطمأنّت الیہ النفس	ہو، اور گناہ وہ ہے جو دل میں
والاثم ما حاک فی القلب	کھٹکے، اور نفس کو ادھیڑ بن میں
وتردّد فی النفس وان افتاک	ڈالے، اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا
الناس[1]،	جائز ہی کیوں نہ بتائیں،

یہی وہ حاسۂ اخلاقی ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے،

پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے، تو اس کے دل کی صاف و سادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر ہوش میں آکر وہ توبہ و استغفار کرتا ہے، اور پشیمان و نادم ہوتا ہے، تو وہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے، تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کرکے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا فرمایا،

انّ العبد اذا اخطأ خطیئۃ	بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے، تو اس کے
نکتت فی قلبہ نکتۃ سوداءُ	دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے،

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۲۲۰ مصر،

فاذا هو نزع واستغفر وتاب صقل قلبه وان عاد زيد فيها حتى يعلو قلبه،

تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کرلیا اور خدا سے مغفرت مانگی، اور توبہ کی، تو اس کا دل صاف ہوجاتا ہے، اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھ جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے،

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے،

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ[1] (تطفیف - ۱)

کبھی نہیں، بلکہ اُن کے (برے) کاموں کی وجہ سے اُن کے دلوں پر زنگ چھا گیا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزلِ مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھچی ہیں، اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں لیکن ان پر پردے پڑے ہیں، راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو، اور ادھر ادھر مڑو نہیں، جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے، تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے "خبردار پردہ نہ اٹھانا،

[1] جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور،

اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے" پھر فرمایا، یہ راستہ اسلام ہے، اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں، اور یہ پردے اس کے حدود ہیں، اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہی، اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے،

هُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ فِیْ قَلْبِ کُلِّ مُؤْمِنٍ[1]، — وہ خدا کا وہ واعظ ہے، جو ہر مومن کے قلب میں ہے،

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہی،

مسرت وانبساط — یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے، کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے، وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا، اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہی، گو تمام تر صحیح نہیں ہی تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقۃً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے، اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں، اور نہ اُن کو ہمارے کاموں کی غرض وغایت ہونی چاہیے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں، ایک غریب ولاچار کی امداد سے بے شبہہ ہم کو خوشی ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازوال نتیجہ ہے، لیکن وہ اس کی محرک، علت، اور غرض وغایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض وغایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہی، اور وہ خدا اور اُس کی رضامندی کا حصول،

---

[1] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالۂ احمد وبیہقی فی شعب الایمان ورزین وترمذی مختصراً،

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کردی ہے، اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا نیکی کی غرض وغایت نہیں، بلکہ اُس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ	لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا
وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ	اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا
إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَ	کرکے دکھا، اور کفر اور گناہ، اور
الْعِصْيَانَ أُولٰئِكَ هُمُ	نافرمانی سے گھن لگادی، یہی لوگ نیک
الرَّاشِدُونَ (حجرات-۱)	چلن ہیں،

اسی آیتِ پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی،

اذا سرتک حسنتک وساءتک	جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور
سيئتك فانت مومن [1]	تمہاری بدی تم کو غمگین کردے تو تم مومن
من سرته حسنة وساءته سيئة فهو مؤمن [2]	ہو جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنائے وہ مومن ہے

---

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباہلی، جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۴، حیدرآباد و مختصر شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر و ابن حبان و ابوداؤد عن عمرؓ بن الخطاب

[2] طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ کنز العمال جلد اول ص ۳،

مَن عَمِلَ سَیِّئَۃً فَکَرِھَھَا حِیْنَ یَعْمَلُ، وَعَمِلَ حَسَنَۃً فَسُرَّ فَھُوَ مُؤْمِنٌ[1]،	جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی، وہ مومن ہے۔

غرض نیکی پر مسرت وانبساط اور انشراح خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے، اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقۂ لذتیہ کے لئے بھی قدم رکھنے کی گنجایش باقی رکھی ہے، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرمادی ہے،

رضائے الٰہی

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیئے، اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیئے یہیں آکر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے، حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں، کہ انسانی اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے، اور معلّم حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں، کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض وغایت کیا قرار دینی چاہئے، انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال اور انہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسنِ عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا،

---

[1] مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۳ حیدرآباد،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ، (بقرہ-۲۵)

بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی خوشنودی چاہنے کے لئے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہی،

پھر مال کے متعلق فرمایا،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ، (بقرہ-۳۶)

اور اُن کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کرتے ہیں،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ، (بقرہ-۳۷)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا، (نساء-۱۷)

اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی کے لئے کرے گا، تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے،

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ

اور جنھوں نے خدا کے لئے صبر کیا اور نماز کھڑی کی، اور ہم نے جو ان کو دیا ہی اس میں کچھ چھپے اور کھلے طریقے سے خرچ کیا، اور بُرائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں ان ہی کے لئے ہی،

لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد-۳) بچھلا گھر،

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھولی گئی ہے،

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ۝	جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ	ہوئے دیتا ہو، کسی کا اس پر احسان
تُجْزٰٓی اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ	نہیں ہے، جس کو ادا کرنے کے لئے
الْاَعْلٰی ۝	دیتا ہو، بلکہ وہ خدا کی ذات کی
(لیل)	طلب کے لئے دیتا ہے،

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے ایک صحابی پوچھتے ہیں، یا رسول اللہ! کوئی اس لئے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے کوئی اس لئے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لئے کہ اس کو شہرت حاصل ہو، تو ان میں سے راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے، فرمایا اس کو جو اس لئے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو،[1] ایک دفعہ ارشاد فرمایا "گھوڑا باندھنا کسی کے لئے اجر کا موجب، کسی کے لئے پردہ پوش اور کسی کے لئے گناہ ہے، اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں اس کو باندھتا ہے، تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے' پردہ پوش اس کے لئے ہے جو ضرورۃً اس لئے باندھتا ہے کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے، تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے، تو وہ رحم و شفقت

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۹۴،

کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے، اور اس کا حق ادا کرتا ہے، اور گناہ اس کے لئے ہے، جو فخر اور نمایش کے لئے باندھتا ہے۔"[1]

اس تعلیم کا سب سے موثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے، اور جس کو سن کر حضرت معاویہؓ زار زار روئے، حضرت ابو ہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لئے اترے گا، اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی، اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا، جو قرآن کے عالم تھے، اور جو جہاد میں مارے گئے تھے، اور جو دولت والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا، جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا تو تم نے اس پر عمل کیا، ؟ وہ عرض کرے گا" بار الہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے، پھر خدا فرمائیگا، تو تو اس لئے یہ کرتا تھا کہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا (یعنی تو اپنا بدلہ پاچکا) پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا، کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا، عرض کرے گا کیوں نہیں، اے میرے رب! دریافت کرے گا، تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا، اس میں تو نے کیا کیا، ؟ جواب دیگا میں اہل استحقاق کا حق

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاحکام التی بالدلائل و باب التفسیر اذا زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ،

ادا کرتا تھا، اور خیرات دیتا تھا، ارشاد ہوگا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے، یہ جھوٹا ہے پھر خدا فرمائے گا، تو تو اس لئے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا سخی ہے، تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا (تو دنیا بدلہ پاچکا) اس کے بعد وہ لایا جائے گا، جو جہاد میں مارا گیا، تو خدا اس سے دریافت کریگا تو کس بات کے لئے مارا گیا، کہے گا خدایا تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا، تو میں لڑا، یہاں تک کہ مارا گیا، خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے، یہ جھوٹا ہے، خدا کہے گا تو تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں، جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے،[1]

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے، پھر بولے، خدا اور اس کا رسول سچا ہے، اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی،

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا	جو کوئی دنیا کی زندگی، اور اس کی
وَزِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ	رونق چاہتا ہو، تو ہم اس کا عمل سبھی
فِيۡهَا وَهُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ	دنیا میں پورا کردیں گے، بے کم و کاست
اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَيۡسَ لَهُمۡ فِى	ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں
الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا	مگر دوزخ، اس دنیا میں انھوں نے
صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا	جو بنایا، وہ مٹ گیا، اور جو کیا وہ
يَعۡمَلُوۡنَ، (ھود - ۲)	برباد گیا،

[1] جامع ترمذی، ابواب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ،

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت، خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہو تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے، اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں، بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہے،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ، (بقرہ ۔ ۳۷)	اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر،
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ، (رعد ۔ ۳)	اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لئے صبر کیا،
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ہ (لیل)	اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے نہیں، بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لئے کرتا ہے،

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الروم)	تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کیلئے بہتر ہے، جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں،

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی

جو تکمیل ہوئی، اس کا پتہ اخلاق کے نفس بنیادی اصول سے چلتا ہے، توراۃ نے اپنے اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے، جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی، انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی، ہر تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں، مگر اُن کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے، ان میں پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے،

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے، یا گناہوں سے داغدار ہے، عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گنہگار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے، کیونکہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدم اور حوا گناہ گار تھے، اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے، جس سے بچنا انسان کے لئے ممکن نہیں، اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے. کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ جب تک وہ بپتسمہ نہ پائے پاک نہیں ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مرجائے تو وہ گناہگار مرا، اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا، بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا، کیونکہ مسیح کے نام سے اُس نے نجات نہیں پائی تھی.

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے، اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (خدا کی وہ فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بلٰی یعنی خدا کا اعتراف ہر انسان روزِ ازل کرچکا ہے، اس لئے اس دنیا میں اگر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا

اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لئے کافی ہے، اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زریں حروف لکھے ہیں، وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اُن کو ابھار کر چمکا دیتا ہے یا مٹا ڈالتا ہے، فرمایا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ، (والتین)

ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا،

یعنی ہم نے اُس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا :۔

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (انفطار -۱)

جس خدا نے تجھ کو بنایا، پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا، پھر جس صورت میں چاہا، تجھ کو جوڑ دیا،

یہ آیت سورہ انفطار کی ہے، اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے، جس لفظ کا ترجمہ ہم نے "ٹھیک کیا" کیا ہے، اس کے لفظی معنی "معتدل کیا" کے ہیں، یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا، نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اُس کے معنی یہ بتائے ہیں، کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قویٰ کا اعتدال داخل ہے، دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے سورہ اعلیٰ میں ہے،

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى،	اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان
الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی، وَالَّذِیْ	کر جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا، اور
قَدَّرَ فَهَدٰی،	جس نے ہر قسم کا انداز درست کیا، پھر
(اعلیٰ - ۱)	راہ دکھائی،

راہ دکھانا یعنی ہدایت انسان کی فطرت میں اُس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے، جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں، سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہی،

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ	ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے
اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا	سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو، پھر
بَصِیْرًا، اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ	کر دیا، اس کو سنتا دیکھتا، ہم نے
اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝	اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گذار
(دہر - ۱)	(نیکو کار) ہوتا ہی، یا ناشکر (بدکردار)

غرض اُس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی، اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گذار یا ناشکر، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا بُرا ہو جانا خود اُس کا کام ہے، سورۂ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا	قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے
فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا، قَدْ اَفْلَحَ	کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا، اُس

مَنْ زَکّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ،	سوجھا دیا) اس کی نیکی اور بدی تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف رکھا ، اور ناکام ہوا ، وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا ،
(شمس - ۱)	(گندہ کر دیا)

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہگار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے ، بلکہ اس کی اصلی فطرت میں ہدایت ، اور صحیح الہام ودیعت ہے ، اسی لئے یہ کہا گیا ،

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ،	سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ ، وہی اللہ کی فطرت ، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ، خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں ، یہی سیدھا دین ہے ، لیکن بہت لوگ
(روم - ۴)	نہیں جانتے ،

یہ دینِ فطرت اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں ، جن کی بنیادی چیز توحید ہے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے ، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں ، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل

ہیں صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا“ اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے، وحی محمدیؐ نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ میں پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا، اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ انھوں نے اپنی زبانِ حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا، بَلٰی ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے، یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اُس کے بہکانے میں نہ آؤ“

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت میں معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں لاتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر-۳)	اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا،

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (طور) ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے،

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الا لا یجنی جانٍ علی ولدہٖ	ہاں باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں
ولا مولودٌ علی والدہٖ[۲]	اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ،

---

[۱] صحیح بخاری ومسلم، کتاب الایمان [۲] سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبۃ یوم النحر،

اسی طرح اُن مذہبوں نے بھی جنھوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے، انسانیت کی پیدایش کو ایک طرح سے گنہگار، اور دا غدار ٹھہرایا ہے، انھوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے، اس کی ہر پیدایش کو دوسری پیدایش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا، اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو، اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے،

اب غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے، غمگین دنیا کے لئے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے، کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچے بھی گنہگار اور جہنم کا ایندھن ہے، آپ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل و تمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے، فرمایا کہ "خدا کا قلم بچہ سے اس وقت کے لئے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل و تمیز کو نہ پہونچے"[1]

باغ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں، اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں، آپ نے فرمایا کہ "جس مسلمان کے بچے بچپن میں مرگئے، وہ خدا کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے، اور اُن کو جنت میں لے جائیں گے"[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی، تو فرمایا "جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پیئے گا"[3]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الطلاق و ترمذی فی من لایجب علیہ الحد [2] صحیح مسلم باب فضل من یموت لہ ولد [3] ابن ماجہ کتاب الجنائز

اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ سے دریافت کیا گیا، کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے، فرمایا "خدا کو علم ہے، کہ یہ کیا ہوتے[1]" لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمادی، ایک دفعہ رویا میں حضرت ابراہیم کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور اُن کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم تھا، فرمایا یہ وہ کمسن بچے ہیں جو دین فطرت پر مرگئے، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! اور مشرکوں کے بچے! فرمایا "و مشرکوں کے بچے بھی[2]" ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی میں مرجانے والے بچے کو بتخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے، لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا کام ہے، اس لئے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا آپنے مناسب نہیں سمجھا، ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مرگیا تھا، ام المومنین حضرت عائشہ رض نے اس سانحہ کو سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی "یا رسول اللہ! اس کو مبارک ہو، یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا، نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا[3]" فرمایا "اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے کچھ لوگ پیدا کئے ہیں، اور جہنم کے لئے کچھ لوگ[3]" ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مرجانے والے کمسن بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے، جو اُن کے لئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے، اور اُن کے لئے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے "خداوندا! اس کو میرے لئے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو"، احادیث میں ایسے موقعوں پر جب

۱ صحیح مسلم کتاب القدر ۲ صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرویا، بعد صلوٰۃ الصبح ۳ یہ حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر میں ہیں، نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت لہ ولد جلد ۲ ص ۳۳۰ و ۳۲۷ نولکشور

کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ "وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اُس کو آج ہی جنا ہے[1]"

خوف ورجا — اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گذرے ہیں، ایک رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں، پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل عیش وآرام، اور بہار ورونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو، اور زندگی میں موت کی صورت بنالو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو، اور خوش رہو، اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں راہیں ترمیم کے قابل ہیں، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قوی سرد ہو کر رہ جاتے ہیں، اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا، اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے وہ بادۂ غفلت میں مست وسرشار ہوتا ہے، اور اس کو نیک وبد کی تمیز نہیں رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کی بیچ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو، اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا، وہ اخیر اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم

---

[1] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا وصحیح بخاری ومسلم ترمذی کتاب الحج۔

کرتا ہے، اُس کی شریعت میں خدا سے نا اُمیدی اور کفر ایک ہی، وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی نا امید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا، قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا،

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقَانِطِيْنَ ، (حجر-۴) (ابراہیم) نا امیدوں میں سے نہ بن،

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی،

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ط اور اللہ کے فیض سے نا امید نہ ہو

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اللہ کے فیض سے نا امید وہی ہیں جو

اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ، (یوسف) خدا کے منکر ہیں،

اس اُمت کے گنہگاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے،

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنی

اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ جانوں پر آپ ظلم کیا، تم خدا کی رحمت

اللّٰهِ ط (زمر-۶) سے نا امید مت ہو،

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پر اُمید رہنے کی تاکید کی ہی، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں[۱]، یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے، وہی اُس کے لئے ہو جاتا ہوں، اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے،

---

[۱] جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ،

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ	بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے،
سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ	رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے
وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ	اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا
(زمر - ۱)	ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے

یعنی اُس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا ہیں، گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ اور بازپرس کا ڈر بھی ہے، اور خدا کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے، خدا کے غضب سے ڈرنا، اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہ ڈر اُس کو غافل، بیباک، اور گستاخ نہیں ہونے دیتا، اور یہ امید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی، اسی لئے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوء انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے، اس کی طرف اشارہ کرکے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے،

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ،	اور تم کو تو خدا سے وہ امید ہے جو کافر دل
(نسآء - ۱۵)	کو نہیں،

یہی وہ ذہنی فرق ہے، جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے، کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے، اور جب وہ اُس کو نہیں پاتا، تو دل شکستہ ہو جاتا ہے، وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے، اور جب وہ نہیں ملتی، تو افسردہ ہو جاتا ہے، لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا، تب بھی اس کا دل شادان اور فرحاں رہتا ہے،

کہ اُس نے نیکی کا کام کیا، اور بہر حال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا، اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو، خدا کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا، اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے اور اُن کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا سبب ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور نا امیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے، ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں، یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی نا امیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے، جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں، وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں، مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی نا امیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا، اور خدا کے فضل وکرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹتی، امیر ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولاد والا ہو کہ بے اولاد، کامیاب ہو، ناکام، دولت مند ہو یا دیوالیہ، ہر حالت میں وہ پُرامید رہتا ہے، مشکلات میں، بیماریوں میں، محتاجیوں میں، ناکامیوں میں، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ خدا کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے، کہ نا امیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں، اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں تو وہاں ضرور ملے" کہ اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ — میں تم میں سے کسی کام کرنے والے

کے کام کو ضائع نہیں کرتا، (آل عمران۔ ۲۰) ہننکم ہ

اخلاق اور رہبانیت

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی، اور اچھائی برتنے کا نام ہے، یا یوں کہئے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں، اُن کو ادا کرنے کو کہتے ہیں، اخلاق کی اس حقیقت ہی سے واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لئے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے، جو رہبانیت، تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی، ہو، اسی لئے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علٰحدگی، اہل وعیال، عزیز وقریب اور دوست واحباب کے تعلقات سے آزادی اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے، یا کم کردیتی ہے،

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لئے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کرلی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے، اور وہ خود اور اُن کے عقیدتمند بھی اس کو اُن کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے، لیکن حقیقۃً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لئے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد لے، اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیرپردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کرسکیں، اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ نہ بنے، بغیر اہل وعیالُ

اعزہ واقارب، دوست واحباب اور قوم وملت کے فرائض وحقوق بجالانے کی تکلیف سے بچ جائیں، اسی لئے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمعِ انسانی میں رہ کر اور تمامتر انسانی جدوجہد میں شریک ہوکر گذاری ہے، یہی طرزِ عمل خلفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہؓ کا تھا، اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد، اور انسانی مجمع کے ساتھ عملِ صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجرد، علیحدگی، خلوت نشینی، ترکِ عمل اور ترکِ جماعت کے لئے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے،

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں، اُن سے ہٹ کر نہیں، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشیں ہوکر زندگی بسر کرتے ہیں، کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا خاص فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلقِ الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا وہ اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ ودعوت، تعلیم وموعظت، امر بالمعروف نہی عن المنکر، اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں، حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں، اسی لئے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں، قرآن پاک میں ہے،

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا — تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی

(تحریم -۱) — دوزخ کی آگ سے بچاؤ،

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں، بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا، کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے، اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا، امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے"[1]

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اسی لئے وحیِ محمدی نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا، اور کہا،

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ — اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف

ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (انفال ۳) — گنہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا،

بلکہ اس کی لپیٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرضِ تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المرأة راعیة فی بیت زوجہا ص ۷۸۳،

ہی میں شامل کیا ہی،

دنیا درحقیقت جد وجہد اور دار وگیر کا ایک میدان ہے، جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں، راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف وآرام کا خیال و لحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لئے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے، اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے، بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے یہ روایت نقل کی ہے،

اِنَّ المسلم الذی یخالط	وہ مسلمان جو لوگوں میں مِل جل کر رہتا
النّاس ویصبر علیٰ اذاھم	ہے، اور اُن کی تکلیف دہی پر صبر کرتا
افضل مِنَ الذی لا یخالط	ہے، اس سے بہتر ہے، جو لوگوں سے
النّاس ولا یصبر علیٰ	نہیں ملتا، اور اُن کی تکلیف دہی پر
اذاھم[۱]،	صبر نہیں کرتا،

گوشہ گیری اور جماعت سے علٰحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے، اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے تو ایسے

[۱] شعب الایمان بیہقی و جامع ترمذی کتاب الزہد ص ۴۱۲،

وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں، وہ مجمع سے الگ ہو جائیں، فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں، ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے، یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیش کیا، اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی،

آپ نے فرمایا کہ" بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے،" اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے، تو اس کو دل سے برا سمجھے، اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے[1]"

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلام کے اس اصول اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" (یعنی اچھی باتوں کے لئے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے، قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے،

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ — تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان،

لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	کے لیے باہر لائی گئی، اچھی بات کا حکم
وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۲)	دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو،
یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ	وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور
عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ - ۹)	بری بات سے باز رکھتے ہیں،

پھر خاص طور سے حکم ہوا،

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ	اچھی بات کا حکم دے اور بری بات
عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمان - ۲)	سے روک،

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا	اور وہ آپس میں سچائی اور ثباتِ قدم
بِالصَّبْرِ (العصر)	کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں،
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا	اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور
بِالْمَرْحَمَةِ	مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو
(بلد - ۱)	نصیحت کرتے ہیں،

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے، اور قومی دل اور قومی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے ہیں،

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟" عیسائی مذہب کے

اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کرلی ہے جس کا نام "شخصی آزادی کی بحالی" ہے، لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گذرا کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں ہر شخص نگہبان ہے، اور تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت بازپرس ہوگی"۔ قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے۔ تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف، لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے۔ اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے، بنی اسرائیل کے لیے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا، بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارے آباد تھی، وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہوگئے، ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اور اس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا، بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اُس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا ہے، لیکن اُن پر عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا

گروہ بچ گیا، جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا، بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہوگیا، پہلا تو اپنے گناہ کے بدولت، اور دوسرا اپنے فرضِ تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے، سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر میں ہے،

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ	اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا
تَعِظُوْنَ قَوْمًا اۨللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ	کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت
اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا	کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا
قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ	یا سزا دینے والا ہے، انھوں نے
وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا	جواب دیا کہ ہم تمھارے رب کے
نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا	آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لیے
الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ	اُن کو نصیحت کرتے ہیں، اور شاید
وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا	کہ یہ نیک بن جائیں، تو جب وہ
بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا	بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا
يَفْسُقُوْنَ ۝	تو ہم ان کو جو منع کرتے تھے بچا لیا،
(اعراف - ۲۱)	اور گنہگاروں کو ان کی بے حکمی کے
	سبب بڑے عذاب میں پکڑا،

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا، اور سہارا دینا کتنا اہم ہے، اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا

ضروری حصہ ہے! کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار ہے، جیسا وہ اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں، اور اُس کا کیا، بلکہ خود رسولؐ کا بھی یہ فرض نہیں، فرمایا،

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ — رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے،

(مائدہ ۱۳ دنور ۔ ۷)

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لیے سورۂ مائدہ میں فرمایا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ — اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے، تم اگر سیدھے راستہ پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا،

(مائدہ ۔ ۱۴)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس آیت پاک کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ "لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے، کہ اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اُس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں" ۔ ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے، تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی

دریافت کیے تو فرمایا کہ "نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو، اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو، لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے، اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے، تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمھارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے۔"[1]

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں" منسوخ کر دیا، واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی، قوموں کے رسوم و آداب اور اٹیکیٹس اسی اصول پر قائم ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور ہر شخص کے پرائیوٹ اور نجی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نفع و نقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے، مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں، ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہونچتا ہے، اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے، اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں، اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے، اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دنوں میں پوری قوم کا اخلاقی

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی کتاب التفسیر (مائدہ) میں ہیں، ص ۴۹۸ و ۴۹۹

مزاج فاسد ہو جاتا ہے، اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے، ترمذی میں ہے[1]
کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ "بنی اسرائیل میں اخلاقی
تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی، تو پہلے تو اُن کے علماء نے منع
کیا، لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے، صحبت کے
اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت اُن پر لعنت کی"
اس کے بعد آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا" نہیں جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور
اس کو حق پر نہ جھکا دو۔"

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم!

اس کے چند شرائط — لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے،
کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کر دے گا، یہ حق سب سے اول
اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے، قرآن نے کہا،

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ	کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو
اَنْفُسَكُمْ (بقرہ - ۵)	اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے
ساتھ کی جائے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا،

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی

[1] جامع ترمذی تفسیر مائدہ

وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (نحل ۱۶) سے اور اچھی نصیحت سے بلا،

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو کہہ دیا گیا،

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طہ ۲۰) تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی،

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ اور ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ

قَوْلًا بَلِيْغًا (نساء ۔ ۹) ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات۔

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے، اور نیکی کے بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن و امان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے، اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لیے تنفیذی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے،

تجسس اور غیبت کی ممانعت یہ بات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے، اس سے واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق و تفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے، کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت و کیفیت کی جستجو کرے، یہانتک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ

ع محتسب را درونِ خانہ چہ کار

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا، لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے، اس کا اثر صرف اسکی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا، اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں، اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے، جو ممکن ہے آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے، لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادِ تند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے، اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی ہے، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے کہ انما الاذن لاجل الرؤیۃ یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اُس کو نہ دیکھے،

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اُس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ وناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو، اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اُس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے، چنانچہ وحیِ محمدیؐ نے اسی لیے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور سے ممانعت کی، فرمایا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا	اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں
كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ	سے بچتے رہو کہ بیشک بعض گمان گناہ
اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ	ہے، اور نہ کسی کا اندر کا بھید ٹٹولا کرو،
بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ	اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو، بھلا تم میں سے
اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا	کوئی یہ پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ
فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ	بھائی کا گوشت کھائے، سو تم کو گھن
اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ	آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ
(حجرات - ۲)	معاف کرنے والا مہربان ہے،

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنا اس جسم کی حفاظت نہیں کرسکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کرسکتا۔ اس غیبت کی ایسے قابلِ نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرۃً گھن آجائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتی، اسکی کراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، اور نہ اُس شخص کی جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہوسکتی ہے، اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہوتی ہے، جو ایک مسلمان کے شان ایمان کے شایاں نہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اگر تم[1] لوگوں کی کمزوریوں کی

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب النہی عن التجسس

وڑہ لگاتے پھروگے تو اُن کو برباد کر دو گے۔"

غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں ،

توسط اور اعتدال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گذر چکا تھا ، اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو ، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کے پورا کرنے کے لیے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا ،

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے ، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے ، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا ،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے ، اس میں احسان و درگذر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے[1] ، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے ، ان کی شریعت میں عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے[2] ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لیے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کر دیے تھے اسکے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا :-

---

[1] یہود کی سنگدلی کے سبب سے ۔ [2] یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لیے ۔

"تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانتؔ[1] لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کردو، جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑلے، اس کو چادر بھی دیدو، جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑلے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ، جو تم سے مانگے اس کو دو جو تم سے قرض لینا چاہے، اس کو واپس نہ کرو۔

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔" (متی باب ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا، جو بالکل عدل و انصاف پر مبنی تھا، لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے سُن رہی تھی، وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا، لیکن اسلام نے عدل و احسان دونوں میں امتزاج پیدا کرکے دنیا کے نظامِ حکومت کو کامل تر کردیا،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (نحل - ۱۳)	بے شبہ خدا، عدل اور احسان (دونوں) کا حکم دیتا ہے،

یہ ایک اصولی تعلیم تھی، جس نے شریعت موسوی و عیسوی کی دو الگ الگ

[1] یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے،

خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے،

عدل اور احسان

"عدل" اور "احسان" کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لیے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے، قانون کی بنیاد درحقیقت "عدل" پر ہے، عدل کے معنی برابر کے ہیں، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے، اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کیجائے، یہ عدل ہے، اور اُس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگذر کرنا یہ احسان ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اُس نے دیا ہے، یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے، اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے، اور یہ محض شخصی معاملہ ہے، قانونِ عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے، اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے، اور کسی کی جان مال و آبرو سلامت نہ رہے، اس لیے قانون کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے توراۃ کے قانونِ عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لیے قابلِ عمل نہیں رہا، خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے، کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن و امان قائم نہیں رہ سکا، اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی،

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا، بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جراٴت پا کر

اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے۔ اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے، کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے، اس لیے اخلاق کو قانون عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے، جو شریعت محمدیؐ میں پوری طرح برتی گئی ہے، کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی،

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے، بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں، جن کے لیے معاف کر دینا، درگذر کرنا، اور بدلہ نہ لینا آسان ہے، اور بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تندخو پیدا ہوئے ہیں، جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے، ان کے لیے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے، "اور برائی برائی کے بقدر" کے اصول پر عمل کرنے کے لیے ان کو رضامند کر لیا جائے، اس لیے ایک عالمگیر شریعت کے لیے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لیے آئی ہو، عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی،

قانون اور اخلاق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق، اور گو ان دونوں کا منشا ایک ہی ہے، مگر ان کے

منزلِ مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں، اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے، جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے، قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے، مگر دل میں اُس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا، جو انسانیت کی جان ہے، اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو زور مجبور نہیں کیا جا سکتا، اسلیے اس کے ذریعہ عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیۃً نہیں ہو سکتا، توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل واحسان اور قانون واخلاق دونوں کو جامع ہے،

اس جامعیت کا اصول، شریعت محمدیؐ میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا، بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی، اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھکر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا،

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہِ راست دوسروں تک پہنچتا ہے قانون کے تحت میں رکھا، مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا، چنانچہ ان جرائم کے لیے قرآن نے

سزا مقرر کی ہے، جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دیجا سکتی ہے، اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیل نفس کے متعلق تھیں، اُن کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا، مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد کرنا وغیرہ، اس طرح شریعتِ محمدیؐ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے،

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے، قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کردے، بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے، اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام وعدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسلِ انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشو ونما کی پوری طرح متکفل ہے، وہ عدل وانصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے، اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں، وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے، اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس رُوح ہے، بلکہ وہ جسم وجان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے،

عفو اور انتقام موسویؑ، عیسویؑ اور محمدیؐ، اخلاقی تعلیمات میں باہم جو بڑا ایک فرق ہے، وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے، اسلامی قوانین کو پیشِ نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں، لیکن اگر وہ

قانونِ محمدیؐ کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدیؐ کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ پیش نہ آتا، معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے، اُس کا حکم ہے،

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا.............اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا دیسا پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت (احبار ۲۴-۷، اخروج ۲۱-۱۲ گنتی ۳-۳۱ استثنا، ۱۹-۱۱-۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے، اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے:

"تم سن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے دہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔" (متی ۵-۳۸)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کسی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں، اور جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں، اس کی نسبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں

عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى	برابری کے بدلے کا حکم ہوا، آقا کے بدلے
اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ	آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت
وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (بقرہ-۲۲)	کے بدلے عورت،

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا۔ اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ	تو اگر اس کے بھائی کی طرف سے
شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ	کچھ معاف کر دیا گیا تو دستور کے
وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ط	مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی
ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ	کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ
وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى	یہ تمھارے رب کی طرف سے آسانی
بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ	اور مہربانی ہوئی، تو جو کوئی (مقتول
اَلِيْمٌ ٥	کے رشتہ داروں میں سے) اس معافی
	یا خونبہا لے لینے کے بعد پھر زیادتی
(بقرہ-۲۲)	کرے تو اس کے لیے دکھ کی سزا ہے،

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے باوجود اُن کے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم میں خونبہا لیکر معافی کی دفعہ نہ تھی اسلیے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا، اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد

دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کردینے یا خونبہا لے لینے کے بعد انتقام لے لینے پر عذابِ الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے،

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے،

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ
بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ
الْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ
بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ لا
وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ط فَمَنْ
تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ
لَّهٗ ط وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ
اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ
وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ
وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ
هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا

اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں
یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ
کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک،
دانت کے بدلے دانت اور زخموں
میں برابر کا بدلہ، تو جس نے بخشدیا
تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے، اور جس نے
خدا کے اتارے ہوئے حکم کے
مطابق فیصلہ نہیں کیا، تو وہی
ظالم ہیں، اور ہم نے بنی اسرائیل کے
ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے
عیسیٰ کو بھیجا، جو اپنے آگے کی کتاب
توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو
انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے،

لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰاۃِ وَ	اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق
ھُدًی وَّمَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝	کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے
(مائدہ - ۷)	ہدایت اور وعظ ونصیحت ہے،

۲- یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی واخلاقی احکام تھے، مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کے پیشِ نظر رکھتا ہے، فرمایا،

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ	اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمہارا وہی
اَمْوَالِکُمْ (بقرہ - ۳۸)	حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا،

یہ قانون تھا، اب اخلاق دیکھیے،

وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ	اور اگر قرضدار تنگدست ہو تو اس کو اس
اِلٰی مَیْسَرَۃٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا	وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو
خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	کشایش ہو، اور بالکل معاف کردینا تمہارے
(بقرہ - ۳۸)	لیے زیادہ اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو،

جزئیات کو چھوڑکر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ	اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف
مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ	تم کو دی گئی ہو، اور اگر صبر کرلو تو یہ صبر
لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ (نحل ۱۶)	کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے،

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا،

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ	اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو
هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ	تب وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ
سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ج فَمَنْ عَفَا وَ	ویسی ہی برائی ہے، تو اگر معاف کردیا
اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ	اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر
لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (شوریٰ ۴)	ہے، وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا،

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ازخود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا، کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے، جیسا کہ توراۃ میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کردے، اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (وَاَصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا، اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے،

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے، اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو، تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا، اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے، اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی، اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے، حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے، اس لیے ان میں سے کسی

ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا، نظامِ ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے،

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے، اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دیدیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے امیر و غریب اور اپنے و غیر میں کوئی فرق کیا جائے، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارجِ کمال کا ذریعہ بتایا، تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے،

جماعتی انتظامات کے قیام کے لیے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کے وقت حکم ہوتا ہے

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ	اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں
دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ	گنہگاروں پر ترس نہ آئے، اگر تم کو
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نور-۱)	خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے،

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لیے اس گناہ کی سزا دنیا ہی میں دے دینا درحقیقت اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنا ہے، اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کیجائے،

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور

قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں، تو فرمایا "اے لوگو! تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے، اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے، خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا۔"[1]

دوسری طرف عفو کا حال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا۔ الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے،[2] تو اس کو (قانوناً) سزا ملی ہو۔" یہ عمل تھا، تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "میں نے آپ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا، لیکن یہ کہ اس میں آپ نے معاف اور درگذر کرنے کا مشورہ دیا۔"[3] یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زرتاوان) یا خونبہا لے کر معاف کر دینے کو فرمایا، معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہؓ سے فرمایا "آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو، لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضرور ہو جائیگی۔" یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے، تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے، چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے، ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی وہ پکڑا گیا اور عدالت نبوی میں پیش کیا گیا، آپؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جن صاحب کی چادر تھی، انھوں نے آکر

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود ص ۱۰۰۲ [2] ایضاً کتاب الحدود [3] ابوداؤد و نسائی کتاب الدیات۔
[4] ابوداؤد کتاب الحدید۔

عرض کی کہ یا رسول اللہ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائیگا، میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں۔" فرمایا کہ "میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہیں یہ کر لیا"[1]

یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے، اور اس لحاظ سے قانونِ محمدیؐ، موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے۔ لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفو و درگذر کی تعلیم

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گذرتی ہے، وہ عفو، درگذر، ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے، لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے، اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابلِ تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے، تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ "تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ وہ چڑھ میں تمھارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں۔"

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ	اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا
مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ	پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہو

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود۔

عَدْ وًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط	کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ
(انعام - ۱۳)	برا کہہ بیٹھیں،

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے، پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم و ستم اور گالی گلوج پر صبر کرو، اور ان کو معاف کرو، اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے،

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ	معاف کرنے کی خو پکڑ، اور نیک کام
وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ، وَاِمَّا	کو کہہ، اور جاہلوں سے کنارہ کر، اور
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ	تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھارے
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ	(یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ
(اعراف - ۲۴)	وہ ہے سنتا جانتا،

سکون کی حالت میں عفو و درگذر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے، صحابہؓ کی تعریف میں فرمایا:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ	اور غصہ آئے جب بھی وہ معاف
(شوریٰ - ۴)	کر دیتے ہیں،

نیکوکاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا، خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے،

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ	اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں

عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ — کو معاف کرنے والے ہیں، اور اللہ اچھے

الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران - ۱۴) — کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بڑی بلند ہمتی کا کام ہے، فرمایا،

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ — اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف

لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (شوریٰ - ۴) — کیا تو وہ بیشک ہمت کے کام ہیں،

اس برداشت اور عفو کو وحیِ محمدی نے اپنے الفاظ میں عزم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاءؑ اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے، فرمایا،

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُو الْعَزْمِ — اور برداشت کر جس طرح ہمت اور عزم

مِنَ الرُّسُلِ (احقاف - ۴) — والے پیغمبروں نے برداشت کیا،

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے، فرمایا،

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ — اچھی بات بتا اور بری بات سے روک،

الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ — اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ

اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان ۲) — ہمت کے کام ہیں،

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے، فرمایا،

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ — اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو

ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ (آل عمران ۱۹) — یہ بڑی ہمت کے کام ہیں،

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام، بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا ہے، اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسبِ ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے،

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ — (اے پیغمبر!) ایمان والوں سے کہہ کہ

لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ — ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے

(جاثیہ - ۲) — معاف کریں،

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ وہی ہیں جو کافر و مشرک ہیں، اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کیجاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگذر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے۔

إِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوْهُ — اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو

أَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ — یا چھپا کر کرو، یا کسی برائی کو معاف کرو

كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا، (تو یہ مسلمان کی شان ہو) کیونکہ خدا معاف

(النسآء - ۲۱) کرنے والا قدرت والا ہے،

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے، اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمھارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے، اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی اور درماندگی ظاہر ہے، اس کو تو بہرحال معاف ہی کرنا چاہیے، اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے،

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگذر کریں

اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (نور - ۳) اللہ بخشنے والا مہربان ہے

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کرے گا، اس میں عفو و درگذر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے،

برائی کی جگہ نیکی عفو و درگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے والوں کا نام صابر اور ذو حظ عظیم یعنی "بڑا خوش قسمت" رکھا ہے، اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے، فرمایا :-

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ	نیکی اور بدی برابر نہیں، تو برائی کا جواب
اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا	بہتری سے دے، پھر دیکھ کہ وہ جس کے
الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ	اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا
كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ، وَمَا يُلَقّٰهَآ	ہو جائے گا جیسا ناتے دار دوست،
اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا	اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو
يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ	برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی
(حٰمٓ السجدہ - ۵)	بڑی قسمت ہے۔

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے "بڑی خوش قسمتی" سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، پھر دوسری جگہ فرمایا، مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو، کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچائے اور غصہ سے محفوظ رکھے،

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ	مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے،
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ وَقُلْ	ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے
رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ	میرے پروردگار! میں شیطانوں کے چھیڑ سے
الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ	تیری پناہ چاہتا ہوں، اور اے رب اس
اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (مؤمنون - ۶)	سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے، اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے، مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے، فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ	اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں، جس کے
بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ	جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے،
وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝ وَ	(یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے
الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ	ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف
رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ	کھاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے
اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ	لیے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں، اور
عَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ	ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اس میں سے
السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ	چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے
جَنّٰتُ عَدْنٍ ۝	بدلہ بھلائی کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا
(رعد - ۳)	گھر، ہمیشہ رہنے کے باغ۔

ان سے کہا جائے گا:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ	تم پر سلامتی ہو اس کے بدلہ میں کہ تم نے
فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد ۳)	صبر کیا، سو خوب ملا پچھلا گھر۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا، اور

نہ خوفِ خدا کا، صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے اہم فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور روایت میں نو مسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دلآزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں، اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ	وہ لوگ صبر کے سبب اپنا حق دُہرا
بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ	پائیں گے، اور وہ برائی کا جواب بھلائی
السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ	سے دیتے ہیں، اور ہمارا دیا کچھ خیرات
وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ	کرتے ہیں، اور جب کوئی نکمی بات سنتے
وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ	ہیں تو اس سے درگذر کر لیتے ہیں اور
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي	کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے کام
الْجٰهِلِيْنَ ○	ہیں اور تمہارے لیے تمہارے کام سلامت
(قصص - ۶)	رہو، ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں،

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے، نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگذر کرتے ہیں، بلکہ اُن کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرابت کا حق ادا کرنیوالا وہ

نہیں ہے جو احسان کے بدلے میں احسان کرتا ہو، بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو"۔[1]

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آکر عرض کی کہ "اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں، مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں، میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں، میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں، اور وہ جہالت کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا "اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم اُن کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو"، یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو، اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی"۔[2] حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے، اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، یہ نہیں بلکہ اپنے کو پُرسکون اور مطمئن رکھو، لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو، اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو"۔[3]

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کارانہ معاہدوں اور پُرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے، ان کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی ہدایت ہوئی،

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ	اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی
مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ	کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا

[1] صحیح بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [2] صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [3] جامع ترمذی کتاب البر والصلہ ص ۳۲۴، (غریب)

عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (مائدہ ۴-۳)

رہتا ہے، تو تو ان کو معاف کر اور انکے قصور سے در گذر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور اُن کے قصوروں سے در گذر کرنا اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوشخبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم

کا

تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظامِ حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں ہوتی، کہ تمدن اصول قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظامِ حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر وفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جا سکتا، لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے، اور، گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی، سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے، اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے، لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیے جائیں، جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں۔ موقعِ واردات کا

شرارغ دیتے ہیں، مالِ مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، بہرحال تمدنی نظامِ حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظامِ حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی، تمدن کے زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے، اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری

مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے، اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جا سکتی ہے، اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً اصولِ شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، معاملات میں، اخلاق میں، جو چیزیں ناجائز اور مصالحِ عامہ کے مخالف تھیں، ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی، اور جو چیزیں جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھیں، اُن کی ترغیب دی، لیکن امر و نہی کے طریقے، اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے، اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے، اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے، جس سے برائیوں کا تمامتر سدِ باب ہوتا ہے، اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی

تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصا کیا ہو، اور عام انسانوں کیلئے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کردیا ہو، اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کردیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے، اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری، اور انضباط ہے، یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے، اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں، اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت ناتکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا اُمّ الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی، اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ صورت میں شامل ہو گیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تحدید کی، اور ان کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی، اور عرب کے تمام بت توڑ دیئے جاتے، لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا، جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کر سکتی تھیں، تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اس لئے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا، کسی کی مدح میں غلو و اغراق اگرچہ

ایک قسم کی بد اخلاقی ہے، تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور اُن کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے، تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے، اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کیلئے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی تھی، جس نے امم قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی،

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم فانما انا عبد فقولوا عبد اللہ و رسولہ۔ (بخاری کتاب الانبیاء)	میری شان میں مبالغہ نہ کرو، جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان میں کیا، میں تو خدا کا بندہ ہوں، تو کہو کہ خدا کا بندہ اور رسول،

یہ ایک کلی حکم تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو تبا تبا کر اُس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے۔ اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا، اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیرووں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا، اور کوئی بات سوال و جواب کیلئے باقی نہیں رکھی، یہی معنی اس تکمیل کے ہیں، جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کی تکمیل، تین حیثیتوں سے فرمائی ہے۔

۱۔ تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

۲۔ ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ،

۳۔ نرمی و گرمی، عاجزی و بلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل، اور ان کے مواقع کی تحدید،

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

یہودی و عیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کردے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے، اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت **احکامِ عشرہ** کی ہے، یعنی دہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے، ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر، اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت، اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے، باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں جو حسب ذیل ہیں، (دیکھو خروج باب ۲۰)

توراۃ کے اخلاقی احکام

۱۔ تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے،

۲۔ تو خون مت کر،

۳۔ تو زنا مت کر۔

۴۔ تو چوری مت کر،

۵۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے،

۶۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو، اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی، اور اسکے بیل، اور اس کے گدہے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ مت کر،

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے، اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آگئی ہیں، یعنی مسافر، بیوہ، اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم، اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام حسب ذیل مزید تفصیل ہے۔

۱۔ تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے،

۲۔ تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو،

۳۔ تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

۴۔ تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہئے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے،

۵۔ تو بہرے کو مت کوس، تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے، اندھے کے آگے مت رکھ،

۶۔ تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر،

۷۔ تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر، اور نہ اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ،

۸۔ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ،

۹۔ تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے، اور نہ اُن کی طرف سے کینہ رکھ،

۱۰۔ تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے، اٹھ کھڑا ہو، اور بوڑھے مرد کو عزت دے،

۱۱۔ اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے، تم اس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو، جیسے وہ جو تم میں پیدا ہوا ہے، بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو، جیسا آپ کو کرتے ہو۔

۱۲۔ تم حکومت کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں بے انصافی نہ کرو،

انجیل کے اخلاقی احکام

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی، اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی، یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے، اخلاق میں بھی جھلکتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی توراۃ، حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت سلیمانؑ کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یکجا اپنے مشہور وعظ میں انکے سامنے پیش کیا، اس مشہور اخلاقی وعظ میں بہ ترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں،

دل کی غریبی، عگمگینی، حلم و بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی
صبر، عفو و درگذر، پاکدامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف
کرنا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو
کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں، ایسا تم بھی اُن کے ساتھ کرو،

یہ اخلاقی تعلیمات بشیتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں، بنی اسرائیل کے
مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے اُن اخلاقیات کو
بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود اُن میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی خلاق
اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا،

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں
اسلئے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا، اُس کو صرف ایک قوم
یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا
گیا، اسلئے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں، یا پائی جانے والی
تھیں، ان سب کو استقصار کرکے منع کیا گیا، اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن
کو بھی کھول کر بیان کیا گیا، اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی، گذشتہ صحیفوں میں جن
برائیوں سے روکا گیا تھا۔ یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصار کیا اور اُن کے گوشہ گوشہ کو کھول
کر روشن کر دیا، ذیل میں ہم اُن اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں جنکی

تعلیم یا ممانعت قرآنِ پاک نے کی ہے،

قرآنی اخلاق کی فہرست

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو، و درگذر، توکّل، صبر، شکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں قرابت داروں، تیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں، اور غریبوں کی امداد غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ و خیرات، نیکی، اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو چڑھانا نہ برے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا ان کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد و اتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکل حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا، اور بری بات سے روکنا، اولاد کشی، خودکشی، اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال و جائداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب،

خیانت کی برائی، آنکھ، کان، اور دل کی باز پرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درگذر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل وانصاف، دشمنوں تک سے عدل وانصاف، صدقہ وخیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی، اُلاہنے کی مذمت، فسق وفجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی، اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقوی اور پاکیزگی، پاکبازی، جتانے کی برائی، رفتار میں وقار و متانت، مجالس میں حسن اخلاق، ضعیفوں، کمزوروں، اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغلخوری، طعنہ زنی، اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم وجان اور کپڑوں کی پاکیزگی، اور طہارت، شرمگاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، نمائش کی ناپسندیدگی، ترک دنیا، قرض معاف کرنا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثبات قدم، استقلال اور شجاعت وبہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال و دولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے

کی نمائش، معاملات میں سچائی اور دیانتداری

احادیث میں اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہیں، جن کا ماخذ قرآن پاک ہے، اِن کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اقوال میں ہے، جو اُن کی تفسیر و تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں، انکی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کے بڑی تقطیع کے ۷۰ صفحوں میں ہیں، جن میں سے ہر صفحہ میں ۳۰ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں۔ ان میں بعض مکرر باتیں بھی ہیں، تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جزء نہ ہوگا جو داعیِ اسلام علیہ السلام کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو، اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلّم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں،

صلۂ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل وعیال کی پرورش، تیموں کی پرورش، بیوہ کی خبرگیری، حاجتمندوں کی امداد، اندھوں کی دستگیری، عام انسانو

کے ساتھ ہمدردی، قرضداروں پر احسان، فریادیوں کی فریادرسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکرگذاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت وعیادت، رشک وحسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت وبہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر وامام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم وحیا، حلم ووقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفوودرگذر، صبر وتحمل، حسب ونسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر بلا اجازت داخل نہ ہونا، دوسروں کے گھر جاکر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کیلئے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق ونرمی، قناعت اور استغنار، گداگری کی ممانعت، عیب گیری کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغلخوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض وکینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع وخاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منھ پر مدح وستایش کی ممانعت، لعنت کرنیکی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضولخرچی کی ممانعت، کبر وغرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل وانصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غمخواری وغمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضا، ماتم کی ممانعت، قماربازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت، اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرنا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن

سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت، اور دورخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خواری، زناکاری اور چوری کی ممانعت طہارت وصفائی، دوست واحباب کی ملاقات، سلام وتحیت، مصافحہ ومعانقہ دیگر آدابِ ملاقات، آدابِ مجلس، آدابِ طعام، آدابِ لباس، آدابِ نشست وبرخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب واخلاق وسلوک کے احکام،

ان تفصیلات سے قیاس ہوسکے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے،

اخلاقی جزئیات کا استقصار

انسان بڑا بہانہ جو، اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے، اس کیلئے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے، اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کرلے، اس کے لئے ضرورت ہے، کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصاء کیا جائے، اور اسکے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے، اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے، اور اُن کے متعلق صریح احکام دیے جائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اس کی توضیح کے لئے امر ونہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی،

صدقہ وخیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن تورات

نے اس کو صرف عُشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اُس میں نہیں ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے، اور ہر ایک کے ایک ایک جزء کی تفصیل کر دی، توراۃ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عُشر یا زکوٰۃ فرض، اور کن کن چیزوں میں فرض ہے، شریعت محمدیؐ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی، وہ اجناس مقرر کر دیے جن میں عشر یا زکوٰۃ واجب ہے، ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، ان کے اخراجات اور مصارف کی توضیح کی تشریح کر دی، اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ، بلکہ یہ کہا،

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۵	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا
قُلِ الْعَفْوَ،	خرچ کریں، کہدے کہ جو تمہاری
(بقرہ - ۲۷)	ضرورت سے زیادہ ہو،

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو، تو یہ تمہارے کمالِ خُلق کی دلیل ہے، انصارؓ جنھوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرینؓ کی مصیبتیں دور کیں، ان کی تعریف میں خدا نے فرمایا،

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ	وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح

كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو حاجت
(حشر-۱)	ہو۔

صحابہؓ کی مدح میں فرمایا،

يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ	خود کھانے کی خواہش کے باوجود
مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا	مسکین، یتیم، اور قیدی کو کھانا کھلا
(دھر-۱)	دیتے ہیں۔

قرآنِ پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے،

اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں، جو سڑی، گلی، خراب اور نکمی ہو، قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی اور دنائت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے، فرمایا،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا	تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤگے،
مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۥ وَمَا تُنْفِقُوْا	جب تک اس میں سے تم نہ خرچ
مِنْ شَيْءٍ ۥ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ	کرو، جو تم کو محبوب ہے، اور جو بھی تم
عَلِيْمٌ، (آل عمران-۱۰)	خرچ کرو، خدا کو اس کا علم ہے

پھر فرمایا :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا	اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو،

مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ	اُس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم
اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ	تمھارے لئے زمین سے نکالتے ہیں اس
وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ	میں سے کچھ خدا کی راہ میں دو، اور اس
تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ	میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی
اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ط وَ	نہ کرو، کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے
اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ	تو نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کرلو، اور
	یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیون
(بقرہ - ۳۷)	والا ہے،

اس آیتِ پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ "وہ بے پروا اور خوبیون والا ہے" یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی، اس کا یہ سبب نہیں، کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندون کی اچھی چیزون کی ضرورت ہو کہ وہ تو ہماری ہر اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیون والا ہے، اس لئے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے،

سب سے پہلے تمھاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں، جن کی کفالت کا بار تم پر ہے؛ اہل وعیال، دست نگر عزیز و قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر،

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ	کہہ دے جو کچھ تم نیکی کا مال
وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ	خرچ کرو، وہ ماں، باپ رشتہ داروں،
وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ	یتیموں، مسکینوں، اور مسافر کیلئے،
خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ	اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو، اللہ
(بقرہ ۔ ۲۶)	اس سے واقف ہے،

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا "ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے، لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو فرمایا، مزدوری کرے، اور جو ملے، اس میں کچھ خود کھائے، کچھ محتاجوں کو کھلائے، صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے، یہ بھی صدقہ ہے[۱]، دوسرے موقع پر فرمایا "اچھی بات کہنا، اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے[۲]،" غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے،

---

[۱] الادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقۃ ص ۶۰ مصر [۲] جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ضائع المعروف،

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرکے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ احسان اُس پر جتاؤ، نہ اس سے اسکے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمایش مقصود ہو، کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر-۱)	اور اپنا احسان نہ جتا کر تو اور زیادہ چاہے،

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، (بقرہ ۷-۳۶)	اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھکر اور جتا کر برباد مت کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے، جو لوگوں کے دکھانے کیلئے خرچ کرتا ہے، اور خدا اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا،

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی ہی نیکی بہتر ہے

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ، (بقرہ ۷-۳۶)	اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے، اور خدا بے نیاز اور بردبار ہے،

ریا اور نمایش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو، اور لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصد ہو

تو دکھا کر کے بھی دے سکتے ہو،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (بقرہ ۴-۳۷)

اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے، اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمھارے لئے سب سے بہتر ہے، اور اللہ تمھاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے،

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (بقرہ-۳۸)

جو لوگ اپنا مال رات اور دن چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم،

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی خوشی ہونی چاہیئے، جبر و کراہت سے نہ ہو کہ یہ منافقت کی نشانی ہے،

وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (توبہ ۷-۷)

اور وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کڑھ کر،

صدقہ و خیرات سچے دل سے اور صرف خدا کے لئے ہونی چاہیئے،

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ — اور انکی مثال جو اپنے مال اللہ کی

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًا — خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا

مِّنْ اَنْفُسِھِمْ الآیہ — کرکے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس

(بقرہ ک ۳۶) — باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو،

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود خدا ہو،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْہِ — اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ

اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ — کی ذات کو چاہ کر، اور جو خیرات

یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ — کرو گے وہ تم کو پوری ملے گی، تمھارا

لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (بقرہ ک ۳۷) — حق کچھ دبا نہ رہے گا،

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشون کا احاطہ کیا ہے،

... کی حرمت

... یات کا احاطہ

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہی مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہین کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور ہان اور نہیں کے تمام پہلوؤن کو دور کرکے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگون نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا،

اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیتہً محفوظ نہیں رہ سکتے، مثلاً ایک شخص شراب نہین پیتا لیکن اس کی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونون چیزون سے احتراز کرتا ہے لیکن اُن برتنون کو استعمال میں لاتا ہے، جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، لعن اللہ الخمر و شاربھا و ساقیھا، و بائعھا و مبتاعھا و عاصرھا و معتصرھا و حاملھا، والمحمولة الیه

(ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آپ نے فرمایا، خدا شراب پر، اسکے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اسکے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے اپنے لیے نچوڑنے والے پر، اسکے لیجانے والے پر، اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لیجائی جائے لعنت کرتا ہے۔

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگون کو روکتا ہے سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے، عرب مین شراب مختلف چیزون سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے، اور ان کا اثر بھی مختلف تھا۔ قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی

تعیین فرما دی،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من العنب خمرا وان من التمر خمرا وان من العسل خمرا وان من البر خمرا وان من الشعیر خمراً (ابو داؤد کتاب الاشربہ)

آپ نے فرمایا انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے بھی، اور جو سے بھی،

قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الخمر من العصیر والزبیب والتمر والحنطة والشعیر والذرة وانی انھاکم عن کل مسکر، (ابو داؤد کتاب الاشربہ)

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ شراب انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں،

عرب کے مختلف حصوں میں ان ہی چیزوں کی شراب بنتی تھی، اس لئے یہ تعریف عرب کے تمام اصنافِ شراب کو حاوی تھی لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا، اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں، اور تحدید اُن کو شامل نہ ہو، اس لئے آپ نے شراب کی ایک کلّی تعریف کی جو تمام اقسام شراب پر حاوی تھی،

كل مسكر خمر وكل مسكر حرام	ہر نشہ آور چیز شراب ہے، اور ہر نشہ آور
(ابوداؤد کتاب الاشربہ وصحیح مسلم واحمد وترمذی ونسائی)	چیز حرام ہے،
كل شراب اسكر فهو حرام	ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے
(ابوداؤد واحمد وبخاری ومسلم)	وہ حرام ہے،

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لئے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمتِ شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے، اس لئے فرمایا،

ما اسكر كثيره فقليله حرام	جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے
(ابوداؤد کتاب الاشربہ)	اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے،

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں، تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں، اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھی ممانعت فرمائی،

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل مسكر ومفتر	(ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۶۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نشی و مخدر چیز سے منع فرمایا،

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی نشی چیزیں استعمال کریں جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی جسکو

وادی کہتے تھے، چنانچہ آپ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا،

یقول یشرب ناس من امتی	آپ نے فرمایا کہ میری امت میں
الخمر یسمونھا بغیر اسمھا	کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال
(ابو داؤد کتاب الاشربہ)	کریں گے،

ان کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی،

نھی عن الدباء والحنتم	آپ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان
والمزفت والنقیر،	اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ
	کرکے شراب رکھی جاتی منع فرمایا،

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لئے آپ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرمادیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اسکی حقیقت بدل دی جائے، دوسری یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی، چنانچہ یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمتِ خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوگئی، حضرت ابو طلحہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنالیا جائے لیکن آپ نے اجازت نہ دی[1]،

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ، اس سرکہ کے جواز و عدم جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے،

ایک بار دیلم حمیری نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں، اور سخت کام کرتے ہیں، اس لئے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ نے فرمایا کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے، انھوں نے کہا ہاں" آپ نے فرمایا تو اس کو چھوڑ دو، انھوں نے کہا لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے، ارشاد ہوا کہ اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جہاد کرو[1]"

سود کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی "ناروا نفع" سے لوگوں کو روکا ہے، تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا، اس ظلم میں لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں، ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا،

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربوا و موکلہ و شاھدہ و کاتبہ، (ابو داؤد کتاب البیوع)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے، اور اسکے لکھنے والے پر لعنت بھیجی،

رشوت کی حرمت میں استقصار

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۰ ۸ کتاب الاشربہ،

والمرتشی دونون پر لعنت بھیجی ہے،

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصاء اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے، کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے، اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتین پیدا ہو جاتی ہین، اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسلئے جب تک ان تمام صورتون کو مٹا نہ دیا جائے اُس چیز کا کلیتہً قلع وقمع نہیں ہو سکتا،

مسیحی اخلاق کی کمزوری

نرم وگرم اخلاق مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی، کہ اس نے حسنِ اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم مین کر دیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی وغیرہ، منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا، اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کے امن وسلامتی اور ترقی وخوشحالی کے لئے دونون قسم کی مناسب قوتون کے امتزاج کی ضرورت ہے، جس قدر ایک مقام پر تواضع وخاکساری کی ضرورت ہے اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزتِ نفس کی حاجت ہے، جس طرح عفو ودرگذر بلند ہمتی کا کام ہے، اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے، محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندون کیلئے ضروری ہی، مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہئے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے،

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا وبیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے، اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھرایا ہے، وہ اسی لئے ہے کہ

وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری، اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں، جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم، عزتِ نفس، اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہوسکتے،

وہ کہتا ہے،

"مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائع انسانی کی تمام خوددارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے، مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے[1]"

اسلامی اخلاق کا اعتدال

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۰۰ برس بعد اس نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا ہے، جس نے مسیحی نظامِ اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی، اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا، جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہی، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گذری تھی کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلندی کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی، اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کرلی، مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی، جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریۃً قبول نہیں کیا،

نفوس کا اختلافِ استعداد

اخلاقی تعلیم کوئی ایسی طب نہیں ہے، جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو، تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں، انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع

---

[1] نطشہ از ایم اے گیے، مترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی، ایم اے، باب سوم،

بھی ہین، اور مغرور و خودار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بردبار بھی ہین، اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہیں، اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہین اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں، اور پُرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہین، اور قوی دل بھی، ظالم اور زبردست بھی ہیں اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کیلئے ایک دوا کبھی کارآمد نہین ہوسکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہون، اور ہر قسم کے مریضون کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو،

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھکر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کرکے قوتون مین مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر، اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ، اور بلند ارادہ کو دوسرون کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پُر امید کرے، اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ خدا سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسرون سے بے نیاز کرکے خدا سے مانگنے والا کردے، وہ ذلیل و خوار کو خوددار اور خوددار کو غیر مغرور بنا دے، وہ اچھی قوتون کو نشو و نما دے، اور بُری قوتون کا رخ اچھے مقصدون کی طرف پھیر کر اُن کی بُرائی کو کم سے کم کردے،

قوت غضب اور قوت شہوت مین تعدیل

قدیم فلسفۂ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اُس کی دو قوتون پر ہے، قوتِ غضب اور قوتِ شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے

نامناسب امور کے پیش آنے پر اُن کی مدافعت کی قوت کا، اور شہوت نام ہے نفس
کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونون قوتون کی افراط و
تفریط، اور اعتدال، اور ان کے مختلف مراتب سے سیکڑون اچھے بُرے اخلاقی جزئیات
پیدا ہوتے ہین، اور اُن مین سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے، غضب کی قوت اگر
افراط و تفریط سے پاک ہو، اور عقل کے قابو مین ہو، تو اس کا نام شجاعت ہے، اور وہ
حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکرون مین جلوہ گر ہوتی ہے، مثلاً خودداری،
دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثباتِ قدم، وقار، صبروسکون
مطالبۂ حق، جدوجہد، سعی و محنت، جہاد، پھر جب یہی قوتِ اعتدال سے ہٹ کر افراط
کی طرف مائل ہوتی ہے، تو تہور بن جاتی ہے، اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت،
خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسرون کی تحقیر، ظلم، قتلِ نفس وغیرہ کی برائیان پیدا ہو جاتی ہین،
اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے، تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف
اور دنائت کے قالب مین ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال
ہوتا ہے، تو اس کو عفت کہتے ہیں، یہی صفت مختلف سانچون مین ڈھل کر مختلف نامون
سے پکاری جاتی ہے، یعنی پاک دامنی، پرہیزگاری، جود و سخا، شرم و حیا، صبر و شکر،
قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل و اولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی
مناسب طلب وغیرہ، پھر یہ صفت، جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہوتی ہے،
تو اس سے حرص و طمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک،

وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے، اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر اُن میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے، مسیحیت کے نزدیک نفس یہ دونوں قوتیں بذاتہٖ بری ہیں، اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں، بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع و محل برا ہوتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوتِ غضب کو فنا کر کے "دشمن کو پیار کرو"، اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو، اور مفلس و غمگین بن کر زندگی گذار دو، بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کر دو، اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انہیں ہدایت ملے، اور خدا کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ، لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو، امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے کی تعریف کی ہے، غصہ کے مٹانے والے کی نہیں، اُس نے وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ کہا ہے وَالْفَاقِدِينَ الْغَيْظَ نہیں،

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں

دنیا میں علم و ہنر، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی، جد و جہد جو کچھ ہے وہ ان ہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں، اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے، تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مرجائے، نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن و

امان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ، اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم اور سعی ومحنت کے جوہر نمایان ہون، قومون کی ترقی اور ملکون کا نظام درہم برہم ہو جائے، اور خدا کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بنجائے جسمیں حرکت وجنبش کا نام نہ رہے،

مسیحی اخلاقی تعلیم مین یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہین ہے، بلکہ بیجا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزین ہین، اسی قدر وہ معائب بھی جوان دونون قوتون کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہین، مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دنائت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے علی ہمتی، فاقہ زدگی بھی برے ہین، اسلام نے اپنے پیرون مین ان دونو قوتون کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے، اس نے جہان ان کو رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں رحمدل) اور اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (مومنون کے فرمانبردار) کی تعلیم دی، وہین اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (کافرون پر بھاری) اور اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (کافرون پر گران) بننے کی بھی تعلیم دی، اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور انکے فرمانبردارون کے حصہ میں ہے، وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ مسیحی قومون کو اس وقت تک ترقی کا منھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا، جب تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انھون نے فائدہ نہین اٹھایا، لیکی تاریخ اخلاقِ یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے:-

"لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمامتر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے.....

......اور گویہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں ومناسب رہا، تاہم تمدن کی روزافزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقی تمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو، اور حریت کے جذبات موجود ہوں، اور انکسار وتواضع اس کے دشمن ہیں، خانقاہانہ طرزِ زندگی کا شس، فوجی طرزِ زندگی کا اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی وخودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اُسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمحِ نظر تھا، کسی طرح ترقیِ تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا، اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں، لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو جاتا ہے، اسی کو دیکھ کر متاخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا، اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی، اور دوسرے خودداری، ان ہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی، بلکہ انکے بجائے دنائت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں، اُن سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں (فصل ۱)

کا اعتراض

اخلاق پر

اسلام اور بلند اخلاق | لیکن اس کے بالمقابل معلم اسلام علیہ السّلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے، فرمایا۔

اِنَّ اللہ یحبُّ معالی الامور	بیشک اللہ تعالیٰ امور کو پسند اور محقرات
ویبغض سفسافہا،	امور کو ناپسند کرتا ہے،

"معالی امور" سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام، اور محقرات سے مراد چھوٹی اور دنی باتیں ہیں، اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کیلئے ضرورت ہی کہ اسکی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے، اور دنائت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:۔

المؤمن القوی خیر واحبُّ	کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان
الی اللہ من المؤمن الضعیف	زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا
وفی کل خیر احرص علیٰ	ہے، اور ہر ایک میں بھلائی ہے، ہر
ما ینفعُکَ واستعن باللہ	وہ چیز جو تجھے نفع دے، اس کی پوری
ولا تعجزوان اصابک شئ	خواہش کر اور خدا سے مدد چاہ، اس
فلا تقل لوانی فعلت کان	راہ میں کمزوری نہ دکھا، اور اگر
کذا وکذا ولکن قل	تجھے اس میں تکلیف ہو پہنچ جائے

قدر اللہ وما شاء فعل — تو یہ نہ کہہ "اگر میں یوں کرتا تو یوں

فان لو تفتح عمل الشیطان — ہوتا" بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر

کر دیا تھا، اور جو چاہا اس نے کیا

کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا

(صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ) — کاروبار کھولتا ہے،

تقدیر، توکل، صبر اور شکر، یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، توکل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے، اور جن کی پوری تفصیل مسئلۂ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں، اور عباداتِ قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لئے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، بے امیدی، استقلال اور ثباتِ قدم پیدا ہو، مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہئے، پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہئے اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور یہ سمجھنا چاہئے کہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا، اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس و ناامیدی کے بجائے، صبر و ثبات پیدا ہونا چاہئے، اور سمجھنا چاہئے کہ خدا کا منشا یہی تھا، (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں، جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے،

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ، (آل عمران ۱۷) — جب تو پکا ارادہ کرلے پھر خدا پر بھروسہ کر، بیشک اللہ متوکلوں کو

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

(آلِ عمران - ۱۷)

اگر خدا تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں، اور اگر وہ چھوڑ دے، تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے، خدا ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے،

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ،

(حدید - ۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، یہ اس لئے تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کرو، اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا،

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنائت کے لئے نہیں، بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری، اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے

ہے، اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہؓ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا، اور کامیاب رہے، اُن کو مشکلات میں خدا کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی،

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ	اے ہمارے پروردگار ہم پر صبرو
ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا	ثبات کا پانی بہا، اور ہمارے پاؤں
عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ،	کو مضبوط گاڑ، اور ہم کو کافر لوگوں
(بقرہ-۳۲)	پر فتحیاب کر،

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ	اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر
رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا	بہت سے اللہ والوں نے لڑائی
لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	لڑی، تو خدا کی راہ میں جو مشکل
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا	یا مصیبت پیش آئی، اس سے وہ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ، وَ	سست نہ ہوئے، اور نہ کمزور ہوئے
مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا	اور خدا ثابت رہنے والوں کو پیار
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا	فرماتا ہے، اور اُن کا کہنا تھا
فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا	لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے
وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ	گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما

(آل عمران - ۱۵) اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہمکو کافروں پر فتح دے،

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

اے وہ جو ایمان لائے ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو تاکہ کامیاب ہو،

(آل عمران - ۲۰)

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی، اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے، اسی طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے،

اپنے دشمنوں کو پیار کرو

مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو، اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اہلِ معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسروں[1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے، تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو، مگر

---

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی،

تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے، کہ یہ دل کا فعل ہے، جس پر تم کو قدرت نہیں، اخلاقِ محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی، جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے، یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو، برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بددعائیں دیں ان کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں ان کو معاف کرو، اور جو تم پر ظلم کریں، ان کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا
قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ
عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ط اعْدِلُوا
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۔ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌ بِمَا
تَعْمَلُونَ،
(مائدہ-۲)

اے ایمان والو! خدا کے لئے کھڑے ہو جایا کرو، انصاف کے ساتھ گواہ بن کر، اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے، انصاف کرو کہ انصاف کرنا پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے، اور خدا سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے،

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا
السَّيِّئَةُ ط ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ
فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ
عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کو بھلائی سے دفع کرو، تو دفعۃً وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائیگا،

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ	اور اس پر عمل کی توفیق ان ہی
وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ	کو ہوتی ہے، جو صبر کرتے ہیں،
وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ	اور ان ہی کو یہ سعادت ملتی ہے
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ	جو بڑی قسمت والے ہیں، اور
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○	اگر شیطان تم کو اکسائے تو خدا
	کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا
(حٰمٓ السجدۃ ۵-۵)	جاننے والا ہے،

۱۔ اس آیتِ پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے، کہ بھلائی اور بُرائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے،

۲۔ اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے، جو تمھارے دشمن ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے، کہ تمھارے اس نیک طرزِ عمل سے تمھارا دشمن تمھارا دوست بن جائے گا،

۳۔ دشمن کے ساتھ اس کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا، اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدیؐ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

۴۔ دشمن کے ساتھ بُرائی کرنا کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے، اور اُس سے خوش قسمت مسلمان کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابن عباسؓ

جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں[1]،

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر حلم اور عفو و درگذر کا حکم دیا ہے، وہ ایسا کریں گے، تو خدا اُن کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائیگا، اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح اُنکے آگے سر جھکا دیگا"

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھے تھے، گالی دی، وہ سن کر چپ رہے، اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اُس نے پھر تیسری مرتبہ بدزبانی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے، اور کچھ بول اُٹھے، یہ دیکھکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) فوراً اُٹھ گئے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ مجھ سے خفا ہوئے، فرمایا نہیں، ابوبکر جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمھاری طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا، تو وہ ہٹ گیا[2]"

آپ نے فرمایا "صلۂ رحم یہ نہیں ہے کہ صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو، بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرے اس کے ساتھ صلۂ رحم کرو[3]" یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے،

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمتِ نبوی میں آکر عرض کی، یا رسول اللہ مجھے وہ بات بتائیے جس کے کرنے سے جنت مل جائے، آپ نے اس کو چند باتیں بتائیں، منجملہ اُن کے

[1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۲، و ابن جریر جلد ۲۴، ص ۶۸ مصر [2] سنن ابن داؤد کتاب الادب باب فی الانتصار [3] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ ص ۸۸۶،

فرمایا "ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کردو[۱]"

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہبی دشمن نہیں ہو سکتا لیکن دیکھو کہ قرآنِ پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے،

قُلْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا	(اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہہ دے
لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ	کہ ان کو جو خدا کے دنوں پر یقین
لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا	نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں تاکہ
یَکْسِبُوْنَ،	خدا ایسے لوگوں کو اُن کے کرتوتوں
(جاثیہ-۲)	کا بدلہ دے،

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ "ریاکار فریسیوں" اور "سانپوں اور سانپوں کے بچوں[۲]" والی مسیحیت کے وعظ میں نہیں، بلکہ اسلام کے اُس اولین داعی و واعظ میں ہے جس نے فاتح بن کر مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں، بیک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا[۳]، جس نے اس کو معاف کیا جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لئے اہلِ مکہ کا اشتہار و انعام سنکر اس کا تعاقب کیا تھا[۴]، جس نے خیبر میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا[۵]، جس نے

---

۱ مستدرک حاکم کتاب المکاتب جلد ۲ ص ۲۱، حیدرآباد دکن ۲ انجیل متی ۲۳-۲۵-۳۳ ۳ صحیح بخاری باب فتح مکہ ۴ ایضاً کتاب الہجرت ۵ ایضاً باب فتح خیبر و ذکر وفات نبوی،

اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا[1] جس نے حمزہؓ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا[2] جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا[3] جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا[4] جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ محو خواب تھا، اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پاکر معاف کیا[5] جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی[6] جنھوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی جس سے اس کے پاؤں خون آلودہ ہو گئے تھے، جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنیوالوں کو نیک دعا دی تھی[7] جسنے دشمنوں کے حق میں بد دعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کیلئے نہیں بلکہ رحمت کیلئے آیا ہوں[8] صلی اللہ علیہ وسلم انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیزگاری) کی شان بتائی گئی،

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ	لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد
الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ	باندھا پھر انھوں نے تم سے کچھ کم
شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ	نہ کیا، اور نہ تمہارے خلاف کسی

۱؎ صحیح بخاری فتح طائف ۲؎ ایضاً باب فتح مکہ، ۳؎ کتب سیر وطبقات صحابہ ذکر استعفار یان فتح مکہ و ہبار بن اسود ۴؎ جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۂ فتح ص ۵۰۴، ۵؎ صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۲۰۸، ۶؎ ابن سعد غزوہ طائف، ۷؎ فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۶ مصر باب احد، ۸؎ صحیح بخاری مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مشکوٰۃ اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم،

اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ	کی مدد کی، تو ان کا عہد ان کی مدت
عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ	مقررہ تک پورا کرو، اللہ پرہیزگاروں
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ،	(توبہ ۱) کو دوست رکھتا ہے،

کفار و مشرکین سے عدم موالات

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے، یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیرووں کو اس کے ان مخالف کے میل و جول، رازداری، اور رفاقت سے روک دے، جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کردینے کے درپے ہوں، خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں، اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو، یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیرووں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں، چنانچہ اس قسم کی آیتیں،

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ	ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں
اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	کو اپنا دوست نہ بنائیں، تو
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ	جو ایسا کریگا، تو اس کو اللہ سے
مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ	کوئی علاقہ نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے
تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران ۳)	بچاؤ چاہو،

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا	اے ایمان والو! اپنے باپ، اور
اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ	بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف
اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ	کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست
وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ	نہ بناؤ، اور تم میں سے جو کوئی اُن
ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ،	سے دوستی رکھے گا، تو وہی حد سے
(توبہ - ۳)	گذرنے والے ہونگے،

اسی موقع کی ہیں، ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی، فطرۃً ان اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی، جو اس حق کے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں، اس لئے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں، جو شہزادہ امن "کے اس اعلان کے ہیں،

"یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہیں، بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اُسکے باپ اور بیٹے کو اسکی ماں اور بہو کو اسکی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہونگے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے، وہ میرے لائق نہیں،" (متی کی انجیل باب ۱۰ - ۳۴)

یہی سبب ہو کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق میں یہود یوں کیساتھ وہ نرمی، رحمدلی اور

رقیق القلبی نہ تھی، جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گنہگاروں کے ساتھ تھی، وہ یہودیوں
کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے، جب حجاز کے یہودیوں اور سرحدِ
شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی، اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان
اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے اُن کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا، تو مدینہ کے
منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی، اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ
اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں، تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو
تو اُن کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دینِ اسلام سے
منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہلِ کتاب سے
رازدانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! یہودیوں اور
الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ	نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَ	میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں،
مَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ	اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت
مِنْهُمْ ط إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي	کرے، وہ ان ہی میں ہے، اللہ
الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ، فَتَرَى	بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں
الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ	دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے جن
يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ	کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر

نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ط
فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ
اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا
عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
نٰدِمِيْنَ، وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا
بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ
لَمَعَكُمْ ط، حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ
دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ
يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ،

(مائدۃ - ۸)
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا

ان سے ملے جاتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ
ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ
آجائے تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی)
فتح یا (ان کی کامیابی کی)، کوئی اور بات
اپنے پاس سے بھیجے، تو پھر وہ اپنے
دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں،
اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں
جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے
ساتھ ہیں، خراب گئے ان کے عمل،
پھر رہ گئے نقصان میں، اے ایمان والو!
اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھریگا،
تو خدا کا کچھ ہرج نہیں، اللہ اپنے دین
کے لئے اور دوسرے لوگوں کو لائیگا،
جن سے راضی ہوگا، اور وہ اللہ سے
راضی ہوں گے، جو ایمان والوں کے
فرمانبردار اور کافروں پر بھاری ہونگے،
اے ایمان والو! اہل کتاب

الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (مائدہ ۹)

اور کفار میں سے ان کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ، اور خدا سے ڈرو اگر یقین رکھتے ہو،

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیقِ کار، محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ، اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آلِ عمران کی اس آیت میں ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ،

(آلِ عمران - ۱۲)

اے ایمان والو اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے جتنی تم کو تکلیف پہنچے، ان کو خوشی ہے، دشمنی اُن کی زبان سے نکلی پڑتی ہے، اور جو ان کے جی میں چھپا ہے، وہ اس سے زیادہ ہے، ہم نے تم کو باتیں جتا دیں، اگر تم کو عقل ہے،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے، اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے، جس کی روک تھام

کے لئے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور سازباز سے روکا گیا ہے، سب سے زیادہ تصریح
سورہ ممتحنہ میں ہے، فرمایا،

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا	اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں
عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ	کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی
تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ	کا پیغام بھیجو، اور وہ اس سچائی کے
وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ	جو تم کو ملی، منکر ہیں، وہ رسول کو اور
الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ	تم کو اس لئے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم
اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ	اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے،
رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ	اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری
جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ	خوشنودی کی طلب میں نکلو تو تم ان کو
مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ	دوستی کے چھپے پیغام بھیجو اور مجھے خوب
بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ	معلوم ہے، جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر
اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ط وَمَنْ	کرتے ہو، جو تم میں ایسا کرتا ہے وہ
يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ	سیدھی راہ بھولا ہے، اگر وہ جن کو
سَوَآءَ السَّبِيْلِ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ	تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو، تم کو
يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ	موقع سے پائیں، تو تمہارے دشمن ہوں
يَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ	اور تمہاری تکلیف پہنچانے کے لئے اپنے

وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا	ہاتھ بڑھائیں، اور بُرائی کے ساتھ
لَوْ تَكْفُرُوْنَ، لَنْ تَنْفَعَكُمْ	اپنی زبانیں کھولیں، اور چاہتے ہیں
اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ	کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ،
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ،	تم کو تمھاری قرابت اور تمھاری اولاد
(مُمْتَحِنَه - ١)	قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائیگی،

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیے،

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ	خدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی
لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ	اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا
لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ	جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا	کرتے، اور نہ تم کو تمھارے گھروں
اِلَيْهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ	سے نکالتے ہیں، خدا انصاف والوں
الْمُقْسِطِيْنَ، اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ	کو پیار کرتا ہے، وہ انھی سے دوستی
اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ	کرنے کو منع کرتا ہے، جو تم سے مذہب
فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ	میں لڑائی لڑیں، اور تم کو تمھارے
مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا	گھروں سے نکالیں، اور تمھارے
عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ	نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار
وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ	بنیں، جو ان سے دوستی کا دم بھریگا

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ، (ممتحنہ ۲) — تو وہی بے انصاف ہونگے،

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ عنقریب تمھاری فتح ہوگی، اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی، فرمایا،

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ — اُمید ہے کہ اللہ تعالےٰ اور تمھارے

وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ — دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کردے

مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ (ممتحنہ ۲) — اور اللہ قدرت والا ہے،

ان آیتوں کا مطلب اُن کے شان نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہوجاتا ہے، انھی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بیخبری میں مکہ پر قبضہ کرلینا چاہتے تھے، تیاریاں ہورہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطبؓ بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کیلئے چپکے سے ایک خط لکھکر اور ایک عورت کو دیکر مکہ کی سمت روانہ کردیا کہ قریش خبردار ہوجائیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر ہوگئی، آپنے دو سواروں کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں، وہ خط آیا تو آپنے حاطبؓ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی یارسول اللہ! جلدی نہ فرمایئے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں، لیکن اُن سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں، اور جس قدر مہاجرین ہیں وہاں ان کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں، جن کے سبب سے اُن کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں، میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی، جس کا مکہ والے لحاظ کرتے تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں، میں نے دینِ حق سے مرتد ہوکر ایسا نہیں کیا، آپ نے فرمایا، تم بدر والے لوگ ہو، خدا نے تمھارے گناہ

معاف کرنے ہیں، اس پر یہ آیت اتری، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا، اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہدِ عتیق میں بھی مذکور ہیں، زبور میں ہے،

"اے خدا تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا، پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں، اے خداوند کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا، جو تیرا کینہ رکھتے ہیں، کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے رو ٹھے ہیں، بیزار نہیں ہیں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں میں انھیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں"،

(۱۳۹ - ۱۹ - ۲۲)

یشوع کے صحیفہ میں ہے،

"اگر تم کسی طرح برگشتہ ہو، اور ان لوگوں کے بقیہ سے لپٹو، جو تمھارے درمیان باقی ہیں، اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو، اور ان سے ملو، اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمھارا خدا پھر ان گروہوں کو تمھارے سامنے سے دفع نہ کریگا، بلکہ وہ تمھارے لئے پھندے اور دام اور تمھاری بغلوں کے لئے کوڑے اور تمھاری آنکھوں میں کانٹے ہونگے، یہانتک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمھارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے" (یشوع باب ۲۳-۱۲)

۵؎ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ،

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گنہگاروں سے علحدہ رہنے کی نصیحت ہے،

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا	وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو، جس
فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا	طرح انھوں نے کفر کیا، تو ان میں
مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا	سے اپنے دوست نہ بناؤ یہاں
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ،	تک کہ وہ خدا کی راہ میں ہجرت نہ
(نساء ع-۱۲)	اختیار کریں،
وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ	اور جب تو ان کو دیکھے کہ جو میری
فِىْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى	آیتوں کی شان میں لغو بکتے ہیں، تو
يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ط	ان سے کنارہ کرے، یہاں تک کہ
وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا	وہ اس کے سوا دوسری بات میں
تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى	لگ جائیں، اور اگر تجھ کو شیطان
مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝	بھلا دے، تو یاد آنے کے بعد پھر ان
(انعام ع-۸)	گنہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ،
وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ	اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب
اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ	سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے
يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا	اور ان پر ہنسی ہوتے، تو ان کے

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (نساء - ۲۰)

ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں، نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی انہی کے جیسے ہو جاؤ گے،

یہ احکام اس لئے ہیں تاکہ بُری صحبت کا بُرا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے، اُن کے معنی قریب قریب وہی ہیں، جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں،

"میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں یا لٹیروں یا بت پرستوں سے نہ ملو، نہیں تو تمھیں دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا، پر میں نے اب تمھیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار یا لالچی، یا بت پرست، یا گالی دینے والا، یا شرابی، یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا، بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا...... غرض کہ تم اس بُرے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو" (اوّل قرنیتون ۵)

اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوے میں مت جُتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کون سا ساجھا ہے، اور روشنی اور تاریکی میں کونسا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے، خدا کی ہیکل کو بتوں سے کونسی موافقت ہے...... اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ، اور جدا ہو، اور ناپاک کو مت چھوؤ،

(۲- قرنیتون - ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام دنیاوی

معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے،
عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے،

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ	اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے
اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ	پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دے یہاں
كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ	تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر
مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ	اس کو تو اسکی امن کی جگہ تک پہنچادے،
لَّا يَعْلَمُونَ ۝ (توبہ - ۱)	یہ اس لئے کہ وہ نادان لوگ ہیں،

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں اُن کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے، فرمایا،

وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ	اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر
بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا	ضد کریں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک
تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا	کر جس کا تجھے علم نہیں، تو اُن کی بات
مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ	نہ مان، اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی
أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ	کا برتاؤ کر، اور اس کی راہ چل جو میری
فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ	طرف جھکا، پھر تم سب کو میری طرف

تَعْمَلُوْنَ، (لقمان-۲) آنا ہی، پھر میں تم کو جتاؤنگا جو تم کرتے تھے،

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے،

سختی کا جائز موقع اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ اُن کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں "منافقین" کہتے ہیں، بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو، اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں، وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کرلیں، یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں، اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کیجائے، اور مسلمانوں کو اُن کے میل جول سے روک دیا جائے، اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ اُن سے لڑا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز آجائیں، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امامِ وقت کو حاصل ہے، اس موقع کی دو آیتیں سورۂ توبہ میں ہیں،

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ	اے پیغمبر اُن کافروں اور منافقوں
وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ	سے جہاد کر اور اُن پر سختی کر اور انکی
وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ	جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی
الْمَصِیْرُ، یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ	بری بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی

مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ

(توبہ - ۱۰)

قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے ایسا نہیں کہا، حالانکہ انھوں نے یقیناً کفر کی بات کہی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا، اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ نہ پا سکے، اور انھوں نے عیب نہیں کیا لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کر دیا تو اگر وہ باز آجائیں تو ان کے لئے یہ بہت اچھا ہے، اور اگر وہ منھ پھیر لیں تو اللہ ان کے اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دیگا، اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہوگا اور نہ مددگار۔

یہ آیتیں اس سختی کے موقع پر خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں، اور اُن کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں، وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں، تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے،

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۱۰ ص ۷۶ ۴، مصر،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا	اے ایمان والو! ان کافروں سے
الَّذِیۡنَ یَلُوۡنَکُمۡ مِّنَ الۡکُفَّارِ	لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں، اور چاہئے
وَلۡیَجِدُوۡا فِیۡکُمۡ غِلۡظَۃً ؕ	کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں، اور
وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ	یقین کرو کہ اللہ پرہیزگاروں
(توبہ - ۱۶)	کے ساتھ ہے،

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لئے ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر اُن پر حملہ کی نیت نہ کریں،

تحریم اور ایلا کے موقع پر جب بعض منافق اہلِ بیتِ نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا،

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الۡکُفَّارَ	اے پیغمبر! اُن کافروں اور منافقوں
وَالۡمُنٰفِقِیۡنَ وَاغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ	سے جہاد کر، اور اُن پر سختی کر اور اُن کا
وَمَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ	ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بازگشت
الۡمَصِیۡرُ (تحریم - ۲)	کی کتنی بری جگہ ہے،

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیے گئے ہیں، جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے،

قرآن پاک میں ایک ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں، اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں، اور وہ سورۂ فتح کی حسب ذیل آیت ہے جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف اُن کی باہمی محبت اور رحم دلی کی تعریف ہے،

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ	محمد خدا کے رسول اور جو اُن کے
مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ	ساتھ ہیں، وہ کافروں پر سخت بھاری
رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ،	ہیں، اور آپس میں مہر و محبت رکھتے
(فتح - ۴)	ہیں،

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ "وہ کافروں پر سخت ہیں" اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدتِ ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار اُن سے مرعوب ہیں، اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار اُن پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے، اس لئے محاورہ کے مطابق اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّار کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی اُن پر غالب اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، ان سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں، جو سورۂ

مائدہ کی اس آیت کے ہیں،

اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ	فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری
عَلَی الْکَافِرِیْنَ (مائدہ۔۸)	ہیں کافروں پر،

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ ہے، مثلاً سورۂ ہود میں ہے،

یٰقَوْمِ اَرَھْطِیْ اَعَزُّ عَلَیْکُمْ	اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا
مِنَ اللّٰہِ، (ھود۔۸)	سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے،

دوسری آیت میں ہے،

عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ (توبہ)	تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے،

لسان العرب میں ہے،

وَرَجُلٌ شَدِیْدٌ قَوِیٌّ وَالْجَمْعُ	مرد شدید، یعنی قوی اور اسکی جمع
اَشِدَّاءُ (جلد ۴ ص ۲۱۸ مصر)	اَشِدَّاءُ ہے،

قرآن میں اَشَدُّ خَلْقًا، اَشَدُّ قُوَّۃً، اَشَدُّ تَثْبِیْتًا، اَشَدُّ مِنْھُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے، اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے، دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لئے گئے ہیں،

اُشْدُدْ بِہٖ اَزْرِیْ (طٰہٰ۔۲)	اس سے میری کمر کو مضبوط کر،
وَبَنَیْنَا فَوْقَکُمْ سَبْعًا شِدَادًا (نبا)	اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے،
وَشَدَدْنَا مُلْکَہٗ (ص۔۲)	اور ہم نے اُن کی سلطنت مضبوط کی،

نَشُدُّوا الوَثَاقَ (قتال - ۱) پھر مضبوط باندھو،

شَدِید کے مشترک معنی یہ ہیں، کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے، بلکہ اسکے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے، اور یہی صحابہ کرام کی صفت تھی، اُنھوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروا نہ کی، تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پر زور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھدیا، اُن کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی، اُن کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا پھر اسی کو دو نہ کہا، اور جس کی تصدیق کر چکے تھے پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود اُن سے دبنے لگے، اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب اُن پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (آل عمران و انفال) کہ میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھادونگا، وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا، وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب وحشر - ۱) اُن کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈالدیا،

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب بٹھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے،

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم — ان کے لئے تم سے جو طاقت ہو سکے
مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ — اور گھوڑوں کو باندھنا، وہ تم تیار
تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ (انفال) — رکھو کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو،

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہو کہ تمہارا سازوسامان اور

جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے، اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، فرمایا جو شخص گھوڑا خدا کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے، وہ اس کے لئے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لئے باندھتا ہے، اس کے لئے پردہ پوش ہے، اور جو نمایش کے لئے باندھتا ہے، وہ اس کے لئے عذاب[1] ہے، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے اسی لئے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور خدا کے لئے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیرووں کو نہیں روکا ہے،

خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں، اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں اور تمام جد وجہد، ان ہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں، اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے، تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں، اور یہ آگ بجھ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد،

شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بن جائے، اسلئے یہ نہ ممکن ہے، اور نہ مناسب ہے کہ اُس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے، بلکہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے، بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے، چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے، اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لئے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہو، صلح و جنگ، دوستی و دشمنی، رضامندی و ناراضی، اور محبت و عداوت، جو کچھ ہو، وہ خدا کے لئے ہو، اَلْحُبُّ فِی اللہِ وَالْبُغْضُ فِی اللہِ،

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے، یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے، وہ جب خیر سے محبت کریگا تو شر سے نفرت بھی کریگا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکوں

سے دوستی کرے گا، تو شریروں سے علٰحدہ بھی ہوگا، مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا، انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے، اور ایک ہی دل میں ایک شے کی، اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہوسکتی، جیسا کہ قرآن نے کہا،

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ (احزاب-۱)	خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے،

ع سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

"کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یا ایک سے دشمنی رکھےگا یا دوسرے سے دوستی، یا ایک کو مانے گا، اور دوسرے کو ناچیز جانیگا، تم خدا اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (متی ۶-۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوس[1] نے خدا اور آدمی، یعقوب[2] نے خدا اور دنیا، یوحنا[3] نے خدا اور دنیا کے بُرے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کریگا وہ دوسرے سے نہیں، یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے، اپنی ذات کے لئے نہیں بہیقی کی شعب الایمان میں ہے کہ

---

[1] گلیتون کے نام ۱-۱۰ [2] یعقوب ۴-۴،

[3] یوحنا ۲-۱۵،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ "ایمان کی کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے؟" عرض کی، خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے۔" فرمایا "یہ کہ باہمی میل جول خدا ہی میں ہو، محبت بھی خدا ہی میں ہو، اور ناراضی بھی ہو تو خدا ہی میں ہو۔" مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ "کون سی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے۔" کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپؐ نے فرمایا نیکیوں میں سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے، کہ خدا ہی کے لئے محبت اور خدا ہی کیلئے مخالفت ہو۔"[1]

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں

خدا کے لئے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا ناراضمندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو، بلکہ دراصل اسکے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو، اور اس کے سبب سے اس شخص سے علحدگی و بیزاری ہو جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں، قرآن پاک کی ایک آیت ہے،

حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ	خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا، اور
فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ	اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا
الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ	اور کفر اور بے حکمی، اور نافرمانی کو
(حجرات-۱)	تمہارے نزدیک مکروہ بنایا،

[1] مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ،

اس آیتِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا، اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نارضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے، یہ دور ہوجائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے، فرمایا،

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ	تو اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں، اور نماز پڑھیں
وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی	اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں
الدِّیْنِ، (توبہ ۲)	

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعۃً کراہت، محبت سے دشمنی دوستی سے اور نارضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں، نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابلِ نفرت اچھوت ہے، نہ ملیچھ ہے، نہ چنڈال ہے، نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے، اور نہ غیر قوم ہے، اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے، اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے، اور یوروپین غیر یوروپین کی تقسیم ہے، جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب ہو سکتا ہے، اور ایک معمولی حبشی و عجمی، مومن و موحد ہو کر بلال حبشیؓ، صہیبؓ رومی، اور سلمان فارسیؓ کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمرؓ، وہی سفیانؓ، وہی عکرمہؓ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بنکر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے، بیک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے

سرگروہ ہو گئے، اور مسلمان اُن کے فدائی بن گئے، اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے

اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا،

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ	(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے تو
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ	اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت
اِخْوَانًا،	پیدا کر دی، اور تم اس کے فضل و کرم
(آلِ عمران - ۱۱)	سے بھائی بھائی بن گئے،

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیان کاری پر ہے، توبہ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدل ہو جاتا ہے، مبشّر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے گنہگاروں کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى	اے میرے وہ بندو جنھوں نے گناہ
اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ	کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، خدا کی
اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ	رحمت سے مایوس نہ ہو، خدا سب گناہوں
جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ	کو معاف کر سکتا ہے، وہ بخشنے والا اور رحم
(زمر - ۶)	کھانے والا ہے،

آپ نے فرمایا التَّائِبُ مِنَ الذنب کمن لا ذنب لہٗ [1] "گناہ سے توبہ کرنے والا

[1] ابنِ ماجہ باب ذکر التوبہ،

ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو" یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گنہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی، اور اُن کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا، اور اُن کو رضائے الٰہی کی بشارت سُنائی، ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی، وہ اُس کی سزا بار بار بھگتتے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑ کر آئے تو صحابہؓ نے کہا: خدا اس پر لعنت کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سُنے تو فرمایا، تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو، خدا کی قسم مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے۔[1]" اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گنہگار پر بد دعا نہ کی جائے،[2] ماعز بن مالکؓ ایک صاحب تھے، جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے، واقعہ کے بعد اُن کا روحانی احساس بیدار ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے، تاہم انھوں نے خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی، اور سزا کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ اُن کی درخواست رد کی، لوگوں سے تحقیق کی کہ یہ پاگل تو نہیں، سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے اس کے بعد اُن پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، وہ میدان میں کھڑے کئے گئے اور اُن پر لوگوں نے ہر طرف سے سنگ باری کی، اور اسی حال میں انھوں نے جان دی، صحابہ میں بعض ایسے تھے، جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعزؓ کو بُرا کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو فرمایا" ماعز کے لئے خدا سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اُس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔[3]"

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود [2] فتح الباری شرح حدیث مذکور [3] یہ دونوں واقعے صحیح مسلم کتاب الحدود میں ہیں۔

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آکر خود اپنے جرم کا اقرار کیا، اور سزا کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا، وہ اس کے بعد آئی، فرمایا، بچہ کی پرورش کرو، جب بچہ دودھ چھوڑ دے، تب آنا، وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہوکر آئی، اور اب بھی اس کے احساسِ گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا، آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس کو سنگسار کیا گیا، تو اس کے خون کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالد بن ولید کے منھ پر پڑیں، انھوں نے عورت کو برا کہا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنا تو فرمایا کہ خالد چپ ہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس نے وہ توبہ کی ہے، کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا،"[1]

ترکِ ہوی | آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض و غایت پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ہے، تو وہ نیک اور اچھا ہے، اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لئے ہے، تو وہ نیکی نہیں، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ھویٰ ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ہوی سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لئے وہ کام کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دینِ حق کے پیرو نہیں، اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے، یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے، اور ان کے

[1] یہ دونوں واقعے صحیح مسلم کتاب الحدود میں ہیں،

سینوں کے اندر اغراضِ نفسانی اور خواہشِ ہویٰ کے بُت چھپے ہیں، قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا،

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ	اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے
ھَوٰہُ ، (جاثیہ - ۲)	اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے،

اسی لئے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لئے شریعتِ محمدیؐ نے ترک ہویٰ کا طریقہ پیش کیا، بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے، لیکن محمد رسول اللہؐ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بُری خواہش سے پاک ہو جائے، کیونکہ اگر وہ ہر اچھی اور بُری خواہش سے پاک ہو جائے، تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی، اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا، اسی لئے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں، بلکہ ہر بُری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے، کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے، وحیِ محمدیؐ نے فرمایا

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ	اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے
ھَوٰہُ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنَ	خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی
اللّٰہِ ، (قصص - ۵)	خواہش کی پیروی کی،

پھر فرمایا :-

وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ	اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر،

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، (ص - ۲)　　　　وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی،

عدل وراستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے ، وہ اسی ہوئی کے زہرِ قاتل سے مرجاتی ہے،

فرمایا:-

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ، (نسآء-۲) عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو،

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، جس نے اپنے آپ کو اس سے

بچالیا ، وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا ، اور اُس کے امن کی جگہ جنت ہے ، فرمایا ،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ　　　　اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے

نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى　　　　کھڑے ہونے سے ڈرا ، اور نفس کو بری

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى　　　　خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہے،

(نازعات-۲)　　　　اُس کے امن سے رہنے کی جگہ ،

اخلاق اور محبتِ الٰہی دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے، خاص کر وہ محبت اور

پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو، یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے

انسان کو حاصل ہو سکتی ہے، ان میں دیگر ضروریاتِ دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسنِ

اخلاق ہے ، عقائد کے باب میں محبتِ الٰہی" کے زیرِ عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے

مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو توراۃ اور انجیل میں بھی ہے مگر

اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے ، اور یہ دولت انسان کو کیونکر

مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے ، مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں

داعیِ خیر کی پیروی محبتِ الٰہی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا،

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	کہدو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو
فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ،	میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت
(آل عمران - ۴)	کرے گا،

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق، اور اعمال کی پیروی محبتِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے، بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں، اور اس دولت سے محروم کون ہیں، اس سے اسلامی اصولِ اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں حُسنِ خلق بھی ہیں، اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے، بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے،

پہلی صف میں حسبِ ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں،

وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ،	(آل عمران)	اور خدا ایمان والوں کا دوست ہے،
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ،	(بقرہ، مائدہ) ۲۴	خدا اچھے کام کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ،	(بقرہ - ۲۸)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ	(آل عمران)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ	(مائدہ، حجرات)	خدا انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ	(توبہ - ۱)	خدا تقوی والوں کو پیار کرتا ہے،

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۔ (آل عمران ۱۵) اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ ۔ (توبہ ۱۳) اور خدا پاک صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ

فِیْ سَبِیْلِہٖ ۔ (صف ۱) میں لڑتے ہیں،

ان آیاتِ پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں، کہ محبتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں،

ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد،

حسب ذیل صفتیں وہ ہیں، جو محبتِ الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں،

فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ (آل عمران) تو خدا کافروں کو پیار نہیں کرتا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ، خدا حد سے بڑھنے والوں کو پیار

(بقرہ ۲۴، مائدہ ۲) نہیں کرتا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو اترانے

مُخْتَالًا فَخُوْرًا (نساء ۶) والا اور شیخی مارنے والا ہو،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خدا اس کو پیار نہیں کرتا، جو خیانت کار

خَوَّانًا اَثِیْمًا ، (نساء ۱۶) گنہگار ہو،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ، (انفال) خدا خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ خدا کسی خیانت کار ناشکری کو پیار نہیں

کَفُوْرٍ ۔ (حج ۵) کرتا،

اِنَّ اللہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ،	(قصص)	خدا اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا،
اِنَّ اللہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ	(قصص)	خدا فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا،
اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ	(انعام ۱۷)	خدا فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا،
اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ	(نحل ۳)	خدا مغروروں کو پیار نہیں کرتا،
اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ	(شوریٰ)	خدا ظالموں کو پیار نہیں کرتا،
وَاللہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ	(بقرہ)	خدا ناشکر گنہگاروں کو پیار نہیں کرتا،

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانا، فخر و غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیاں ہیں، جو انسان کو محبتِ الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں،

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبتِ الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے،

تعلیمِ اخلاق

کے

طریقے اور اسلوب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لئے ہوئی یعنی لوگوں کو سکھانا، اور بتانا، اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی اُن کو اچھی باتوں کا پابند اور بُری باتوں سے روک کر، آراستہ و پیراستہ بنانا، اسی لئے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (بقرہ - ۱۵)

وہ (رسول) اُن کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا، اور پاک صاف کرکے نکھارتا ہے،

اور اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ

وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا، (ابن ماجہ باب فضل العلما) اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں،

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلّمِ ربانیؐ نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا،

ایک کامیاب معلم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی، اور

نرمی دونوں ہوں، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے، اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو، جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کرسکتا ہے، اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کرسکتا ہے،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع ومحل کو خوب پہچانتے تھے، اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے، تو اُس کو سزا دیتے تھے،[1] قریش کی ایک بیوی چوری کے جرم میں پکڑی گئیں بعض مسلمانوں نے اُن کی سفارش کرنی چاہی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب اُن میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو اُن کو سزا دیتی تھیں، اور جب بڑے لوگ کرتے تھے، تو اُن کے حکام ٹال جاتے تھے،[2]

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا صحابہ یہ دیکھکر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے، آپ نے روکا، اور فرمایا کہ تم سختی کے لئے

---

[1] صحیح بخاری باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یسّروا ولا تعسّروا، [2] صحیح بخاری کتاب الحدود،

نہیں بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں، یہ نجاست کے لئے موزوں نہیں، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لئے ہیں، پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو[۱]،

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالتِ روزہ ایک غلطی ہو گئی، اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو، انہوں نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا تو وہ اکیلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یا رسول اللہ! میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا، دو مہینے لگاتار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا، فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو، عرض کی کہ ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے منتظم کے پاس جاؤ، اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، اور جو بچے وہ تم اور تمہارے گھر والے کھائیں، وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا، اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے، اور حضور نے کتنی نرمی کی[۲]،

یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدودِ الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا، وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی، لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل و رذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف و محبت سے فرما دیتے تھے ع

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول،

[۲] ابو داؤد باب فی الظہار

قاہری یا دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل ورذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکم خداوندی بتا کر کہیں اچھی اچھی موثر تشبیہوں کے ذریعہ کہیں اس کے اچھے یا بُرے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے،

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی، اور کہا

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ	بیشک اللہ عدل اور احسان کرنے اور
الْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي	رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی
الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ	کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ	سے منع کرتا ہے تمھیں وہ نصیحت فرماتا
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (نحل ۱۳)	ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو،

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو، اور اُن سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادرِ مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں، اس تعمیل میں بندوں کے چون وچرا کی گنجائش نہیں،

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ، اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابلِ نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع

فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے، مثلاً خدا کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہو، جس کی تصویریوں کھینچی گئی کہ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ (بقرہ۔ ۳۶) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے، اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربّانی انعامات کا باعث ہوتا ہے،

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے، اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے، قرآن نے اس کو یوں ادا کیا،

کَمَثَلِ صَفْوَانٍ (بقرہ ۵-۳۶)

اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہ گئی، اور چٹان دھل کر صاف ہوگئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا"

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ "جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں" (نساء۔۱) پیٹھ پیچھے مسلمان کی بُرائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی گئی "کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے" (حجرات۔۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی بُرائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے "جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہو" اس سے زیادہ مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی اور کیا ہوسکتی ہے،

قبیلۂ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا، اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود

اگر عدالتِ نبوی میں، اپنے گناہ کا اقرار کیا، اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضورؐ نے تحقیقات کے بعد اُس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا، جب وہ سنگسار ہوچکا، تو آپ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ "اُس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن اُس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا، اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا" حضورؐ یہ سُن کر خاموش رہے، تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی، آپ نے پکارا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم یہ ہیں یا رسول اللہ! فرمایا تم اُترو، اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ، انھوں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائیگا فرمایا کہ "تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھنونی بات ہے"[1]

غیبت کی بُرائی کو ذہن نشین کرنے کیلئے اس سے زیادہ موثر طرز کوئی ہوسکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور بُرے کاموں کے بُرے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار، اور بُرے کام کے ترک کا جذبہ اُبھرے، اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے، مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا، تو اُس کے بُرے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا، "مسلمانو! شراب جوا، اور پانسے کی تیر نا پاک ہیں، شیطان کے کام شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے" (مائدہ ۱۲) شراب اور جوے کے بُرے نتیجے یہ ہیں کہ اُن کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے، اور

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الحدود،

انسان اُن میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے، نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے،

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائلِ اخلاق کو الوہیت ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں، اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے، مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا،

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ	اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کر دیا اس کو چھپاؤ
اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ	یا کسی بُرائی کو معاف کر دو تو اللہ ہی معاف
اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا (نساء ۲۱)	کرنے والا قدرت والا،

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، تخلقوا باخلاق اللہ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے، اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے[1]:

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے فرمایا، نہیں،

اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ (صحیح مسلم و ترمذی)	اللہ جمال والا ہے، وہ جمال کو پسند کرتا ہے

[1] تفسیر بحرِ محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ج ثالث ص ۳۰۵،

اس لئے بندوں کو بھی چاہیئے کہ اپنے طور وطریق ولباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں،

مسلمانوں میں عزم واستقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اسطرح کہا

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ — تمہارے لئے اللہ کے رسول میں پیروی

اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۳) — کا اچھا نمونہ ہے،

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ

کے نمونہ سے دی گئی،

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں

فِيْٓ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (ممتحنہ ۱) — میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے،

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کرکے

اُس کی بڑائی ظاہر کی ہے، اور ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے،

فضول خرچی کی بُری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا، تو اسکی بُرائی کو یوں ذہن نشین کرایا،

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ — بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے

الشَّيٰطِيْنِ، (بنی اسرائیل ۳) — بھائی ہیں،

اب کون ہو جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کریگا،

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی

خوبی اور رذائل کی بُرائی، جاہل عربوں کے ذہن نشین کردی، جابر بن سُلیمؓ ایک صحابی دربارِ

نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں، کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک

شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجالاتے ہیں، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا، اے اللہ کے رسول آپ پر سلام (علیک السلام) آپ چپ رہے، پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے السلام علیک کہو میں نے کہا کہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں، ؟ فرمایا ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو، تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے، اور جس سے خشک سالی میں مانگتے ہو، تو وہ اگا دیتا ہے، اور جس سے تم جب کسی لق و دق بے نشان بنجر میں ہو، تمھاری سواری وہاں گم ہو جائے، تم دعا کرتے ہو، تو وہ اس کو تمھارے پاس لوٹا دیتا ہے، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے ارشاد ہوا کسی کو برا نہ کہو، جابر کہتے ہیں کہ آپ کے اس فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہیں کہا پھر آپ نے یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کئے جاؤ اور تم کو چاہئے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمھارا چہرہ کھلا ہوا ہو یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے[1]، اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا، اور اگر تمھیں کوئی گالی دے، اور تم میں جو برائی ہو وہ جانتا ہو، تم کو اس کی عار دلائے تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا۔[2]

[1] عرب امراء فخر و غرور کے لئے ایسا کرتے تھے جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں شاہانہ غرور کی نشانی تھی [2] سنن ابی داؤد، باب فی اسبال الازار،

اس طریقۂ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے کہ آپ نے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور وہیں سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اُس کی زندگی میں خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی، ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھکر نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں، حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی، اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو، اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے نصیحت فرمائیے ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر، اُس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا، آپ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر[1]۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ہر شخص کا علاج اُس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہو جاتی ہوں گی، اس لئے آپ نے اُس کے لئے یہ علاج تجویز فرمایا جس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی لیکن آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو،

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے، فرمایا خدا پر ایمان رکھنا، اور اس کی راہ میں جہاد کرنا، پھر پوچھا کس غلام یا باندی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب الحذر من الغضب و ترمذی باب ما جاء فی کثرۃ الغضب،

کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے، فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اُس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو، پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کرسکوں؟ فرمایا تو کسی بیکس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کردو، پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے، فرمایا کہ شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کرسکتے ہو۔[1] (ادب المفرد بخاری ص ۴۵ مصر)

کبھی آپ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے تو آپ اُن کی اس توجہ کو مفید پاکر وہ جواب دیتے جو اُن کے دل میں اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہ رضؓ سے آپ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی، ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا لیکن اُس نے کسی کو گالی دی ہوگی کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھالیا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا کسی کو مارا ہوگا تو اُس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ اُن لوگوں کو دیدیا جائے گا، اگر اُس کی نیکیاں ختم ہوگئیں، اور اُس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا، تو اُن کی برائیاں اُس کے نام لکھدی جائیں گی پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[2]

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے،

اسی طرح ایک دفعہ آپ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو، لوگوں نے کہا جس کو لوگ کشتی میں بچھاڑ نہ سکیں، فرمایا نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو

[2] صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم،

غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے،[1]

اُس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم کس کو کہتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کی، جس کے بچہ نہ ہو، فرمایا وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی[2] (احادیث میں ہے کہ جو بچے کم سنی میں مرجائیں، اور اُن کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں اُن کی شفاعت کریں گے) اس طریقۂ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں، بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی،

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور بُرا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور بُرے لوگوں کے نام لیں گے) آپ نے دوسری بار بھی سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا ہاں، یا رسول اللہ! فرمائیے، ارشاد ہوا تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس سے اچھائی کی امید کی جائے، اور جس کی بُرائی سے لوگ امن میں ہوں، اور تم میں سب سے بُرا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے، اور جس کی بُرائی سے کوئی امن میں نہ ہو"[3]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر اُن پر عمل کرتا ہے، اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ اُن پر عمل کریں"، ابوہریرہؓ نے کہا میں اے اللہ کے رسول! ابوہریرہؓ

---

١ صحیح مسلم کتاب البر باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب ٢ صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب
٣ ترمذی اواخر کتاب الفتن صحیح،

کہتے ہیں کہ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں، گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے، اُس پر راضی رہو تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن ہو گے لوگوں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو، تو مسلمان بن جاؤ گے، اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے[۱] (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے اپنے دو جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں[۲] کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لئے اٹھے ہوں گے، ان فقروں کی بلاغت پر غور کرو، دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے، جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے، اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں، جو ہر قسم کی بیحیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں، ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے،

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپ کے غلام ثوبانؓ نے اٹھ کر کہا میں اے اللہ کے رسول! فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو، چنانچہ انھوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا،[۳]

سب کو معلوم ہے کہ ارضِ حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے، حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں خطبہ دینے کے لئے

[۱] جامع ترمذی ابواب الزہد [۲] صحیح بخاری باب حفظ اللسان [۳] مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۵،

کھڑے ہوے تو دریافت فرمایا۔ لوگو! آج کون دن ہے ؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں، عرض کی اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں، سب نے کہا جی ہاں، پھر پوچھا یہ کون مہینہ ہے، پھر سب چپ رہے سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے۔ فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں سب نے کہا جی ہاں، پھر فرمایا یہ کونسا مقام ہے، پھر سب خاموش رہے کہ آپ کوئی اور نام بتائیں گے۔ فرمایا کہ یہ بلد الحرام نہیں ہے، سب نے کہا جی ہاں، ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا مسلمانوں کا خون مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لئے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں۔[۱]

کبھی خاص خاص صاحبوں کو اُن کی مناسبت طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے حضرت ابوذر غفاریؓ گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے، بڑے ہی زاہد و عابد تھے، اُن کے ذوقِ طبع کو دیکھ کر اُن سے فرمایا، اے ابوذر! جہاں رہو خدا سے ڈرتے رہو، بُرائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اُس کو مٹا ڈالو گے، اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو۔[۲]

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا، تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے، اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ

---

[۱] صحیح بخاری الخطبۃ فی ایام منیٰ [۲] ترمذی باب ماجاء فی معاشرۃ الناس۔

دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا بھی صدقہ ہے؀۱"

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی، اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی،

کبھی آپ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں، وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی، (سورۂ ممتحنہ ۲)

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ آپ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ہم ہر حالت میں رسول کی پیروی کریں گے، اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل وانصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے، اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے؀۲،

یہی عبادہؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ نے نقیب بنایا، تو ان میں سے ایک میں بھی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی، ہم خدا کا کسی کو شریک بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے، الخ

؀۱ ترمذی فی صنائع المعروف ؀۲ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۳۱۸،

نافرمانی نہ کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی، اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔[1] اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سوال کرتے تھے، سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں، خود ہی جواب دیدیتے تھے، دریافت فرمایا کہ افترا کس کو کہتے ہیں، پھر خود ہی فرمایا "وہ چغلی ہے"، لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا۔[2] ایک بار ارشاد ہوا "تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں، لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے۔" فرمایا "تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اُس کو ناپسند ہو"، کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ بُرائی واقعی موجود ہو تو فرمایا اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے ورنہ پھر وہ بہتان ہے۔[3] ایک موقع پر ارشاد ہوا میں تمھیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی کہ ہاں یا رسول اللہ! فرمایا ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں، یا جو متواضع ہو (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ خدا کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو خدا اُس کی قسم پوری کر دے، پھر فرمایا کیا میں تمھیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! فرمایا ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور۔[4]

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اُس کو بار بار دہراتے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۱۵، کتاب الدیات [2] صحیح مسلم باب تحریم النمیمۃ [3] صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ [4] صحیح مسلم باب جہنم۔

حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اُس کی اہمیت کا پورا اندازہ کرلیتے، اور مشتاق ہوکر پوچھتے کہ یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے؟ اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر انکی رگ رگ میں سرایت کرجاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا، "خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا" خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا"[۱] صحابہ نے مشتاقانہ پوچھا، کون یا رسول اللہ! فرمایا "جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہو"، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے" صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کس کے ساتھ؟ فرمایا "اللہ کیساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ، اور عام مسلمانوں کے ساتھ"[۲]

۱؎ مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین، ۲؎ ایضاً بحوالہ صحیح مسلم، ۱۲

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصولِ اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے اُن اخلاقی تعلیمات کا استقصار کیا جائے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، حقوق، فضائل و رذائل، اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں، اور یہ اُن کے حقوق ہیں جنھیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے، یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں،

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے، اس کا نام فضائلِ اخلاق اور اسکے مقابل کا نام رذائل اخلاق ہے، مثلاً سچ بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے،

تیسری قسم، کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقے سے بجالانا ہے، اس کو آداب کہتے ہیں، مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور طریق،

ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے،

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی ہے لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کردی جائے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا، (بقرہ۔ ۳) خدا نے تمہارے (کام کے) لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں،

اس لئے انسان کو دنیا کی ہر اُس چیز سے جس سے اُس کے نفع کا تعلق ہے ایک گونہ لگاؤ ہے اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے، اس سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے، اور ان موقعوں پر اُس کو صرف کیا جائے جن میں خدا نے اُس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے، اور اُس کو ہر پہلو سے بچایا جائے جس سے اُس کی نفع رسانی کو نقصان پہونچے، اسی ذمہ داری کا نام حق ہے جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے ارشاد ہوا،

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ، (ذاریات ۔ ۱) اور اُن کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو

وَالَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ	اور اُن کے مالوں میں سائل کا اور
مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ،	اس کا مقررہ حق ہے، جس پر مالی
(معارج - ۱)	افتاد پڑی ہو،
وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ وَ	اور قرابت والے کو اس کا حق دے
الۡمِسۡكِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ (بنی اسرائیل ۳)	اور مسکین کو اور مسافر کو،
فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِیۡنَ	تو قرابت والے کو اس کا حق دے
وَابۡنَ السَّبِیۡلِ ؕ (روم - ۴)	اور مسکین کو اور مسافر کو،

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے تو اُس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہو، اُن کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے، یہ اُن کا حق ہے، اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، پھر مسافر، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے،

وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ یَوۡمَ حَصَادِهٖ وَ	اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے
لَا تُسۡرِفُوۡا ، (انعام - ۱۷)	دن ادا کرو، اور فضول خرچی نہ کرو،

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا، اور اُس نے اس میں کچھ بویا، اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے، اور اس میں اُن کو بھی کچھ دے جن کو یہ نعمت نہیں ملی، اور اس نعمت کو بے موقع خرچ کر کے ضائع نہ کرے، کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے، اور اس

کی نفع رسانی کے ضروری موقع ومحل کو نقصان پہنچانا ہے،

حدیث میں آتا ہے،

إنَّ لزوجک علیک حقًّا و	تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے
لزورک علیک حقًّا (بخاری صوم)	ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے،
ولاھلک علیک حقًّا (〃 〃)	تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اُس کو کھانا کھلائے، کپڑے پہنائے اور اُس کے چہرے پر تھپڑ نہ مارے" (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں، بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے، اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

فان لنفسک علیک حقًّا (بخاری صوم)	بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے،
فان لجسدک علیک حقًّا و	تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری
لعینک علیک حقًّا (〃 〃)	آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے

حقوق کی وسعت جب انسان کا تعلق کائناتِ ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ اُن کو بے موقع ضرف نہ کیا جائے نباتات سے بھی کہ اُن کو نشو و نما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ

اُن کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے، اور اُن کے آرام و آسایش کا خیال کیا جائے، اور انسانوں سے بھی کہ اُن کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور اُن کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس سے مناسب طور سے وہ کام لے،

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیطِ اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیحِ مقصد کے لئے مفید ہے،

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں، اُن سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ اُن کے قدرتی نشو و نما، پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اُس کے مناسب اسباب فراہم کرے، اور اُس کے مناسب غذا، سیرابی، اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا، (بقرہ ۔ ۳)	زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لئے پیدا کیا،

کہ صریح نتیجے ہیں کہ جب انسان کے لئے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں تو انسان کا فرض ہے کہ

اُن سے وہی کام لے جن کے لئے وہ بنائی گئیں، اور اس لئے تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں، اُن کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا اُن پر ضروری قرار دیا گیا،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ "ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جارہا تھا کہ دفعۃً اُس نے منھ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، میں تو کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں[1]" اور اسی لئے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا، فرمایا گیا کہ "جو مسلمان درخت لگاتا ہے، تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے[2]"۔ اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے[3]،

ایک اور تمثیلی حکایت میں آپ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اسلئے بخشا گیا کہ اُس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی، اور ایک اور شخص پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اُس نے ایک بلی کو باندھا، اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا، یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مرگئی، ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے بازپرس ہوئی[4]،

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لئے بھی کئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی

---

[1] صحیح بخاری باب الحرث والمزارعہ جلد اول ص ۳۱۲ [2] صحیح بخاری ومسلم باب مذکور [3] فتح الباری شرح صحیح بخاری شرح باب مذکور، جلد خامس ص ،، ، مصر [4] یہ دونوں واقعے صحیح بخاری میں ہیں،

تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے، وہ صرف انسانوں تک نہیں، بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب | مگران تمام حقوق کی ادائگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جس کی تفصیل ذیل میں ہے،

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو تورات وانجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف "محبت کرنا" کہدینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیے، جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل وتکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپ نے فرمایا کہ "ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لئے رکھتے ہو"[1] اس سے معلوم ہوا کہ جسم وجان اور مال وملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم وجان اور مال وملکیت کے لئے چاہتا اور پسند کرتا ہے، وہی دوسروں کے لئے چاہنا اور پسند کرنا تورات وانجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہے لیکن اسلام میں یہ سرعنوان تشریح کا محتاج ہے، اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے، اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی، اور دوری ونزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کردیا ہے مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد ایک

---

[1] صحیحین کتاب الایمان،

اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی، اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے، کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔[1]

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خطِ فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے، مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان کے، اور پھر انسانوں میں اہلِ ملک، قوم قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی، اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے، اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے، اور اُن کے برترانہ حقِ اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے،

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ

---

[1] سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصبیۃ،

تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے، مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کرسکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہی، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے، پھر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلہ بھی ہے، اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہیے، یہی وہ موقع ہے، جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں، اور اسی ترتیب سے اُن کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے، یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے، یاں یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارا کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو، اگر ایسا وہ نہ کرسکے تو اخلاقاً اُس کو معذور سمجھا جائیگا، شریعتِ محمدی نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ	اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور
بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ	رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں
الْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى	کے ساتھ اور رشتہ دار پڑوسی
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ	کے ساتھ، اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ
بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَ	اور ساتھی کے ساتھ، اور مسافر
مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (نساء-۶)	کے ساتھ، اور لونڈی غلام کے ساتھ

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ	اے پیغمبر اُن سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ	وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ	یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لئے
السَّبِيْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ	اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو، اللہ
خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (بقرہ ۲۶)	اس سے آگاہ ہے،
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ	اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین
الْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	کا، اور مسافر کا، اور فضول خرچی
وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (بنی اسرائیل ۳)	نہ کر،

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے، اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے، مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں،

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزّت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے بلکہ تینوں میں اُن کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے، اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اُن کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے، توراۃ میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے،

تو اپنے ماں باپ کو عزّت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے، دراز ہو، (خروج ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے،

"تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے۔" (احبار ۱۹-۳)

انتہا یہ ہے کہ توراۃ نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

"اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے، مار ڈالا جائے گا، اُس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے، اس کا خون اسی پر ہے" (احبار ۲۰-۹)

اور وہ جو اپنی ماں باپ پر لعنت کرے، مار ڈالا جائے، (خروج ۲۱-۱۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا، اور اس بات پر زور دیا، کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے، بلکہ اُن کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا،

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر، اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے، پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھکو دینا واجب تھا، سو خدا کی نذر ہوا، اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے، تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا، (متی ۱۵-۴)[1]

نبوتِ محمدی جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے، اُس نے توراۃ وانجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور اُن سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی، بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی، اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا،

۱۔ اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی، اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضعِ حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی، اس کی سب سے پہلے دلدہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے،

---

[1] اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراۃ کے الفاظ کا بعینہٖ اعادہ ہے مثلاً متی ۱۹ - ۱۹ - مرقس ۱۰، ۷، ۱۰ - ۱۹ - لوقا ۲۰،

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے
حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ	واسطے تاکید کی، اس کی ماں نے اس
وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ ۝	کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا
(لقمان - ۲)	اور دو برس تک دودھ پلایا،
وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ
اِحْسَانًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا	اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس
وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَ	کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ
فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ	پیٹ میں رکھا، اور تکلیف کے ساتھ
(احقاف - ۲)	جنا، پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر
	چھڑانا تیس مہینے میں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی. ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! اس نے عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! تین دفعہ آپ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ[1]! ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا، اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا، اور فرمایا کہ تمھارے خدا نے ماں کی نافرمانی تم پر

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب،

حرام کی ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ گناہ کیا ہے، کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں، دریافت کیا خالہ ہے؟ گذارش کی، ہے۔ فرمایا تو اس کے ساتھ نیکی کر۔ یہی اسکی توبہ بتائی، ایک اور صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ فرمایا کیا تمھاری ماں ہے؟ جواب اثبات میں دیا، فرمایا تو اسی سے چپٹے رہو کہ جنّت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں جنسِ لطیف ہی کی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے، اور یہ برتری بالکل فطری ہے، انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے، اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں، وہ خالق اکبر کی علتِ فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں لیکن باپ کی مادی علیت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں، مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اُس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا، اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہکر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا، پھر اس کے جننے کی ناقابلِ برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا، پھر اس نو پیدا مضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا، اور اُس کی پرورش اور غور و پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی، ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی

۱؎ صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب ۲؎ جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ ۳؎ ترغیب ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۴۴ بحوالہ نسائی

اور کا محتاج ہے؟ اس لئے شریعتِ محمدی نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے، وہ اُسکی سزاوار ہے،

۲- ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے، وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشو و نما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں، اس لئے جب بچہ اُن کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہونچے، تو اُس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے مذاہب کی طرح اُن کی "عزت" کرنے اور اُن سے "ڈرتے رہنے" کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ اُن کی خدمت، اُن کی اطاعت، اُن کی امداد، اور اُن کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ اُن کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو اُن کے سامنے ادب سے جھکے رہو، اُن کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے، بلکہ اُن ہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے، قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے، اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیقِ انسانی کی علتِ فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا:-

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۶) ابن ماجہ ونسائی وحاکم،

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد
اِسْرَائِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ	لیا کہ تم نہ پوجو گے، مگر اللہ کو، اور
وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (بقرہ ۱۰)	ماں کے ساتھ نیکی کرو،

یہ آیتِ پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے، جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں، بلکہ نیکی کرنے کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے، اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت اور عزت کا مفہوم اُس کے اندر پیدا ہے،

اسی سورہ میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے،

قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ	فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ
فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (الآیہ)	ماں باپ، اور رشتہ داروں
(بقرہ - ۲۶)	(وغیرہ) کے لئے،

سورہ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکُوْا	اور اللہ کو پوجو، اور اس کے ساتھ
بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا	کسی کو شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ
(نساء - ۶)	کے ساتھ بھلائی کرو،

کفار کو جنھوں نے اپنے وہم و خیال اور رسم و رواج سے حلال و حرام کی ہزاروں

رسمی وخیالی باتیں پیدا کر لی تھیں، اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں، خدا کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا،

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ	کہہ (اے پیغمبر!) آؤ میں تمھیں پڑھکر
عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا	سناؤں کہ تمھارے پروردگار نے تم پر
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج	کیا حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی
(انعام - ۱۹)	کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے
	ساتھ نیکی کرنا۔

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دیجاتی ہے کہ اُن کے سامنے اُف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، اُن کے حق میں دعائے خیر کرو، اور بڑھاپے میں اُن کی خدمت کرو، فرمایا:-

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا	اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے
اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	کہ تم اُس کے سوا کسی کو نہ پوجو،
اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ	ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا،
اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا	اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمھارے
تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا	سامنے بڑھاپے کو پہونچ جائیں تو
وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝	اُن کو اُف بھی نہ کہو اور نہ اُن پر خفا ہو،

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (بنی اسرائیل ۔۳)

ان سے ادب سے بولو، اور اُن کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکا دو اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انھوں نے

بچپن میں مجھے پالا۔

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے،

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بُری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی، اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی اُن کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں، بجز اس کے کہ اگر وہ اس شرک کی دعوت دیں۔ تو اُن کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے، ارشاد ہوا،

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ط وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، فَلَا تُطِعْهُمَا ط اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (عنکبوت۔۱)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو اُن کا کہنا مانیو تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کردوں گا،

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں

تو صرف اُن کی اُس دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن اُن کی دنیاوی خدمت اور حسنِ سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے. فرمایا،

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ
حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى
وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ
اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ط
اِلَيَّ الْمَصِيْرُ، وَاِنْ جَاهَدَاكَ
عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ
بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ
صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا
(لقمان-۲)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا، کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا، اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا، کہ وہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھکو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اُس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو اُن کا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں اُن کے ساتھ بھلائی سے گزران کر

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسانمندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے، اور اس شرک پرستی، شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں اُن کی بات اولاد نہ مانیں، مگر دوسری دنیاوی باتوں میں ان کا ادب اُن کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے،

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا، مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً اُن کی مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لاکر حسنِ خاتمہ پر مرے'

رَبَّنَا اغْفِرْ لِی وَلِوَالِدَیَّ — اے میرے پروردگار مجھے اور میرے
(ابراھیم - ٦) — ماں باپ کو بخشدے،

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی :-

رَبِّ اغْفِرْ لِی وَلِوَالِدَیَّ، — میرے پروردگار مجھے اور میرے
(نوح - ۲) — ماں باپ کو بخشدے،

اس لئے والدین کے حسنِ خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیاء علیہم السّلام کی پیروی ہے
آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں، اُن کی خدمت بجالاتے ہیں، اور اُن کے لئے خدا سے دعاء خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں اُن کے سارے گناہ معاف کر دیتا، اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت اُن کو عطا فرماتا ہے،

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ — اور ہم نے انسان کو تاکید کرکے کہدیا
اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ — کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا،
کُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ کُرْهًا — اس کی ماں نے اس کو تکلیف کرکے
وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ — پیٹ میں اٹھایا، اور تکلیف کرکے
شَهْرًا حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ — جنی، اور تیس مہینوں تک اُس کو

وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً، قَالَ
رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ
وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ
صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ
فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ
وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ
مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ
سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ
وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا
يُوْعَدُوْنَ ۝

(احقاف-۲)

پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا،
یہاں تک کہ وہ بچّہ سے بڑھ کر جوان
ہوا، اور چالیس برس کا ہوا، اُس نے
کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق دے
کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں
جو تونے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر
کیا، اور اس کی کہ میں وہ کام کروں
جس کو تو پسند کرے، اور میری اولاد
نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر
آیا، اور میں تیرے فرمانبرداروں میں
ہوں یہی وہ ہیں جن کے اچھے کام
ہم قبول اور اُن کے بُرے کاموں
سے ہم درگذر کرتے ہیں، یہ جنت والوں
میں ہوں گے، یہ سچّائی کا وہ عہد ہے
جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت و اطاعت و رضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دُھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی منشاے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے کبھی

فرمایا ہے کہ "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے"[1]، کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے"، کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! میرے حُسنِ معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، گذارش کی پھر کون، چوتھی بار فرمایا، تیرا باپ، اور اس کے بعد جو اُس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے، ایک دفعہ حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) مجلسِ قدس میں تشریف فرما تھے، جان نثار حاضر تھے، فرمایا، "وہ خوار ہوا وہ خوار ہوا وہ خوار ہوا" صحابہؓ نے پوچھا کون یا رسول اللہ! ارشاد ہوا وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا اُن میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، اور پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت نہ حاصل کر لی، ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا، عرض کی، پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، دریافت کیا پھر کون، فرمایا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا، (جہاد)

ایک دفعہ آپ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت موثر حکایت میں بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے کہ اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسا گری کہ اس سے اُس غار کا منہ بند ہو گیا، (اب اُن کی بیکسی و بیچارگی اور اضطراب و بے قراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، اُن کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی)

[1] مشکوۃ المصابیح بحوالہ احمد و نسائی و بیہقی، کتاب الآداب فی البر والصلہ۔

اس وقت انھوں نے پورے خضوع وخشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک نے کہا بارِ الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا، اور انہی پر اُن کی روزی کا سہارا تھا، میں شام کو جب بکریاں لیکر گھر آتا تھا، تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا، جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے میں دودھ لے کر اُن کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ اُن کی راحت میں خلل آجاتا، اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت اُن کی آنکھیں کھلیں، اور دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے، مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لئے رات بھر سرہانے کھڑا رہا، اور وہ آرام کرتے رہے خداوندا اگر تجھے معلوم ہو کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹادے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خودبخود جنبش ہوئی اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی دو مسافروں کی باری آئی اور انھوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی، اور غار کا منہ کھل گیا،

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے، وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گذاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، اُن کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں، کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھکر جانا ہوتا ہے، اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے، اس لئے والدین کی اجازت کے بغیر اُن کو اپنے جسم وجان کے کھونے کا حق نہیں جسکو ان کی خدمت گذاری

کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا اسی لئے ابھی اوپر گذر چکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گذاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمتِ اقدس میں آکر شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی، دریافت فرمایا کہ تمھارے ماں باپ بھی ہیں؟ عرض کی جی ہاں، ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو،

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے، احادیث میں بھی اس کا وہی درجہ رکھا گیا ہے، صحابہؓ سے فرمایا کہ "تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے" ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں، انھوں نے عرض کی ضرور یا رسول اللہ! فرمایا خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر برابر ہو گئے، اور فرمانے لگے، اور جھوٹی گواہی، اور ہاں جھوٹی گواہی[1]"

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق بعض ایسے احکام تھے جو بیحد سخت تھے، وحیِ محمدیؐ نے بعض حیثیتوں سے اُن میں تخفیف کر دی ہے، اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ جو کوئی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اُخروی سزا کا موجب قرار دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں، اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تازندگی مہلت

[1] یہ تمام واقعات و اقوال عام کتبِ حدیث میں مذکور ہیں، خصوصیت کیساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ، جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ، مشکوٰۃ باب مذکور،

ملتی ہے لیکن اگر اُس نے اُس مُہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگدل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہوگا، بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے، اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے تا آنکہ اُس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو۔[۱]

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے اُن کو بالکل بے قدر کر دیا ہے، لکھا ہے:

"اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا، اور وہ ایک تن ہوں گے" (پیدایش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی جو خود انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے نا آشنا تھے، تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے، ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرفداری

---

[۱] فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائیگا، امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے، ورنہ نہیں، اور ظاہریہ کے اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے، اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفورِ شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے، اسلئے اکثر فقہاء نے اس کو قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے، الا یہ کہ دلائل و قرائن باپ کے سوء قصد کو ظاہر کرتے ہوں،

اور حمایت کی اور اسی لئے طلاق کو ناجائز قرار دیا (مرقس ۱۰-۷، ۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابلِ حل اختلاف ہو، اور اس لئے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینی پڑے، تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس سوال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا، اور مٹ کر بن سکتا ہے لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہے، حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے، مگر اُن کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو پسند نہ تھیں، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کریں،

اولاد کا حق

اصولی تعلیم

جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں، اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں، اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا، اور اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا، اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا لیکن محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں، وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے، ان حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے یہ متن ان سب پر محیط ہے، فرمایا،

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ	جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے
صَغِيرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا	اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے
(ترمذی)	وہ ہم میں سے نہیں،

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں، اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں، یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں، بڑوں، افسروں، ماتحتوں، آقاؤں، نوکروں اور بزرگوں، اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے، تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے، حکیموں اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا، وہ نبی اُمّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں، اگر واقعاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونوں کا بارگراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا،

اوّلاً سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے اُن کی اولاد کی زندگی کا واسطہ اُن کو بنایا ہو تو وہ بالقصد اُس کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہیں، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کے نشو و نما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو اُن کی قوت اور استطاعت میں ہیں یہی سبب ہو کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے، اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے، اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے،

اولاد کشی کا انسداد

عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچوں کا مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا، یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے، اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو مذہبی تھا، یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے خود ذبح کرکے اُن پر چڑھا دیتے تھے، منّت مانتے تھے، کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچے کی قربانی کریں گے،[1] یہ قابلِ نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی، رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں "اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس فعل کی کوئی بازپرس نہ تھی، اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا"[2] ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے، اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا، اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں، دیوتاؤں، دیبیوں کی خوشی اور نذرانے کے لئے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں، قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے،[3]

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ — (جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں

الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ — خدائے برحق کے ساتھ اُن کے دیوتاؤں

---

[1] سیرۃ ابن ہشام وطبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبد المطلب کا عبد اللہ کو قربانی دینے کا واقعہ نیز موطا امام مالک باب مالا یجوز من النذور فی معصیۃ اللہ، [2] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص ۲۲۰، [3] کشاف زمخشری تفسیر آیت ذیل،

شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ
وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ
وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ
فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ
(انعام - ١٦)

نے اپنا حصہ لگا لیا ہے) اسی طرح بہت سے
مشرکوں کو اُن کے دیوتاؤں نے یہ بات
خوبصورت کرکے دکھائی ہے کہ وہ اپنی
اولاد کو قتل کردیں، تاکہ یہ دیوتا اُن کو
(ہمیشہ کے لئے) ہلاک کردیں، اور اُن کے
دین کو اُن پر مشتبہ کردیں، اور اگر اللہ
چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے تو ان مشرکوں
کو اور جو کچھ خدا پر وہ افترا کرتے ہیں
تو ان کو اور ان کے افترا کو چھوڑدے

اسی سلسلہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے،

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ
سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام - ١٦)

گھاٹے میں ہیں وہ جنھوں نے اپنی
اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اُس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا، اس لئے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے، نبوت محمدیؐ نے اُن کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا، بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے، اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر ساماں ہے،

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ	اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ
اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (ھود-۱)	اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے،

اس لئے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی،

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ	اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف
اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ	سے مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں، جوان کو
وَاِیَّاکُمْ ط اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ	اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں،
خِطْاً کَبِیْرًا، (اسراء-۴)	ان کا مار ڈالنا بے شبہہ بڑا گناہ ہے،

قتل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنھوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں، بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں؟

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ	کہدے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو
عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ	پڑھکر سناؤں کہ تمھارے پروردگار
شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا	نے تم پر کیا حرام کیا ہے، خدا کا کسی کو
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ	شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ کے ساتھ
اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ	اچھا سلوک کرنا، اور مفلسی کے ڈر سے
وَاِیَّاھُمْ،	اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو، ہم تم کو اور
(انعام-۱۹)	اُن کو دونوں کو روزی دیتے ہیں،

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے،؟ فرمایا شرک، پوچھا اس کے بعد، فرمایا والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی اس کے بعد فرمایا یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو، کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی[۱] یہ جواب حقیقت میں آیت بالا کی تفسیر ہے، ان ہی تعلیمات اور نبوت کے اس پر توفیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا، کہ رازق خدا ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لئے پاک ہوگئی

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی، وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا، کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں، جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا، اور وہ لوگوں سے منھ چھپاتا پھرتا تھا، اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو، اور خدا کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے،

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ ۔ (زخرف - ۲)	اور جب اُن میں کسی کو اُس کے ہونے کی خوشخبری دیجائے جس کی وہ رحمت والے خدا پر تہمت باندھتے ہیں، تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منھ سیاہ

---

[۱] صحیح بخاری کتاب التوحید و تفسیر سورۂ بقرہ و سورۂ فرقان و کتاب الادب کتاب المحاربین و صحیح مسلم کتاب الایمان،

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردۂ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتے، قرآن مجید نے اہل عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے،

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی	اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ	دیجاتی ہو تو اس کا منھ کالا پڑ جاتا ہے اور
كَظِيْمٌ ط يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ	غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس
مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ	خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے
اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ	منھ چھپاتا پھرتا ہے، کہ آیا ذلّت اٹھا کر
يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ط	اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اُسکو مٹی
(نحل - ۷)	میں چھپا دے، (یعنی زندہ دفن کر دی)

یوں تو اس رسم بد کا رواج تمام عرب میں تھا، مگر اخبار عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا[1]، بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرار کیا، کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے[2]، یہ رسم جس شقاوت اور سنگ دلی کے ساتھ

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران ص ۳۴۰، وکتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۲۰۸، مطبعہ خیریہ مصر زیر مثل اضلّ من موؤدة [2] ابن جریر و ابن کثیر و دُر منثور سیوطی بحوالۂ سنن بیہقی و مسند بزاز و مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورۂ تکویر۔

انجام دیکھاتی تھی، اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہو گئے،

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت[1] ہے کہ ایک شخص نے آکر خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ "یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کو پوجتے تھے، اور اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی، ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی، میں آگے بڑھا، اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی میں آگے بڑھتا چلا گیا، جب ایک کنوئیں کے پاس پہونچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا، اور لڑکی اس کے قریب پہونچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا، وہ ابا ابا کہکر پکارتی رہی، اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی"، رحمتِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم اس پُردرد افسانہ کو سُن کر آنسو ضبط نہ کرسکے، ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضورؐ کو غمگین کر دیا، فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے، وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے، پھر ان صاحب سے فرمایا "ہاں میاں تم اپنا قصہ پھر تو سناؤ"، انھوں نے دوبارہ پھر بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریشِ مبارک تر ہو گئی، پھر فرمایا "جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے، اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو"،

---

[1] سنن دارمی ص اول، یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں لیکن اس لئے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آجائے،

قبیلۂ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے، تو انھوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں، فرمایا اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یارسول اللہ میرے پاس اونٹ ہیں، فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو"[1]

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں، مائیں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لئے حوالہ کرتی تھیں، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے،

ما لقی الموؤد من ظلم امّہ   کما لقیت ذھل جمیعًا و عامر

زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں ایک عورت نے آکر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی، فرمایا ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ دے دو"[2]

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لئے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا، اور ان کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو عرض کی، یارسول اللہ!

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق و بزاز و در منثور سیوطی بحوالہ مسند بزاز و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۂ اذا الشمس کورت [2] موطا امام مالک باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ

میں نے اسلام سے پہلے ۳۰۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا، فرمایا: ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا، کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے[1] اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثتِ نبوی سے پہلے دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے، وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوشِ شفقت میں لے لیتے تھے، اور اُن کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ اُن کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کردوں، چاہے اُن کو میرے ہی پاس رہنے دو،[2] یہ شخصی کوششیں تھیں، جو ملک میں بارآور نہ ہوئیں لیکن بعثتِ محمدیؐ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لئے خزاں چھاگئی،

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے، نبوتِ محمدیؐ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بن گئیں، فرمایا "جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہو اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے، تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالے گی، وہ اُس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی"[3] نیز فرمایا "جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہوگا"[4] غور کیجئے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہدِ محمدیؐ

[1] تفسیر دُرِّ منثور بحوالہ طبرانی، تفسیر سورۂ اذا الشمس کورت [2] صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اص ۵۴
[3] صحیح بخاری کتاب الادب و صحیح مسلم کتاب البر [4] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی الشفقۃ علی الخلق

میں آکر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی،

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لئے آپ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی، صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں، ان سے توبہ کی جو بیعت لیجائے اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ (ممتحنہ) کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی[1] چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن جب عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لئے حاضر ہو رہے تھے، تو آپ نے عورتوں سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا، اور انھوں نے اقرار کیا[2]، عید کے اجتماع عام میں عورتوں کے مجمع میں آپ تشریف لائے، اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد لیا[3]، کہ وہ قتل اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی، دوسرے موقعوں پر بھی جو خاتونیں دربار رسالت میں حاضر ہوتیں، ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا[4]، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیش نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں، اُن میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ چنانچہ بیعت عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ "وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے[5]"،

حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربار رسالت میں

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعۃ النساء، [2] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۳۳ باب موعظۃ الامام النساء یوم العید [3] ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و سلمی بنت قیس [4] تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۳۴۴، برحاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۶۲۴ علی شرط مسلم

حاضر تھے، آپ نے فرمایا کہ "ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بدکاری نہ کرو گے، اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، جو اس عہد کو پورا کریگا، تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے، اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا، اور اُس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اُس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا، اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے، چاہے بخش دے چاہے عذاب دے[۱]"۔ صحابہ سے فرمایا کہ "خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے[۲]"

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں، ان تمام سنگدلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں، قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں، غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی مسندلت کی کرسی پر ہے، اعمالنامے شہادت میں پیش ہیں، کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آکر کھڑی ہو جاتی ہیں، شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں،

وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ　　　　یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ

[۱] صحیح بخاری کتاب الایمان وباب وفود الانصار و مسلم کتاب الحدود و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ و مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۳۱۸ [۲] صحیح بخاری کتاب الادب و کتاب فی الاستقراض، و صحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل۔

بِاَیِّ ذَنۡبٍ قُتِلَتۡ، دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا

(کورت) جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی،

کس درجہ بلیغ اور موثر طرز ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے، یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رکھی تھی، چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے، حضرت علیؓ گود میں اٹھا لیتے ہیں، اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ یہ تمہارے چچا کی بیٹی ہے، حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہئے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے، حضرت زیدؓ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہئے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دل خوشکن منظر کو دیکھتے ہیں، پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہکر اس کی خالہ کی گود میں دیدیتے ہیں، کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے [1]،

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی، جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا، اور وہ لوگوں کے مجمع میں منھ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا، یا یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لئے دفعۃً چار چار گودیں خالی ہو جاتی ہیں، اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء،

کا ذریعہ بنتی ہے،

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ	رحمت اُن کو بھی ملے گی جو......) "
لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا	جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہماری
قُرَّۃَ اَعْیُنٍ،	بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں
(فرقان - ۶)	کی ٹھنڈک عنایت فرما،

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا،

غَدَا النَّاسِ مذ قام النبی	پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہر
الجوادیا،	کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں،

رضاعت وحضانت اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشو ونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے، اس کی خبرگیری کی جائے، اور اس کے بعد اُس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی، اور اُس کے خرچ کی کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے، تنہا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے، مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے، اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانونی (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علحدہ ہو چکی ہو تو باپ اس کی رضاعت کا سامان کرنا، اور اُس کی اُجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا، اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی

مقرر کردی گئی ہے،

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ	اور مائیں اپنے بچّوں کو پورے دو برس
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ	دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے لیے ہے
يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ	جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری
لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ	کرے، اور لڑکے والے (باپ) پر اُن
بِالْمَعْرُوفِ ۚ	دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور
(بقرہ - ۳۰)	کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے،

اور شیر خوارگی .... کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس کی اہمیت کو قبول کیا، اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے، فرمایا،

وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ	اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں،
وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ	جنھوں نے تم کو دودھ پلایا، اور تمہاری
(نساء - ۴)	دودھ شریک بہنیں،

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشو ونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہو کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہونچ جاتی ہے،

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری

باپ پر ڈالی گئی ہے، تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ ہی پر ہے، اور باپ نہ ہو تو دادا پر، اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے،

تعلیم و تربیت ظاہری اور جسمانی نشو و نما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے، کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں، فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا	اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور
أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا ، (تحریم-۱)	اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ،

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا، بزرگِ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود اُن تمام برائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے اُن کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے،

خدا نے اُن لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچّوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بارالٰہا! تو اُن کو ظاہر و باطن کا حسن، صورت و سیرت کی خوبی اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا، فرمایا،

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا	اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں

مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ	کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری
اَعْيُنٍ ،	بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف
(فرقان - ۶)	سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما ،

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادتمند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی وسعادتمندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے ، ایک سورہ میں خدا ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں ، اور اُن کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں ، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا مانگتے ہیں

وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ	اور (اے خداوند !) میرے لیے میرے
تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ	کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا '
	میں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز
(احقاف - ۲)	آیا ، اور میں فرمانبرداروں میں ہوں '

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں وحیِ الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پاکر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا ،

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربارِ نبوی میں آیا ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے ، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی ، اُس نے کہا کیا آپ

بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں، میں نے اُن میں سے کسی کو پیار نہیں کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا "جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے، تو میں کیا کر سکتا ہوں"۔ ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہیے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اُس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں، اس وقت کاشانۂ نبوی میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، اُم المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اُس کے نذر کر دی۔ ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھائے، اور ان ننھی جانوں کو اس ستدِ رمق سے محروم رکھے اُس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دیدیا، حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضورؐ نے سُن کر فرمایا جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے، اور وہ اُن کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیے آڑ بنجائیں گی"۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے

۱؎ و ۲؎ یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الوالدین میں ہیں، نیز دیکھو ابو داؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہٗ،

ہوں گے[1]۔ اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے[2]، ایک دفعہ یہ فرمایا کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیسکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے[3]،

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے، ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے، اور اس کی بے توقیری نہ کرے، اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اسے جنت میں داخل فرمائے گا[4]، باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی میں قائم نہیں، اسی لئے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے برخلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا، اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہو، انھوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے، عرض کی نہیں، فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ ہوں گا[5]،

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الاحسان الی البنات [2] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی ادب الولد، [3] سنن ابی داود، کتاب الادب باب فضل من عال یتیماً [4] ابو داود کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل؛

اس سے اُس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا، اور اب بھی ہے، کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے، یا اُس کا کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کر دی گئی، اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا اور چھوٹوں پر مسلسل ظلم کا جو قانونی طریقہ چلا آ رہا تھا اس کا خاتمہ ہوا،

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن و شوہر کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکینِ روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، اُن سب میں عورت کو، اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقیِ مدارج کے لئے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا، ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمالِ روحانی کا ذریعہ[1] تھا، اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا، اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہو سکتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ تعلقِ ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کا ہے جو کسی

---

[1] انجیل قرنیتون ۷-۸)

کا شوہر نہ ہو جو کسی کی بیوی نہ ہو جو کسی کا باپ نہ ہو جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناتہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لئے اس کو کون سے فطری موقعے مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت وعصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے، اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہو، مذہبی تجربے کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد وعورت بلکہ آزاد وغلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا،

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ	اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا
الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ	(خواہ وہ کواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے
اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ	غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں
مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہونگے
(نور-۴)	تو اللہ اُن کو اپنی مہربانی سے غنی کر دیگا،
	اور اللہ گنجایش رکھنے والا اور علم والا ہے

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ "اگر وہ غریب وتنگدست ہوں گے تو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی سے اُن کو غنی بنا دے گا" یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر وبرکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی، تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے

کو فائدہ پہونچے گا، اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے۔ ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے، اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہونگے اس فلسفہ کا راز اہل دولت نہیں، غریب ہی سمجھ سکتے ہیں خصوصًا مزدور اور کاشتکار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمّے سے نکمّے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لئے جو بے کاری سے غریب ہے، بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے خصوصًا اس لئے کہ اس کی محبت اُس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کردیگی جس کے لئے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہوسکتا، آخر میں فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے" اسکی گنجایش میں سب کچھ ہے" اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے" اس لئے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں،

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو، تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرنے فرمایا

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا	اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا
اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ	ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح
فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ	کرسکے تو تمھاری اُن مومن باندیوں میں
فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ	سے کسی سے نکاح کرو جو تمھارے قبضہ
اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ	میں ہو، اور اللہ تمھارا ایمان زیادہ جانتا
بَعْضٍ ج" (نساء-۴)	ہے تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو،

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو، تو کسی با ایمان باندی ہی سے نکاح کر لو، اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں، ایک یہ کہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا، اور خدا کے نزدیک قبول ہے، دوسرا شبہہ یہ تھا کہ یہ نو مسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم رتبہ کیسے ہوں گی، تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے، اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں،

یہ اہتمام بیان اس لئے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ	میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو
عَنْ سُنَّتِی فَلَیْسَ مِنِّی ؂ ،	جس نے میرے طریقہ سے روگردانی
	کی تو وہ مجھ سے نہیں،

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ہمجنس کی تلاش ہوتی ہے، اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، چنانچہ زن و شو کے باہمی اخلاص و محبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار

؂ صحیح بخاری و مسلم کتاب النکاح،

دیا ہے، فرمایا:-

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ،

(روم - ۳)

اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم اُن کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا، بیشک اس میں سوچنے والوں کے لئے کتنی نشانیاں ہیں،

قرآن پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس کا خلوت خانۂ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن وسکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لئے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہیے کہ اس سے اُس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لئے خدا نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے، پورے ہوں، یعنی باہمی اخلاص اور پیار، اور مہر ومحبت، اور سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں، تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے،

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ اُن لوگوں

کی سخت برائی کی ہے، جو زن و شو کے باہمی میل جول اور مہر و محبت میں فرق ڈالیں، فرمایا،

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ	تو وہ (یہود) اُن سے وہ سیکھتے
بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ	ہیں، جس سے شوہر اور اس کی
......مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ	بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں.....
مِنْ خَلَاقٍ،	.......اس کے لئے آخرت میں
(بقرۃ - ۱۲)	کوئی حصہ نہیں ہے،

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے،؟ اس کی صورت صرف ایک ہی اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری، اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن و شو باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لئے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے، اور اُس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے، اور دوسرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں، فرمایا،

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	مرد، عورتوں کے سردھرے
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى	ہیں، اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ	پر بزرگی دی ہے، اور اس لئے کہ مرد
اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ	اپنا مال اُن پر خرچ کرتے ہیں، تو نیک
حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ	بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور غائبانہ

(نساء - ٦) نگہبانی کرتی ہیں کہ خدا نے اُن کی حفاظت کی ہے،

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بی بیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں، اور اُن کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے اُن کو محفوظ کر دیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلافِ فطرت ہے،

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو اُن کی معاشی، اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت، اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآنِ پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اُس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے،

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ٥ (بقرہ - ۲۳) عورتیں تمہاری پوشاک ہیں، اور تم اُن کی پوشاک ہو،

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں، تم اُن کے لئے ستر پوش ہو، وہ تمہارے لئے، تم اُن کی زینت ہو وہ تمہاری، تم اُن کی خوبصورتی ہو وہ تمہاری، تم اُن کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمہاری، یہی نکاح کے اغراض ہیں، اور انہی اغراض

کو پورا کرنا حقوق زوجین کو ادا کرنا ہے،

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور اُن کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ
الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ
وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا
كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ
الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا،
(نساء-۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا، اور اُسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس خدا کا جس کا واسطہ دیکر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو، اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو، اللہ تمھاری دیکھ بھال کر رہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے. ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑوں مرد و عورت پیدا ہوئے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہیے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق حقیقی کا، اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ

یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا، اس لئے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے، اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے،

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہو مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (مائدہ-۱) "پاکدامنی کے لئے، نہ شہوت رانی کے لئے"، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا "اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو، وہ نکاح کرلے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی، اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے، کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے، (ابن ماجہ، نکاح)

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یکجہتی کا رجحان نمایاں رہے، اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو، باہم صلح کے لئے آمادہ رہنا چاہیے، اور اصلاحِ حال کے لئے دونوں کو برابر کوشش کرنا چاہیے اسی لئے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاح حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے فرمایا، ان ارادوا اصلاحاً (بقرہ-۲۸) اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا (نساء-۱۹) اگر اصلاح کرو، اور تقوی کرو، کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدود کو قائم کرنا کہا گیا ہے،

اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللہِ ،	یہ کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدوں
(بقرہ - ۲۹)	کو قائم رکھیں گے ،

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے ، اور جب انھیں کوئی سمجھاتا ، تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں مجبور ہیں ، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا ،

وَلَا تَجْعَلُوا اللہَ عُرْضَۃً	اور خدا کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ
لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا	بناؤ کہ سلوک نہ کرو ، اور تقوی ، اور
وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ وَاللہُ	لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار
سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (بقرہ - ۲۸)	کرو ، اور اللہ سنتا اور جانتا ہے ،

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے ، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن و شو کے معاملہ سے ہے ، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بِرّ) پرہیزگاری کا برتاؤ (تقوی) ، اور صلح جوئی ، اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے ،

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں ،

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ	تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار
لِّلْغَیْبِ ،	ہوتی ہیں ، اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر
(نساء - ۶)	کے مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں، اُن کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت اُن کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں، اور اُن کی عزت و آبرو کی جو خود اُن کی عزت و آبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں، حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے، اور شوہر گھر پر نہ ہو، تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے" (ابن ماجہ نکاح)

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی:-

"لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں، تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے، لیکن یہ کہ وہ کھلی بےحیائی کا کام کریں، اگر ایسا کریں تو اُن کو خوابگاہ میں علیحدہ کر دو، اور ان کو ہلکی مار مارو، تو اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، بیشک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسرں سے پامال نہ کرائیں، جنکو تم پسند نہیں کرتے اور تمہارے گھروں میں اُن کو اُنکی اجازت دیں جن کا آنا تمکو پسند نہیں اور ہاں! اُن کا حق تم پر یہ ہے کہ انکے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو"

(ابن ماجہ کتاب النکاح)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟ فرمایا جب خود کھائے تو اس کو کھلائے جب خود پہنے تو اُس کو پہنائے، نہ اس کے منھ پر تھپڑ مارے، نہ اُس کو بُرا بھلا کہے، اور نہ گھر کے علاوہ اُس کی سزا کے لئے اُس کو علٰحدہ کرے، (ابن ماجہ کتاب النکاح) دوسری طرف آپنے عورتوں کو حکم دیا، کہ وہ اپنے شوہرن کی پوری اطاعت کریں، یہاں تک فرمایا کہ "اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے،" آپنے یہ طریقۂ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لئے اختیار فرمایا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں،

ایک مشہور حدیث میں آپنے فرمایا،

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ،	تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں
(ترمذی و دارمی و ابن ماجہ)	کے لئے سب سے بہتر ہے،
خیارکم خیارکم لنساءھم	تم میں سب سے بہتر وہ ہیں، جو اپنی
(ترمذی)	بیویوں کے لئے بہتر ہیں،

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتا دی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیے،

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا یہ حال سُنا تو اُن کو بلوا کر فرمایا،

ولزوجک علیک حقاً — اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے،

(بخاری کتاب النکاح)

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی معمولی قصوروں پر ماری پیٹی جا سکتی تھیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار و قطار میں نہیں سمجھتے تھے، اسلام آیا تو اُس نے اُن کے بارہ میں احکام اُتارے، اور اُن کے حق مقرر کئے [۱]،

اسلام نے اُن کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا، کہ اُن کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا، اور آپس کے قانونی حقوق میں اُن کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی، ارشاد ہوا،

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ. (بقرہ - ۲۸)	اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر، اور مردوں کو اُن پر ایک فضیلت ہے

لیکن یہ منزلت بھی اُن کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے، اس لئے تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی وہ گویا اپنی گھر بلو عدالت کے اعزازی صدر

[۱] صحیح بخاری، باب موعظۃ الرجل لحال زوجہا، وتفسیر سورہ تحریم،

بنائے گئے ہیں، یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دور کرنے کے سلسلہ میں ہی، گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہوسکتا ہی کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلاسکے،

اس اعزازی منصب کے لئے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں، قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتا دی ہیں، فرمایا،

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ	مرد عورتوں کے نگراں ہیں، اس سبب
بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی	سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ (نسآء)	ہو اور اسلئے کہ انھوں نے اپنا مال خرچ کیا،

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہی کہ اللہ تعالی نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہو اطبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اسی لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہیئے، دوسرا سبب یہ ہی کہ اسلام نے دین مہر، نان ونفقہ اور پرورشِ اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہو اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہو، اس لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدرنشین بنایا جائے تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے،

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید اُن کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو بعض مرد یہ چاہتے ہیں، کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر اُن کی یہ ٹیڑھ نکال دیں، آپ نے اُن کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دیکر نصیحت فرمائی کہ "عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ اُن کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس طرح اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ کام لے سکو، تو لے سکتے ہو، اور اُس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے۔"[1] آپ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع و راضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا فرمایا "اپنی بیوی میں کوئی بُرائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئیگی"[2] یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَاِنْ	اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ
كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ اَنْ	سے گذران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائیں
تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ	تو ممکن ہو کہ تم کو ایک چیز ناپسند آئے اور
فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (نساء-۳)	خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہو،

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بارِ گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے، اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لئے خود روزی کمانا، اور

---

[1] صحیح بخاری و مسلم نکاح [2] صحیح مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء،

سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے، اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان و نفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے، تو حکومتِ وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے، تو بیوی کو اس سے علٰحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے،[۱] انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں،

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لئے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اُس کی حیثیت کے مطابق بقدرِ ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابو سفیان کی بیوی ہند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آکر عرض پرداز ہوئی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو سفیان بخیل آدمی ہیں وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے اُن کی لاعلمی میں کچھ لے لوں، فرمایا "تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو۔"[۲]

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا "تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے اُس کی نسبت بازپرس ہوگی، ..... مرد

---

[۱] اس اختیار کی تشریح میں فقہا مختلف ہیں، تفصیلات کے لئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہئے، نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ ص ۲۶۳ مصر [۲] صحیح بخاری باب ذا لم ینفق الرجل ص ۸۰۸،

اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی" اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے، اس سے اس کی پوچھ گچھ ہوگی" (بخاری اوّل ص ۹،، باب قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا،

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے؟

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ	اور جن بیویوں کے "نشوز" کا تم کو ڈر ہو
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی	تو اُن کو سمجھاؤ، اور خوابگاہوں میں
الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ	اُن سے علیحدگی برتو، اور اُن کو مارو، تو
فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا	اگر وہ تمھارا کہنا مان لیں، تو پھر اُن
عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا، (نساء-۶)	پر راہ مت تلاش کرو،

لغت میں "نشوز" کے معنی "اٹھ جانے" کے ہیں، اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں، وہ مفسّر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں،

ومعنى ذالك اذا رأيتم	اور اُس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم اُن
منهن ما تخافون ان	عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے
ینشزن علیکم من نظر	تم کو اُن کے "نشوز" کا ڈر ہو، یعنی
الی ما لا ینبغی لهن ان ینظرن	اودھر دیکھنا جدھر اُن کو دیکھنا نہیں
الیه ویدخلن ویخرجن	چاہیے اور وہ آئیں اور نکل جائیں در تمکو

وَاسْتُرُوْبِتُمْ بِاَمْرِهِنَّ (تفسیر طبری، مصر ۵-۳۸)	ان کی بابت شک ہو جائے ۔
عَنْ محمد بن کعب القرظی اذا	محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب
رای الرّجل تقصیرها فی حقه	مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر
فی مدخلها ومخرجها قال یقول	آنے جانے میں اُس کے حق میں قصور
لها بلسانه قد رایتك منك	کر رہی ہے، تو اُس سے زبان سے
کذ اوکذ افانتهی ،	کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی
(تفسیر طبری مصر ۵-۳۸)	یہ دیکھی تو اب باز آجا !

فقہ کی کتابوں میں ہے ،

النَّاشزة هِیَ الخارجة عَنْ	نشوز والی عورت وہ ہے، جو اپنے
منزل زوجها المانعة نفسها	شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے
مِنْه ، (عالمگیری - نفقات)	آپ کو اُس کے سپرد نہ ہونے دے ،

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں ،
کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے، اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے
شوہر پر بلندی چاہے، اس کا حکم نہ مانے اُس سے بے رُخی کرے، اور اس سے بغض رکھے
(تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں، اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے

لہ اصل متن تفسیر میں وَاسْتُرُوْبِتُمْ غالباً غلط چھپا ہے ،

نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیتِ مذکور پوری یہ ہے،

الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	مرد عورتوں کے نگراں ہیں، (ایک) اس لئے
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى	کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے،
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ	اور (دوسری) اس لئے کہ مرد اپنا مال
فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ	(اُن پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیویاں
لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِيْ	فرمانبردار ہوتی ہیں، اور (شوہر کے) پیٹھ
تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ	پیچھے (شوہر کے گھربار اور عزت و آبرو
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ	کی) حفاظت کرتی ہیں، کہ اللہ نے اُن
وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ	کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور
فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا،	جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو اُن کو
	سمجھاؤ، اور اُن کو خوابگاہوں میں
(نساء-٦)	علٰحدہ کردو اور اُن کو مارو تو اگر وہ تمہارا
	کہا مان لیں تو پھر اُن پر راستہ تلاش نہ کرو

اس آیتِ پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں، اُن کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں، اور اُن کے پیٹھ پیچھے اُن کے گھربار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمھیں "نشوز" کا ڈر ہو،

اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے،

تو اُس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو۔ یا اُس سے بات کرنا چھوڑ دو،
اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو۔ اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق
وغیرہ دینے کے لئے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر میں بتا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے،
پھر یہ بھی کہا جا چکا کہ نیک بیویاں وہ ہیں، جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں، اور شوہر کے
پیچھے اُن کے گھر بار، مال و دولت، اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اور اس کے
بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو، تو یہ یہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت
کا نشوز یہ ہے کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر
کے پیچھے اس کے گھر بار اور عزت و آبرو کی حفاظت، جو عورت ان دونوں کو یا ان
دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی
اجازت دی گئی ہے۔

"شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت" کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے اس کی تصریح احادیث
میں موجود ہے۔ آپ نے فرمایا سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان
لے اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اسکے مال کی حفاظت کرے یعنی اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت و عصمت ہے
حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فقرے
ہیں اُن میں نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے۔ صحیح مسلم میں ہے،

وَاتقوا اللہ فی النساء فانھن	عورتوں کے بارہ میں خدا سے ڈرو

عِنْدَکُمْ عوان ولکم علیہنّ ان لا یوطئن فرشکم احدًا تکرھونہ فَاِنْ فعلن فاضربوھن ضربًا غیر مبرحٍ، (مسلم)

ترجمہ

کہ وہ تمہارے بس میں ہیں، تمہارا اُن پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے روندائیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو اگر وہ ایسا کریں تو اُن کو اتنا مارو جو تکلیف دہ

ابنِ ماجہ میں یہ الفاظ ہیں،

استوصوا بالنّساء خیرًا فانّہن عِنْدکم عوانٍ لیس تملکون مِنْھُنّ شیئًا غیرَ ذٰلک اِلّا ان یاتین بفاحشۃٍ مُبیّنۃٍ فانْ فعلْن فاھجروھُنّ فِی المضاجع واضربوھن ضربًا غیر مبرحٍ فَاِنْ اطعنکم فلا تبغوا علیہنّ سبیلا، (کتاب النکاح)

عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں، تم کو اس کے سوا اُن پر کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بیحیائی کا کام کریں تو اگر ایسا کریں تو اُن کو خوابگاہوں میں علحدہ کردو، اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو اُن پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو،

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہو کہ ایسے لوگ اس گھر میں آنے

جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو، "اور کھلی بیحیائی" سے جدھر اشارہ ہی وہ چھپا نہیں لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشۃ مبیّنۃ کی تفسیر میں داخل کیا ہی (تفسیر سورۂ نسار رکوع ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہی، اور شرع کی تصریح ہو کہ "ضرب غیر مبرح" یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہونچے بلکہ یہاں تک تصریح ہو کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہی، (تفسیر طبری جلد ۵ ص ۴۱ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آسکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حکم دیا کہ خدا کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو" تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہوگئیں، تو آپ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہلبیت نبویؐ کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لیکر آئیں، یہ دیکھکر آپ نے فرمایا آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں، جو اپنے شوہروں کی شکایتیں لیکر آئی تھیں یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں،[۲]

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا آپ نے

---

[۱] یہ پیش نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کیلئے ہی، ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگسار کی یا تازیانہ ہے جس کا اجراء قاضی کا فرض ہی۔ [۲] ابوداؤد و ابن ماجہ دارمی

فرمایا، "وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اُتارتا"[1] یعنی وہ مارپیٹ کیا کرتا ہے، اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اُس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا، ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ میری بیوی بدزبان ہے، فرمایا طلاق دیدو، عرض کی اس سے میری اولاد ہے، اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح نہ مارا کرو[2]" ایک دوسرے موقع پر فرمایا "کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں، کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہمبستر ہو[3]"

[1] صحیح مسلم باب المطلقۃ ثلاثاً [2] مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء بحوالہ ابو داود [3] ایضاً بحوالہ صحیح بخاری و مسلم۔

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں، باپ، اولاد، اور زن وشو کے بعد درجہ بدرجہ ... دوسرے اہلِ قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام "صلۂ رحم" ہے، محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ وحی محمدیؐ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآنِ پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے، اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا:-

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (روم-۴) تو قرابتدار کو اس کا حق ادا کرو،

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (اسرائیل-۳) اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر،

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے،

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (اور اصل نیکی اُس کی ہے جس نے ... اور مال کو

ذَوِی الْقُرْبٰی . (بقرہ-۲۲) اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا،

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں

وَالْاَقْرَبِيْنَ .... (بقرہ-۲۶) باپ اور رشتہ داروں کے لئے....

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک خدائے تعالیٰ کے اُن خاص احکام میں ہے، جن کا انسان سے عہد لیا گیا،

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى ۝ (بقرہ-۱۰) (اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا،

سورۂ نحل میں اہلِ قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (نحل-۱۳) بے شک اللہ انصاف اور حسنِ سلوک اور قرابتدار کو دینے کا حکم کرتا ہے،

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ ۝ (بقرہ-۲۶) کہدے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، تو وہ اپنے ماں باپ قرابت والوں، یتیموں، اور غریبوں کے لئے،

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہلِ دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا،

وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ (نور-۳)

اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں، وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے بعد تیسری چیز اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى، (نساء-۶)

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ، اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا،

حقِ قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعی اسلام علیہ السلام اپنی ان تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق میں اُن کو پیش آئیں، اور اپنے اُس احسان وکرم کا جو ہدایت تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا، بدل معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو، اور ان سے لطف ومحبت سے پیش آؤ، فرمایا،

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا

کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر

وَلَا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبىٰ،	بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا
(شوریٰ - ۳)	کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو،

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل صلۂ رحم (رحم ملانا) ہے، اور قرابت کے حق کو نہ ادا کرنے کو قطعِ رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں کہ رحم مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے، کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک اُن کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے، یہ اشتراک کہیں ہم عمری کہیں ہم درسی کہیں ہم سائگی کہیں ہم مذاقی کہیں ہم پیشگی کہیں ہم وطنی کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لئے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائضِ محبت کی ادائگی واجب ہے لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھکر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحم مادر ہے، یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے، جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لئے اُس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے، ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں، وحی محمدی نے فاسق کا خطاب دیا ہے، اور اُن کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے،

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ	اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے، جو
الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ	حکم نہیں مانتے جو خدا کا عہد باندھکر

مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ، (بقرہ[۳])

توڑتے ہیں، اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا اس کو کاٹتے ہیں،

ایک حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے، اس لئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ جس نے تجھ کو ملایا، اس کو میں نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا، اس کو میں نے کاٹا[۱]" اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ادا فرمایا کہ "رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے، جو مجھے ملائے، اس کو خدا ملائے، اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے[۲]" ایک اور موقع پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا، ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا، خدا نے فرمایا ٹھہر جا، (یہ اس کا مسکن ہوگا، جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا، کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں، جو تجھکو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں[۳]" یعنی رحم مادر اور اس رحمان کے رحم (وکرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے، جو اسلام کی نظر میں اہل قرابت کی ہے،

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے سورہ نساء

[۱] صحیح بخاری، کتاب البر والصلۃ [۲] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ [۳] ایضاً،

میں فرمایا،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ	اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک
بِهٖ وَالْاَرْحَامَ،	دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس
(نسآء - ۱)	کا اور رشتوں کا خیال رکھو،

اس آیتِ پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھیے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لیجائے، فرمایا خدا کی بندگی کرو کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو، اور قرابت کا حق (صلۂ رحم ادا کرو)[1]

جبیر بن مطعم صحابی رضی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کریگا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا" (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رُکا رہے گا، جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہولیگا، یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)[2]

ابوہریرہ رضی صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کو یہ پسند ہو کہ کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اُس کو چاہیئے کہ صلۂ رحمی کرے[3]، اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے، کیونکہ صلۂ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم [2] ایضاً باب اثم القاطع [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق لصلۃ الرحم

یہ کہ ضرورتمند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے، دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصّہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے، پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی، اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے،

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کیجاسکتی ہے، انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اُس کے لئے اضمحلال، تکدر، اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ، صلۂ رحم، اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں، اُن کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح، اور طمانیت خاطر رہتی ہے جس کی وجہ سے اُن کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے "صلۂ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے"۔

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلۂ رحم کا جواب صلۂ رحم سے دے، بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرتا ہے، اس کیساتھ صلۂ رحم[۱] کیا جائے یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں، اُن کا حق ادا کیا جائے،

---

[۱] صحیح بخاری باب لیس الواصل بالمکافی،

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں انسانیت
اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراکِ عمل، تعاون، اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا میں
ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے، تو دوسرے پر حق ہے
کہ اپنے کھانے میں سے اُس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمارداری
کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے، اور اس اخلاقی
نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی، باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں
بندھ کر ایک ہو جائے، ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور
بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے
سے ملا ہوا، اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لئے ہر مذہب نے
ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں، آپس کی محبت اور امداد کی
ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اوروں سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں
ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہونچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے

جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لئے اُن کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے تاکہ برائیوں کا سدباب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو، اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے، اور گھر میں قدم رکھے،

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھکر ہمسائگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں، عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لئے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا، اور اس لئے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا، اسلام نے آکر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا،

وحیِ محمدیؐ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے، اور اس کا دوسرا نام رفاقت، اور صحبت ہے، ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت یا ہم مذہبی کا، یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو، قرآنِ پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہے،

وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ	اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ
الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ	بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ
(نساء-٦)	(نیکی کا حکم دیا ہے)

اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنوں میں اہلِ تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ قریب کے معنی رشتہ دار و عزیز اور بیگانہ کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں، دوسرے کی رائے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہیں، اور "دور" سے مطلب دوسرے مذہب والے ہیں، جیسے یہودی عیسائی، مشرک وغیرہ[1] لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے تعلیم محمدیؐ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسایگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیزداری ہو، یا ہم مذہبی کا، یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو، بہرحال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے،

اس حکمِ الٰہی کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمائی سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اس کو ایمان کا براہِ راست اثر اور نتیجہ فرمایا، ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دلنشین انداز سے فرمایا "خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا" جاں نثاروں نے پوچھا کون یارسول اللہ! فرمایا "وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں"[2] ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم من لایامن جارہ بوائقہ [3] صحیح بخاری باب

خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے"[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو شخص خدا اور روزِ جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے"[2]

ایک اور موقع پر اس کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا، ارشاد فرمایا "خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کیلئے بہتر ہے"[3] اُم المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ "جبریل نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں اُن کو وراثت کا حق نہ دلا دیں"[4] حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے،

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے، اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں، تو میں اُن میں سے کس کے پاس بھیجوں" فرمایا جس کے گھر کا دروازہ تمھارے گھر سے زیادہ قریب ہو"[5]

اس ہدیہ اور تحفہ کے لئے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لئے کافی ہیں، کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو، اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو، اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ "اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو، اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو"[6]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب [2] ایضاً [3] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی حق الجار [4] صحیح بخاری کتاب الادب

[5] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار الی قرب الابواب [6] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی حق الجوار،

ان تحفوں کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے، اس لئے آپ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھری کیوں نہ ہو"[1] یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لئے ہے، یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے، اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اُس کی حقارت کرے،

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو، اور اس کا پڑوسی اُس کے پہلو میں بھوکا رہے"[2]،

بُرائی بُرائی ہے جہاں بھی ہو، اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہئے تھی، تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور بُرائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے، بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ پڑوسن کے مکان میں چوری کرنا کتنا بُرا ہے، بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے، اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کرکے باہر جاتے ہیں، اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے، اسی لئے توراۃ میں حکم تھا،

تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو، اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی، اور اس کے بیل اور

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب لا تحقرن جارۃ لجارتہا، [2] مشکوٰۃ از بیہقی و ادب المفرد امام بخاری باب لا یشبع دون جارہ،

اُس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ نہ کر۔" (خروج ۲۰۔۱۷)

"تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے۔" (احبار ۱۹۔۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبانِ حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی جن میں توراۃ کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے، بلکہ اس کو دس گنا زیادہ بڑا کرکے دکھایا، ایک سوال کے جواب میں فرمایا،

"زنا حرام ہے، خدا ورسول نے اُس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام ہے، خدا اور سول نے اس کو حرام کیا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھکر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرالے"[1]

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں صدقہ وخیرات بھی بہت کرتیں، مگر زبان کی تیز تھیں، زبان سے پڑوسیوں کی ستاتی تھیں لوگوں نے اُن کا حال آپ سے عرض کیا، تو فرمایا، اُن میں کوئی نیکی نہیں، اُن کو دوزخ کی سزا ملے گی، پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا، جو صرف فرض نماز پڑھتیں، اور معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں، فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی،[2]

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا،

تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو، (مرقس ۱۲۔۳۰)

[1] ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار، [2] ادب المفرد امام بخاری باب لا یوذی جارہ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے، اس کی سب سے بڑی دولت یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے،

"تم میں کوئی مومن نہ ہوگا، جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لئے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کے لئے پیار رکھتا ہے"[1]

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا،

"جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے"[2]

اسی لئے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے، جو پڑوسی ہوں گے[3]، انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا بُرا، فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سُنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو، اور جب بُرا کہتے سُنو تو سمجھو کہ بُرا کر رہے ہو"[4]

کوئی پڑوسی اگر بُرائی کرے، تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو، مگر اس کی بُرائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ بُرائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کریگا، چنانچہ ایک

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان [2] مشکوٰۃ از بیہقی [3] احمد بن حنبل مسند عقبہ بن عامر [4] سنن ابن ماجہ

دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا جاؤ صبر کرو، اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہی عرض کی، فرمایا جاکر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو، (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) اُن صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انھوں نے حقیقتِ حال بتائی، سب نے اُن کے پڑوسی کو بُرا بھلا کہا، یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ اُن کو منا کر پھر گھر میں واپس لایا، اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ نہ ستائے گا،[۱]

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گذار بن گیا تھا ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیر المومنین، گوشت کھانے کو جی چاہا تھا، تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا، اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی،[۲]

يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى	جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے،
النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي	(اُن سے کہا جائیگا) تم اپنے مزے اپنی
حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ	دنیا کی زندگی میں لیجا چکے، اور اس سے
بِهَا، (احقاف - ۲)	فائدہ اٹھا چکے،

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو وہ دنیا

۱؎ ادب المفرد بخاری، باب شکایۃ الجار، و ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار ۲؎ موطا امام مالک باب جامع فی اکل اللحم

کی کمروہ لذت قرار پاتی ہے، جس کے مواخذہ کا اُن کو ڈر لگتا ہے،

ہمسایوں میں دوست ودشمن اور مسلم اور غیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، اُن کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اُس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنادیں گے، [1]

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب، باب فی حق الجوار،

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، عقل و شعور کے پہونچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے، اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور اُن کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں، جو کہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا!

عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی، مگر جیسا کہ چاہئے، اُن کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے، کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے[1] اور نہ سنگ دل عربوں میں عام طور سے اُن کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا، قرآن پاک میں اُن کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار آیا ہے،

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری سورۂ نساء ج ۴ ص ۱۷۰،

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ	کیا تونے اس کو دیکھا جو انصاف
بِالدِّیْنِ، فَذٰلِکَ الَّذِیْ	کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم
یَدُعُّ الْیَتِیْمَ، (ماعون)	کو دھکے دیتا ہے،

ایک اور آیت میں اُن متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو یتیموں کے جوان ہوجانے کے ڈر سے اُن کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کرجانا چاہتے ہیں،

کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ	نہیں یہ بات نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت
وَلَا تَحٰضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ	نہیں کرتے، اور نہ ایک دوسرے کو
الْمِسْکِیْنِ ۝ وَتَاْکُلُوْنَ	مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو،
التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ	اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا
الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝	جاتے ہو، اور دنیا کے مال و دولت
(الفجر - ۱)	پر جی بھر کے ریجھتے ہو،

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور اُن کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے، توراۃ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں" (استثنا ۱۴- ۲۹ - و ۲۶ - ۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے، اور نہ کسی تعلیم میں اُن کا ذکر کیا ہے، اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اُس وقت آیا جب کہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لے کر

دنیا میں آیا، وحیِ الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کرکے یاد دلادیا،

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝	کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا تو اس
............فَاَمَّا الْیَتِیْمَ	نے پناہ دی............تو
فَلَا تَقْہَرْ ، (الضحٰی)	یتیم کو نہ دبا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے، اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بیکس گروہ پر رحم وکرم کی دعوت دیتے رہے چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں، دولت مندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کرسکتے ہو، ؟ ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کرکے

اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ	یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار
یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ، (بلد - ۱)	یتیم کو کھلانا

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ	اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی
مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا ۝ (دھر ۱)	غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی، سورہ نساء میں اس بیکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، اُن کو وراثت کا حق دلایا گیا اور متوفی جو جاہلیت

میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے، اُن سے کہا گیا،

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا	اور یتیموں کو اُن کے وارثوں کا چھوڑا
تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ	ہوا مال دیدو، اور اُن کے اچھے مال
وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى	کو اپنے بُرے مال سے بدلا نہ کرو، اور
اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا	نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر اُن کا مال
كَبِيْرًا ه (نساء-۱)	کھا جاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے،

دولتمند یتیم لڑکیوں کو اُن کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے، اور بے والی و وارث جان کر اُن کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا،

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى	اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق
الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ	میں انصاف نہ کر سکو گے، تو (اُن کو
مِّنَ النِّسَآءِ، (نساء-۱)	چھوڑ کر اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہئے، اور جب تک اُن کو پورا شعور آئے، وہ اُن کے سپرد کیا جائے، بلکہ اُن کے سن رشد کو پہونچنے کے بعد اُن کی عقل کو دیکھ بھال کر اُن کی یہ امانت اُن کو واپس کی جائے فرمایا،

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ	اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو خدا
الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا	نے تمہاری قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو،
وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ	اور اُن کو کھلاتے اور پہناتے رہو، اور اُن سے

قُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَابْتَلُوا	معقول بات کہو، اور یتیموں کو جانچتے رہو،
الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ	جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان
آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا	میں اگر ہوشیاری دیکھو تو اُن کا مال
إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ج (نساء-۱)	اُن کے حوالہ کردو،

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے، کہ تم اپنا مال اُن کو نہ دو" اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سنِ رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے، وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی کہ تم اُن کا مال اُن کو واپس کر دو" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے، تو اُس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسی اپنے مال کی، اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چُن کر واپس کیا جائے جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے، جس پر تمہارا کوئی حق نہیں،

متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں، اس بد دیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی،

وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَّبِدَارًا	اور اڑا کر اور جلدی کر کے ان کا مال
أَنْ يَّكْبَرُوا ط (نساء-۱)	نہ کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں،

صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو اُن کیلئے ان یتیموں کی جائداد

کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا، اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی،

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ	اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو
وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ	چاہئے کہ بچا رہے اور جو محتاج ہو
(نساء - ۱)	تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی،

وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ (نساء - ۱۹) اور یہ کہ یتیموں کیلئے انصاف پر قائم رہو،

سورۂ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی، اُن میں ایک یہ ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا	اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ	کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنی
(انعام - ۱۹)	طاقت کی عمر کو پہنچے

سورۂ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحبِ جائداد یتیموں کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہئے، اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے، (سورۂ اسراء - ۴)

یہ تو صاحبِ جائداد کی نسبت تعلیم ہے، جو یتیم غریب و مفلس ہوں، اُن کی مناسب

پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نساء، انفال، اور حشر میں بار بار اُن کی پرورش اور اُن کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ خیرات و صدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے،

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی و وارث امت کے سرپرست صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے اُن نیک لوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کے کفیل ہوں خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا "میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب[۱] ہوں گے"۔ یہ بھی فرمایا کہ "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائیگا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اُس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو[۲]" نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کیجارہی ہے اور سب سے بدتر وہ ہے جس میں کسی یتیم کیساتھ بدسلوکی کیجاتی ہو[۳]"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا، ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کیلئے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اُس کی پرورش اور کفالت کے لئے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا[۴]، بدر کے یتیموں کے

۱؎ صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیماً و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم ۲؎ ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۲ و ص ۱۳۳ بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح) ۳؎ ایضاً بحوالہ ابن ماجہ و ادب المفرد باب من یعول یتیماً ۴؎ صحیح بخاری باب عمرۃ القضاء

مقابلہ میں جگر گوشۂ رسول فاطمہؓ بتول اپنے دعویٰ کو اٹھا لیتی ہیں[1]، حضرت عائشہؓ صدیقہ اپنے خاندان[2] اور انصار[3] وغیرہ[4] کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لیجا کر دل و جان سے پالتی ہیں، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا، کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لئے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے[5]،

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو اُن کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانتداری برتنے لگے، بلکہ اُن کی جائدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا، مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہوسکا، اور آپنے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ کو رحم آیا، اور اس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دیدو خدا تم کو اُس کے بدلہ جنت دیگا، وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا، ابو الدحداحؓ صحابی حاضر تھے، انھوں نے اس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلان باغ سے بدلتے ہو، اس نے آمادگی ظاہر کی، انھوں نے فوراً بدل دیا، اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا[6]،

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، مگر اگر یہ سوال کیا جائے کیا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملیگا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے،

---

[1] ابوداؤد باب مواضع قسم الخمس [2] موطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ زکوٰۃ اموال الیتمٰی و زکوٰۃ الحلی و کتاب الطلاق،
[3] مسند احمد جلد ۶ ص ۲۹۹ [4] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی و مسند جلد ۶ ص ۳۲، [5] ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیماً [6] استیعاب ابن عبد البر تذکرہ ابو الدحداحؓ،

جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی، اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا، اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لئے بھی امن وراحت کے گھر بنائے، اُن کے وظیفے مقرر کئے، کتب قائم کئے، جائدادیں وقف کیں[1]، اور دنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی، اور قانونًا اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا، کہ وہ بے والی وسرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں، ان کی جائدادوں کی نگرانی، اُن کے معاملات کی دیکھ بھال، اور اُن کی شادی بیاہ کا انتظام کریں[2]، اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کیجاتی ہے، اور لندن کے لارڈ میر یا آرفنس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں،

---

[1] تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں، [2] حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں، قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے، اُن میں بھی خصوصیت کے ساتھ اُن کی تصریح ہوتی تھی، ۱۲،

بیوہ کے ساتھ حُسنِ سلوک

یتیموں کے بعد اصنافِ انسانی میں سب سے ناچار و ناتواں گروہ جنسِ لطیف کے اُن افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا ہے اب وہ بے یار و مددگار اور بے مونس و غمخوار ہیں، نہ اُن کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے، اور نہ اُن کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے، عورت جس کو خدا نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا، اور اس کی ذمہ داری اُس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی، اب وہ ناچار اُن سے دوچار ہے، اب غم والم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ در پیش ہے، کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر، نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے، بلکہ اُس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہیں، اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں، دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعیں کافی سے زیادہ ثبوت ہیں،

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اُس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی، وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا، عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا، عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا

مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کرسکا، ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی، اب اُس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہیئے، اگر زندہ رہے، تو اسکی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرایشوں اور لذتوں سے علٰحدہ ہوکر ساری عمر سوگ میں گذار دے، عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی، اور وہ جو چاہتے، اس کے ساتھ کرسکتے تھے، اس کو تکلیفیں دیدیکر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے، اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے،

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریاد رسی ہوئی، اُس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ اُن کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کردیا، اور صرف اتنی مدت تک کیلئے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا غم فراموش ہوسکے، اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہیں اس کیلئے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا، جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی اور اس کا نام عدت رکھا، یعنی شمار کے دن، اس مدت کے گذر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرایش کی اجازت دیدی، اس کا دین مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو، تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اول ضروری ٹھہرایا۔ پھر اس ترکہ میں سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوادیا، عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی اور اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع و قمع کردیا، اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق، بلکہ اسلام کے قانون کا جزء بنادیا،

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اُس کو

اوروں نے نکال دیا ہو اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریکِ زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہرو عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کی، بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا،

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ۝ اور اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کردو،

(نور-۴)

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیکس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں، اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے آپنے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی، اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کئے جن میں سے آٹھ حضرت سودہ رض، حفصہ رض، زینب رض ام المساکین، ام سلمہ رض، جویریہ رض، ام حبیبہ رض، میمونہ رض، اور صفیہ رض بیوہ تھیں جن کی کفالت کا بار آپنے اپنے دوشِ مبارک پر اٹھایا، اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لئے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بتا دیا،

یہ تو آپ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپنے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا

جاسکتا ہی، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والا آسانی کرسکتا ہو فرمایا،

السّاعی علی الارملة	بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے
والمسکین کالسّاعی فی	والا ایسا ہو جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے
سبیل اللہ واحسبہ قال	والا، (اور اوی کہتا ہو کہ میں گمان کرتا
کالقائم لا یفتر وکالصّائم	ہوں کہ آپنے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا
لا یفطر[1]	وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا، اور
	وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں،

السّاعی علی الارملة والمسکین	بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ کرنے
کالمجاھد فی سبیل اللہ و	والا، خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہو اور
کالذی یصوم النھار ویقوم	اس کے برابر ہو، جو دن بھر روزہ اور
اللیل، (کتاب الآداب)	رات بھر نماز پڑھا کرے،

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لئے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسری نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں، جب تک وہ بڑے ہو کر اُن سے علٰحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں یہ فرمایا، "میں اور محنت مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانیوالی

[1] صحیح بخاری وصحیح مسلم وموطا امام مالک بحوالہ مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق،

بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے، وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے، یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں[1] یا مرجائیں، اسی مقصد کو ابویعلیٰ کی مسند میں ہے کہ آپ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ "قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا، تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند یتیم[2] بچے تھے۔"

۱؎ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیماً ۲؎ حاشیہ سنن ابی داؤد بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبداللہ بن نورالدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع، لکھنو،

حاجتمندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے، اس لئے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے، اور نہ یہ سمجھے کہ اُس کو کبھی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑیگی،

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے،

فِی اَموَالِھِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے
(ذاریات - ۱)	والوں اور محروم کے لئے حق ہے،
فِیٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے
وَالْمَحْرُوْمِ ٥ (معارج - ۱)	والے اور محروم کے لئے مقررہ حق ہے،

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورتمند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی

کا خواستگار ہو، محروم کی تشریح میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے بعض اس کو محروم کہتے ہیں جس کا مالِ غنیمت میں کوئی حصہ نہیں کسی نے اس کے مظاہر معنی لئے ہیں، کہ جو دولت سے محروم ہو کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اُن سے مراد وہ مصیبت زدہ ہیں جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑگئی ہو، اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہوگیا ہو، اسی معنی کی تائید اہلِ لغت، اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآنِ پاک[1] سے ہوتی ہے،

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے یا عام صدقہ، مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق "حق" کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے، اور معارج میں جس میں مطلق "حق" کا نہیں، بلکہ "مقررہ حق" کا بیان ہے، زکوٰۃ مراد ہو، کیونکہ "مقررہ حق" کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں، بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجتمندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو، دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے،

قرآنِ پاک میں دوسرے موقع پر ہے،

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ (ضحیٰ - ۱) اور تو سوال کرنے والے کو جھڑک کا ذکر

یہاں "سوال کرنے والے" کے معنی اغنی کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے یعنی ہر ضرورتمند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم و محارف، اور تفسیر ابن جریر میں سورۂ ذاریات و معارج کی آیتِ مذکورہ اور سورۂ قلم میں اصحاب الجنۃ کے قصہ میں محرومون اور سورۂ واقعہ میں بل نحن محرومون کے معنی،

خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو[1]، یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے، تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے، اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو، اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو،

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ	جو نیک بات کی سفارش کریگا، تو
لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ	اُس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا،
شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ	اور جو بُری بات کی سفارش کرے گا
مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	تو اُس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائیگا
مُّقِيْتًا، (نساء - ۱۱)	اور اللہ ہے، ہر چیز کا نگہبان،

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کیجائے تو اس نیک کام میں اسکی سفارش کیجائے اور وہ قبول کیجائے، تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے، اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں

[1] طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ واما من سألک من ذی حاجۃ فلا تنھر، زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے،

ایسا ہی بُرے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے،

ایک اور آیت میں ارشاد ہے،

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی	اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں
وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَ	ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور
الْعُدْوَانِ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ	گناہ اور زیادتی کے کاموں میں
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ،	ایک دوسرے کے مددگار نہ ہو، اور ڈرو
(مائدہ ۵-۱)	اللہ سے، بیشک، اللہ سخت سزا دینے والا ہے

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا، ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا انھی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے،

مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ	جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری
اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ	کرنے میں لگا رہے گا، اور جو کسی
مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً	مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کریگا، تو
مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ	اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے
	کسی مصیبت کو اس سے دور
(صحیحین)	فرمائے گا،

کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا،

واللہ فی عون عبدہ ما کان العبد فی عون اخیہ (ترمذی باب ماجاء فی الستر علی المسلمین)	اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے،

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے "کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا"[1] ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بیکس حاجتمند کی مدد ہی کیا کرو،[2] یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے[3] یہ بھی ارشاد ہوا ہے، کہ جو شخص راستہ چلنے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹادے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے، اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے[4]

---

[1] صحیح بخاری کتاب لادب باب تعاون المومنین وباب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ، [2] ایضاً باب کل معروف صدقۃ [3] ترمذی کتاب البر والصلۃ [4] ایضاً،

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے، بیماروں اور مریضوں کا ہے، یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کرسکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے، اور اس فرض کا نام عربی میں "عیادت"[1] ہے

[1] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں، اور اس کی تیمارداری غمخواری اور خدمت گذاری کے بھی ہیں، بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غمخواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گذاری کرے، عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا، کہتا ہے،

ذَهَبَ الرُّقَادُ فَمَا يُحَسُّ رُقَادُ ۔۔۔ مِمَّا شَجَاكَ وَنَامَتِ العُوَّادُ

مجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی، تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سوگئے،

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار کے تیماردار اور خدمتگذار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں، یہانتک کہ ان کی کئی کئی راتیں جاگتے کٹ جاتی ہیں، لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے، اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے، اور وہ سو جاتے ہیں، اب اگر "عیادت" کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا، اس سے ظاہر ہوا کہ "عیادت" کی وسعت میں خدمت گذاری اور تیمارداری سے لیکر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں۔

ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں، یا جن کے ادا کرنے سے اُن کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے، اُن کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے، اور قرآن نے اس کے لئے ایک کلی اصول بنا دیا ہے،

وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ (نور-۸)	اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے،
لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَّلَا	نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد
عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى	میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر
الْمَرِيضِ حَرَجٌ، (فتح-۲)	اور نہ بیمار پر،
لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى	نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد
الْمَرْضَى ٥ (توبہ-۱۲)	کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)

بیماروں کے لئے وضو معاف ہے، وَإِنْ كُنْتُمْ مَّرْضَى (یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو) (مائدہ-۲) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں، عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضَى (خدا کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے) (مزمل-۲) اسی طرح روزہ کے احکام میں بھی بیمار کے لئے رعایت فرمائی گئی مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا، (تو تم میں جو بیمار ہو) (بقرہ-۲۳) روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۶) اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا

نماز کی رخصت دی گئی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے اُن سے اپنے فرائض معاف کر دیئے تو بندوں کو کس حد تک اُن سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہئے،

اسلام نے مسلمان کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے[1]،

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ اُس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے، تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لئے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں، اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے، اس کے آداب تعلیم کئے ہیں، اس کی دعائیں سکھائی ہیں، اور اس کا ثواب بتایا ہے، فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کریگا، خدا اُس[2] کے غم کو ہلکا کریگا، اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمانوں پر پانچ حق ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کریں[3]، صحابہؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے[4]، ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں، اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے[5]

---

[1] صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ وسنن ابی داؤد، اوائل کتاب الجنائز [2] ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز [4] ایضاً

اس کی مغفرت کے لئے بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہیں[1]، یہ بھی آیا ہے کہ جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے[2]، فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لئے جائے، تو اُس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے، اور اُس کو تسلی اور دلاسا دے، اور اُس کو شفا پانے کے لئے خدا سے دعا کرے[3]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم سے صحابۂ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی، آپ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے[4]، منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں[5]، اور اسی سے علماء نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے[6]،

حضرت سعد بن معاذ رضؓ جب زخمی ہوئے تو آپ نے اُن کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا تاکہ بار بار اُن کی عیادت کی جا سکے[7]، رفیدہ رضؓ ایک صحابیہ تھیں، جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور اُن کی خدمت کیا کرتی تھیں، اُن کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا، تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمار داری اور مرہم پٹی کریں[8]، غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بیبیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں، جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں[9]، آپ نے ان چیزوں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو[10]

[1] سنن ابی داود، کتاب الجنائز [2] صحیح مسلم باب عیادۃ المریض بطرق مختلفہ [3] سنن ابی داود کتاب الجنائز
[4] صحیح بخاری کتاب الجنائز [5] ایضاً [6] مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادہ [7] سنن ابی داود کتاب الجنائز
[8] سیرۃ ابن ہشام غزوہ بنی قریظہ و ادب المفرد، بخاری باب کیف اصبحت، اصابہ ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہ رضؓ کا حال پڑھیے، [9] صحیح مسلم غزوۃ النساء [10] مسند احمد ص ۳۹۴ ج ۲

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرزِ ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی، وہ کہے گا "اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا پروردگار تھا میں تیری عیادت کیونکر کرتا، فرمائیگا کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔"[1]

تعلیم کی یہ طرزِ ادا، بیمار پرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غمخواری کی کیسی دلنشین تلقین ہے، اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے، اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے، اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں، جو ان بیماروں کی خدمت کرکے خدا کا قرب پاتے ہیں،

---

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے، ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے، یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے یعنی خود بادشاہ بن کر عیش وراحت، سیر و تفریح اور حکومت و شہنشاہی کے کام کیے، اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری، اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لئے، ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے، اور عربوں میں بھی اُن کے ساتھ یہی برتاؤ تھا، بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا، وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھا، کیونکہ اُس کو اپنی حفاظت کے لئے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے،

اسلام زیر دستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت

(صلی اللہ علیہ وسلم) نے جس معاہدہ فضول میں شرکت کی تھی، اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے، وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا، کہ ان زیردستیوں کی حفاظت اور حمایت کیجائے، اسی لئے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا، چنانچہ زید بن حارثہ، خباب بن الارت، بلال حبشیؓ، یاسر بنی عمارؓ صہیب رومیؓ، ابوفکیہہؓ، عامر بن فہیرہ، اور سالمؓ، غلاموں میں اور لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ ام عبیسؓ اور سمیہؓ لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں، اور زید بن حارثہ کے سوا جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سایہ میں پرورش پارہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں، اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں،

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جزء بنالیا تھا، غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورۂ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی جن کاموں کو گھاٹی بتایا گیا ہے، ان میں ایک "فک رقبۃ" گردن سے غلامی کی رسی کو کھولنا بھی ہے، چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی میں حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اہل ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید خرید کر آزاد کردیا تھا، مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا، تحریر رقبۃ یعنی گردن کو آزاد کرنا بہت سی فروگذاشتوں کا کفارہ قرار پایا، اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لئے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا، صحابہؓ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہوگئی حضرت حکیم بن حزام نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں اسلام کے بعد سو غلام آزاد کئے[1] حضرت

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان،

عائشہ رضؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد کئے، حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمان بن عوف رضؓ نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی، شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اُس کے بندوں کیساتھ نیکی کی جائے، ان بندوں میں سرفہرست جن لوگوں کے نام ہیں، ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ	اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی
شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	نہ بناؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی
وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ	کرو، اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں
وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ	کے ساتھ، اور عزیز پڑوسی، اور
الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ	بے گانہ پڑوسی کے ساتھ، اور پہلو
وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ	کے رفیق کے ساتھ، اور مسافر کے
اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا	ساتھ، اور اس کے ساتھ جس کے
يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا	تمھارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں، اُ
فَخُوْرًا ،	اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند
(نساء - ٦)	نہیں کرتا۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے لیکن اسلام نے اس کی بھی

لہ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب الہجرۃ ۲؎ یہ دونوں تعداد میں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق میں نقل کی ہیں،

ممانعت کردی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے بلکہ فتای میرا جوان کہے، اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ "وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں بلکہ مولیٰ کہیں"[۱]۔ اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا، اور فرمایا کہ "یہ جن کو تم غلام کہتے ہو، یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہاری تحت میں کر دیا ہے پس جس کو خدا نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے، تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کا اتنا کام نہ دیدو جو اس پر بھاری ہو جائے، اور جو بھاری کام بھی دو تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے"[۲]۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس حکم پر صحابہ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی[۳]، ان بے خانمان افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا کہ جس غلام کو جو آزاد کریگا، وہ اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار ہوگا[۴]، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا، کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو، جو ان کا حق ہو، وہ ان کا ہو اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ

---

[۱] صحیح بخاری کتاب العتق [۲] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب باب ما ینہیٰ عن السباب [۳] صحیح بخاری جلد دوم، کتاب الادب ما ینہیٰ عن السباب [۴] حدیث میں ہے اِنَّمَا الولاءُ لِمَن اعتق، ولا کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے، دوسری حدیث میں اوانتمیٰ الیٰ غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے، تو اس پر خدا کی لعنت، امام نووی شرح میں لکھتے ہیں، بَلْ هُوَ

بنالیں[1]، ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں، بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنادیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے جس کی تفصیل آیندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۴) لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولار کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے، (صحیح مسلم کتاب العتق)

[1] کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر ص ۲۳۵،

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدّن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹرانوں نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گذشتہ نظامِ تمدّن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی، اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدّن کے خمیر میں داخل ہے، اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے، تو کل وہ ہمارے ساتھ کریگا، گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں ہے لیکن، اہلِ عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا، مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھادیا،

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر سورہ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے،

هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ ضَیْفِ	(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی
اِبْرٰاھِیْمَ الْمُکْرَمِیْنَ ○	حکایت بھی تم تک پہنچی ہے، کہ جب (یہ
اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْہِ فَقَالُوْا	لوگ) اُن کے پاس آئے، تو (آتے ہی)
سَلٰمًا، قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ	سلام علیک کی، ابراہیم نے سلام کا جواب
مُّنْکَرُوْنَ ۔ فَرَاغَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ	دیا، (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ
فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ ○ فَقَرَّبَہٗٓ	اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں، پھر جلدی
اِلَیْھِمْ قَالَ اَلَا تَاْکُلُوْنَ	سے اپنے گھر جا (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی
فَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً ط	اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لئے
قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْہُ	لائے، اور ان کے سامنے رکھا تو انھوں
بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ○	نے تامل کیا، (ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ
	کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انھوں
	نے کھانے سے انکار کیا، تب) تو ابراہیم
	اُن سے جی ہی جی میں ڈرے، انھوں نے
	(اُن کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی
	طرح کا) اندیشہ نہ کریں، اور اُن کو
(ذاریات ۔ ۲)	ایک ہشیار فرزند کی خوش خبری دی

اس حکایت سے آدابِ مہمانداری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جا سکتے ہیں:

(۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہیے،

(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے کیونکہ "روغان" کے معنی سرعت کے ہیں،

(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں، اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر اُن کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے، کیونکہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے لیئے کچھ سامان کیا جا رہا ہے، تو وہ ازراہِ تکلف اس کو روکیں گے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے،

(۴) کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لئے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے تاکہ اُن کو آرام کرنے یا دوسری ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لئے اُن سے الگ ہو گئے،

(۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے اُسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا،

(۶) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے اُن کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیے اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے، یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیے،

(۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن اُن کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے، یا کم کھائے تاکہ وہ کھانا اُن کے اور اُن کے اہل و عیال کے کام آئے اسی لئے جب

اُن لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس کو ناپسند کیا، اور انکے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں،

(۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمان کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے، اسی لئے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے، تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ ہم لوگ کھا ہی نہیں سکتے، بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لئے آئے ہیں،

سورۂ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسایش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے اس لئے اگر کوئی شخص اُس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے، کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے اسی لئے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے،

قَالَ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ ضَیْفِیْ فَلَا	کہا یہ میرے مہمان ہیں تو ان کے بارے
تَفْضَحُوْنِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَلَا	میں مجھ کو فضیحت نہ کرو، اور خدا سے
تُخْزُوْنِ ، (حجر - ۵)	ڈرو، اور مجھے رسوا نہ کرو،

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارمِ اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمانِ کامل کا ایک جزو قرار دیا، اور فرمایا کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے

اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے"۔ کہا گیا کہ یا رسول اللہؐ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے، اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا[1]۔ نیز فرمایا کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے[2]"۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس تشریف لے گئے، اور فرمایا کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو، اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا بیشک۔ فرمایا ایسا نہ کرو، نماز بھی پڑھو، اور سو ؤ بھی، روزہ بھی رکھو، اور بے روزہ بھی رہو، کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے، اور تمہاری بی بی کا حق ہے[3]۔

ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے، پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے، چاہے وہ لے لے، چاہے چھوڑ دے[4]"۔

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لئے بہرحال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے، اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، اس لئے ضرورت تھی

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ [2] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ وقولہ تعالیٰ ضیف ابراہیم المکرمین [3] بخاری کتاب الادب باب حق الضیف، [4] ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف،

کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے، وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوانِ کرم سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی، اور اس پر بار پڑے گا[1]، اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی جس کو خود غیور اور خوددار مہمان پسند نہ کرے گا،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمته ایاه بنفسه،

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا، ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جاکر لیتے تھے، اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا، اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، ہر وقت چوکنا رہتا تھا، کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے، اور وہ دین کا رشتہ تھا، جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملادیا، دشمنوں کو بھائی بھائی بنادیا، اور خاندانی اور قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کردی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کردیا، اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلادیا کہ وہ درحقیقت بھائی بھائی ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ — اے مسلمانو! خدا سے ڈرو، جیسا کہ

حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا	اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور نہ تم
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا	مرد لیکن مسلمان، اور خدا کی رسّی
بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا	سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو
وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، اور تم اپنے
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ	اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ	دشمن تھے، تو اللہ نے تمہارے دلوں
اِخْوَانًا ۝ (آل عمران)	کو جوڑ دیا، پھر تم بھائی بھائی ہو گئے،

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا، اور ارشاد فرمایا، کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا، تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا،

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ	اور خدا نے مسلمانوں کے دل ملا دئے
مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ	اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ
بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	کر دیتا، تب بھی تو ان کے دلوں کو
اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ	ملا نہ سکتا، لیکن خدا نے ملا دیا، بیشک
	وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا اور
(انفال - ۸)	مصلحت جاننے والا ہے،

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں اور سب ملکر خدا کے

دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے، مضبوط پکڑیں، اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں، کیونکہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہی جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں، فرمایا،

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا	اور اللہ اور رسول کا کہا مانو اور آپس
تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ	میں جھگڑا نہ کرو، (کہ ایسا ہوگا تو)
رِیْحُکُمْ،	ہمت ہار دو گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ
(انفال - ۶)	جائے گی،

یہی باہمی اتفاق و اتحاد، ملت اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہی، اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت ہو، اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آجائے تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہو کہ دونوں خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں،

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ	تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات
اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ ۝	میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول
(نساء - ۸)	کی طرف لوٹا دو،

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہی کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں، اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرا دیں،

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ

(حجرات - ۱)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے، تو ظلم کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو تو اگر وہ رجوع کرے، تو اُن میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو، اور انصاف کرو، خدا منصفوں کو دوست رکھتا ہے، مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں، تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو،

آیت کے آخری ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے، یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا، انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا

(بخاری - مظالم)

تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم،

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اُس کی مدد کی جا سکتی ہے،

لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا اس طرح کہ اُس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے،

کیسا ہی بڑا سے بڑا کافر، اور سخت سے سخت دشمن ہو، جس وقت اُس نے کلمۂ شہادت پڑھا، اور شریعتِ اسلامی کو قبول کیا، وہ دفعتہً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا، خدا نے فرمایا،

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ	تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلیں
وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ	اور نماز کھڑی کریں، اور زکاۃ دیں
فِی الدِّیْنِ ط (توبہ۲)	تو وہ تمھارے مذہبی بھائی ہیں،

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا، اگر اس کے باپ کا نام ونسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں، وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا، :-

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْا اٰبَآءَھُمْ	تو اگر تم اُن کے باپوں کے نام نہ جانو
فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ	تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں، اور
مَوَالِیْکُمْ ۔ (احزاب۔۱)	علاقہ مند،

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دیکر اُس کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے :-

فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ،	تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے

شَیْءٌ ٥ (بقرہ - ۲۲) کچھ معاف کر دیا جائے،

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے، کیونکہ

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ — کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ

اَخِیْهِ مَیْتًا ٥ (حجرات - ۲) — اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے،

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا، متولیوں کا فرض ہے، اور اگر وہ اُن کو اپنے اندر شامل کرکے نیک نیتی کے ساتھ اُن کو اپنے کنبہ کا جزو بنا لیں اور ملا جلا کر خرچ کریں، تو یہ بھی درست ہے، کیونکہ یہ اُن کے بھائی ہیں جن کی خیر خواہی اُن کا فرض ہے، فرمایا:-

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ — اور اگر تم اُن کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی

(بقرہ - ۲۷) — جائز ہے کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں،

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں، وہ یوں کہتے ہیں،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا — اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے

الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ — اُن بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان

(حشر - ۱) — لائے، معاف کر،

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی بُرائی ہے جس کے دور کرنے کے لئے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہئے اور کہنا چاہئے،

وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (حشر - ۱)

اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے، اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے،

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں، خدا نے مدح فرمائی،

رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ۝ (فتح - ۴)

وہ (مسلمان) آپس میں رحم و شفقت رکھتے ہیں،

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہیئے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے،

اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (مائدہ - ۸)

مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے،

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے "مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اسکے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں" صحیح مسلم

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۸۳ کتاب الادب و صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۰۹ کتاب البر والصلۃ والادب، مصر

کی ایک اور روایت میں ہو کہ فرمایا "سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دُکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہی، اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے"[1] مقصود یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ ایک جسم ہے، اور اُس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں، بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف ہو یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں، اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہیے کہ اُن میں سی ایک کو بھی تکلیف پہونچے، تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے

ایک دوسری تمثیل میں آپنے ارشاد فرمایا کہ "مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں، جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصّہ سے اس کا دوسرا حصّہ مضبوط ہوتا ہی"[2] بخاری میں ہو کہ یہ کہہ کر آپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا، کہ کیسے ایک حصّہ سے دوسرا حصّہ مضبوط ہوتا ہی، اس تمثیل میں آپنے ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابلِ تسخیر حصن وحصار بن جاتی ہے، اسی طرح جماعتِ اسلامیہ ایک قلعہ ہے، جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے، یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے، جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آجائے گی،

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۰۹ مصر کتاب لبر والصلۃ والادب [2] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ ص ۸۹۰ و صحیح مسلم کتاب لبر والصلۃ والآداب جلد ۲ ص ۳۰۹ مصر،

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اُس پر ظلم کرے، نہ اُس کو بے مدد چھوڑے اور نہ اُس کی تحقیر کرے، انسان کے لئے یہ بُرائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، مسلمان کا ہر حصّہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون، اُس کا مال اور اُس کی آبرو۔"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اُس پر ظلم کرے، اور نہ اس کو اُس کے دشمن کے حوالے کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہیگا تو خدا اُس کی ضرورت پوری کریگا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کریگا، تو خدا اُس کے بدلہ قیامت میں اُس کی تنگی کو دور فرمائے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کریگا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔"[2]

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کریگا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کریگا، اور جو کسی تنگدست پر آسانی کریگا، تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کریگا، اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا، تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اُس کا پردہ رکھے گا، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔"[3]

---

[1] صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ ص ۳۰۲ مصر [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب جلد ۲ ص ۱۹۰ [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب جلد ۲ ص ۱۹۴

فرمایا "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں"[۱] یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے، دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے، فرمایا "جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں"[۲] یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا، وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔

جریر بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے، کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیرخواہی کرنا"[۳] کئی روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا، خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے اور اس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے"[۴] یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے، اور جو اس کے خلاف کرتا ہے، وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا، اور یہ ایک معنی میں خدا کا انکار ہی ہے، چنانچہ اسی لئے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے، جو کافروں کے لئے مخصوص ہے، فرمایا "کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے، الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے"

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا	اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل
فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا	کریگا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے وہ

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶ [۲] صحیح بخاری کتاب الایمان جلد ۱ ص ۶ وصحیح مسلم کتاب الایمان جلد ۱ ص ۳۶، مصر [۳] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳،

[۴] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲ و جلد ۲ ص ۸۹۳،

وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ	اس میں پڑا رہے گا، اور خدا اس پر
وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ۔	خفا ہوا، اور لعنت کی، اور اس کیلئے
(نساء - ۱۳)	بڑا عذاب تیار کیا،

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا، پھر فرمایا، "دیکھو میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو[1]" ایک اور موقع پر فرمایا کہ "جو ہم (مسلمانوں) پر ہاتھ اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں[2]"

جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا "سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے[3]" اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو، تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا "جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑیگا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو، اور اس کی آبرو جاتی ہو، تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اوس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا[4]"

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہوجائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ "کسی مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ص ۲۳۔ [2] صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ ص ۱۰۴۰۔ [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۸۹۔ [4] ایضاً،

کر وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ اُدھر منہ پھیر لے، اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہو کہ جو پہلے سلام کی ابتدا کرے[۱]" ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہو کہ آپ نے فرمایا "آپس میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہو، اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ، اور کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے[۲]"

ایک مسلمان کے لئے اُس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اُس کے ایمان کا ہے، قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہار اسلام کے لئے سلام کرے تو اُس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں،

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ	اور اس کو جو تمہاری طرف سلامتی
السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًاۚ	کا کلمہ ڈالے، یہ نہ کہو کہ تو مومن
(نسآء - ۱۳)	نہیں،

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں، ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پاکر حملہ کیا، اُس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا، مگر اس پر بھی اُن صحابی نے اُس کو قتل ہی کر دیا، یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچی، آپ نے اُن کو بُلا کر دریافت کیا، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ اُس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپ نے کس بلیغ انداز میں

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۹۲۱، و سنن ابی داؤد کتاب الادب جلد ۲ ص ۱۹۲ [۲] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ ص ۸۹۶،

فرمایا "تم اس کے لا الہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے"۔ ایک روایت میں ہے کہ فرمایا "کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا"[1]

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ "مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا، اس کے قتل کے برابر ہے"[2] یہ بھی فرمایا کہ "جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے، تو وہ کفر دونوں میں سے ایک پر لوٹے گا"[3] یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا، تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا، اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے۔

جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ "جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مار یگا، تو خدا اس کے لئے دوزخ واجب اور جنت حرام کریگا، ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی، فرمایا "درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو"[4]

فرمایا "ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، اس کے چھینکنے پر خدا تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا، اور مرجائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا"[5] یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں، جن سے دو مسلمانوں کے

---

[1] پہلی روایت صحیح بخاری غزوۂ حرقات اور کتاب الدیات میں ہے، دوسری روایت کے لئے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور [2] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ ص ۸۹۳ [3] ایضاً ص ۹۰۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۴۳ مصر [4] صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۵ مصر [5] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۲۰۱

درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، ارشاد ہوا کہ جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے[1] حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی ایمان و اخلاص کیساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے، اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے، تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے جن میں سے ہر رتی احد کے پہاڑ کے برابر ہوگی[2] یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانہ پر ہوگی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کے کا حکم رکھتا ہے،

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا، اس برادرانہ الفت و محبت کے فروع ہیں، جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا۔ اسی لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کیلئے وہی نہ چاہے، جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے[3]، الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا[1] مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے، اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو دور کرتا ہے، اور اس کے

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۰۰ کتاب البر والصلۃ،

[2] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲۔

[3] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۶،

پیچھے سے اس کی حفاظت کرتا ہے[1]

دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں، جیسی آج ہیں، ہر جماعت ان ہی اصولوں پر دنیا میں بنی ہے، اور آئندہ بھی بنے گی،

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲، تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اُس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے، اور یہ انسانی خیرخواہی کا لازمی نتیجہ ہے،

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے

وَقُوْلُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ۔۱۰) اور لوگوں سے اچھی بات کہو،

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانیت کا فرض ہے، جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر

عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی، (مائدہ-۲)

آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو، کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے،

ہر قسم کا برا سلوک اور بیرحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لئے آمادہ رہتا ہے، یہ آیت پاک انسان کے اسی مادۂ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے، ابوہریرہؓ اور انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا۔ (بخاری-۲)

آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بنجاؤ،

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں،

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکانوا عباد اللہ اخوانًا، (بخاری)

ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو نہ ایک دوسرے پر حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے خدا کے بندو آپس میں بھائی بھائی بنجاؤ،

اس حدیثِ پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعۃً جنت بن جائے فرمایا مَنْ لَا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ (بخاری) جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا" جو بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا رحم نہیں کرتا، یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا، دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کریگا" مستدرک حاکم میں ہے، کہ آپنے فرمایا "تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائیگا"[1] یہ حدیث رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کیساتھ ظاہر کرتی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگائیگا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائیگا اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملیگا" (بخاری) اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے، ایک دفعہ آپنے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کیساتھ نیک سلوک کیا تھا، کہ اُس کو اُس کے اس کام پر ثواب ملا، صحابہؓ نے پوچھا اے خدا کے رسول! کیا جانوروں کیساتھ نیک سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے فرمایا؛ ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے، یعنی ہر اُس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے، نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے"[2] (بخاری) اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے،

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا: جہاں بھی ہو خدا کا خیال رکھو، بُرائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دوگے، اور لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آؤ (ابواب البر باب ما جاء فی معاشرۃ الناس ص ۳۳۱) ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور نے

---

[1] مستدرک حاکم کتاب البر والصلۃ جلد ۴ صفحہ ۱۵۹، [2] یہ حدیثیں صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب میں مختلف ابواب میں ہیں۔

پانچ باتیں گنائیں، جن میں سے ایک یہ تھی. کہ واحب للناس ما تحب لنفسک "یعنی تم لوگوں (ناس) کے لئے وہی چاہو، جو تم اپنے لئے چاہتے ہو، تو مسلمان بن جاؤ گے"۔ الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو، انسان پورا مسلمان نہیں بنتا،

کیونکہ دوسروں کے لئے وہی چاہنا جو اپنے لئے چاہو، اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے، ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ "تم اپنے بھائی کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو"، بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے، اور ایک عام انسان بھی، توراۃ اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ "تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو"، اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علٰحدہ باب میں گذر چکا ہے، اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہئے کہ صحابۂ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے،

صدقہ و خیرات کے باب میں گو فقراء اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی بات ہے، تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا، قاضی ابویوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا، جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا، اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی، اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی

سلہ ترمذی ابواب الزہد غریب،

ضرورت پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہوں، حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے، اور اپنے گھر سے اُس کو کچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا، اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو، خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے، اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں، اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں، قرآن میں صدقہ کی اجازت فقرا، اور مساکین کے لئے ہی فقرا، تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں، اور یہ لوگ مساکین اہل کتاب میں ہیں، اُن سے جزیہ نہ لیا جائے[۱]،

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہی کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلمانوں کو دیئے جا سکتے ہیں[۲]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام تبایا، ابن جریج محدث کہتے ہیں کہ قرآن[۳] نے اسیر کے کھلانے کو ثواب تبایا ہی، اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے، ابو میسرہؓ اور عمرو بن میمون اور عمرو بن شرحبیل صدقۂ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے[۴]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا[۵]، اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعضوں کو انکے مشرک والدین کیساتھ صلۂ رحمی کی اجازت دی[۶]،

تفسیر کی روایتوں میں ہی کہ صحابہؓ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے

[۱] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۲، [۲] مصر[۲] سورۂ دہر۔ [۳] کتاب الاموال امام ابو عبیدہ ص ۶۱۳ و ۶۱۴ [۴] بخاری کتاب الجمعہ [۵] مسلم باب فضل الصدقۃ علی الاقربین،

کنارہ کرنے لگے، تو یہ آیت اُتری[1]،

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۚ (بقرہ ۳۷-۲۷۲)	ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے، اور جو بھلائی خرچ کرو وہ تمہارے ہی لئے ہے

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہر حال ملیگا،

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا،

لا یومن احد کو حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ وحتی یحب المرء لا یحبہ الا اللہ عز وجل (جلد ۳ صفحہ ۲۷۲)	تم میں سے کوئی اس وقت پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی نہ پسند کرے، جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے،

اس حدیث میں محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کردی گئی ہے،

[1] طبری

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اُس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے، اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم اُن کو کھا جاؤ، اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رُک جاتا، وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست و احباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعارِ عرب میں موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے، اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے، اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا، ایسے جانور کو بلیّہ کہتے تھے، اسلام آیا تو اُس نے سنگدلی کو مٹا دیا، عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا، کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا، اور عام حکم دیا

کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے[۱] ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا، اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لیکر اُس کے خاندان میں آئے، اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ سے جانور یا کسی جاندار کو نشانہ بنانیکی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گذر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے جو لوگ ایسا کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ملعون قرار دیا ہے[۲] اس بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے[۳] یہ ایک خاص صورت تھی لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی اُن کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی[۴]

بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا[۵] ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر گنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا، تو خدا اُس کے متعلق اس سے بازپرس کریگا، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے پھینکدے[۶] اس حدیث سے معلوم

---

[۱] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء فی کراہیۃ اکل المصبورۃ ص ۲۵۵ [۲] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [۳] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء ما قطع من الحی فہو میت [۴] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [۵] مستدرک حاکم جلد ۴ ص ۲۳۳ [۶] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۵۰

ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا، اور وہ درندہ بھی نہیں اُن کا مارنا جائز نہیں
سنن نسائی میں ہے کہ "جو شخص کنجشک کو بلا ضرورت ماریگا وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد
کریگی کہ فلاں نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے اس سے کوئی فائدہ نہ تھا"[۱] جو جانور کوئی نقصان
نہیں پہنچاتے، یا اُن سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہونچتا ہے اُن کا مارنا بھی جائز نہیں چنانچہ
آپنے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے[۲]

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں، اُن کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی
ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض
کیا ہے اس لئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقہ سے مارو، اور جب ذبح کرو تو اچھے
طریقہ سے ذبح کرو، تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کرلے، اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے[۳]
ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو
مجھے اس پر رحم آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، فرمایا اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو
تو خدا تم پر رحم کریگا[۴] یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دیکر جانوروں کے ذبح
کرنے کی ممانعت فرمائی[۵]، کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر پتھر یا غلیل چلانے
کی بھی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہوسکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا، البتہ اس سے
دانت ٹوٹ سکتا ہے، اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[۶] مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی

---

[۱] نسائی کتاب الضحایا ص ۷۰، [۲] مشکوٰۃ کتاب الصید الذبائح ص ۳۶۲ [۳] مسلم کتاب الصید الذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ [۴] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۴۳۶ [۵] نسائی ۲، ۶ [۶] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقہ،

صدمہ پہنچانا جائز نہیں، جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں اُن کا اصل سبب تھا کہ اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہی اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذارسانی ایک شرعی جرم ہی اسی طرح جانوروں کی ایذارسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے،

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپنے فرمایا کہ اس پر صرف اسلئے عذاب ہوا کہ اُس نے ایک بلّی کو باندھ دیا، اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا، اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مرگئی[۱]، بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں، اسلئے وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ گنہگار ہیں، چنانچہ آپنے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کیساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو، اگر خدا اُن کو معاف کردے تو سمجھو کہ اُس نے تمھاری بکثرت گناہ معاف کردیئے[۲]،

ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحبنے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہی جہاں زمین میں یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپنے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہی؟ اُن صاحب نے کہا یا رسول اللہ! یہ میں نے کیا ہی، آپنے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ[۳]، (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو، یا جل نہ جائیں)

ایک حدیث میں ہی کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اُترے تو اُن کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا

---

[۱] بخاری کتاب الانبیاء ص ۴۹۵ [۲] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۴۴۱ [۳] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۳۹۶ عن عبد اللہ ابن مسعودؓ،

انھوں نے پہلے اپنا سامان اُس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیوں کو جلادیا، اس پر خدا نے اُن کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا[۱] یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا، ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابۂ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے چڑیا فرطِ محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اُس کو بے قرار کیا ہے، اس کے بچوں کو چھوڑ دو، صحابۂ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلادیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا، تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کیلئے سزاوار ہے[۲]۔

اسی طرح اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، بعینہٖ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے، اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا، کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کیلئے پانی کے جو حوض بنائے ہیں ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہیں، اگر میں اُن کو پانی پلادوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملیگا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب[۳] ملتا ہے"

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جارہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی، اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا، اور اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک

---

[۱] بخاری جلد اول کتاب بدء الخلق صفحہ ۴۶۷ [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار [۳] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء

کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہی اور کیچڑ چاٹ رہا ہی اُس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اُس پر ترس کھایا، اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا، اور اُس کو پلایا، خدا کے نزدیک اُس کا یہ عمل مقبول ہوا اور خدا نے اُس کو بخش دیا، صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سُنا تو بولے کہ یا رسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہی؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجبِ ثواب ہی[1]، صرف جانداروں ہی تک نہیں، بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بنایا، اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہی یا کھیتی باڑی کرتا ہی، اور اُس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہی، تو یہ ایک صدقہ[2] یعنی ثواب کا کام ہی،

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے یعنی :-

۱- جو جانور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اُس سے وہی کام لینا چاہئے چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کیلئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں، صرف کھیتی باڑی کیلئے پیدا کیا گیا ہوں[3]، نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ خدا نے اُن کو تمھارا فرمانبردار صرف اسلئے بنایا ہی کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہونچ سکتے تھے، تمھارے لئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہی اپنی ضرورتیں اسی

۱؎ بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم ۲؎ بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ،

۳؎ بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ،

پوری کرو[1]، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیے،

(۲) جانوروں کے آرام و آسایش کا خیال رکھنا چاہیے چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ، اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اُس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ[2] تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے۔

ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، اُن پر سوار ہو تو اُن کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو، اور اُن کو کھاؤ تو اُن کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ[3]،

ایک بار آپ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لئے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا، جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ کر بلبلایا، اور آب دیدہ ہوگیا، آپ اس کے پاس گئے، اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا، یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الوقوف علی الدابۃ [2] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس، فی الطریق [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم،

نوجوان نے آکر کہا کہ "میرا یا رسول اللہ" ! فرمایا اس جانور کے بارہ میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے، خدا سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو، اور اس پر جبر کرتے ہو[۱]،

۳ - جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا[۲]،

۴ - جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا[۳]، کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں،

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے، تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے، وہ کتنا نرم ہے، اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے،

---

[۱] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سم الدواب [۳] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم،

فضائلِ اخلاق

اخلاقِ حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں، کہ اُن کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکمائے اخلاق نے اُن کی دو قسمیں کی ہیں، ایک اُمہاتِ اخلاق اور دوسری فروعِ اخلاق، اُمہاتِ اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں، اور جن میں کمی وبیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے اعتدال سے فضائلِ اخلاق کا وجود ہوتا ہے،

اُن کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوتِ عقلیہ، قوتِ شہوانیہ اور قوتِ غضبیہ، قوتِ عقلیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوتِ شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے، اور انہی کے عدمِ اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھران دونوں قسموں کے اختلافِ مدارج سے اچھے اور بُرے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں،

یہ تقسیمیں محض فلسفیانہ ہیں یا یوں کہئے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں، بلکہ عملی ہے، کیونکہ اُس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں

بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لئے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے، اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا، اور بُرے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لئے اپنی تعلیم میں اس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے، اور یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے،

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اور وہ بُرا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے، اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے، اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے، اس میں عقلی بُرائیاں اور خلقِ خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں، وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے، یہ فضائل کہلاتے ہیں، اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہیں، ہم نے اوپر اخلاق اور محبتِ الٰہی" کے عنوان میں وہ آیتیں لکھدی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے،

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے، اُن کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہیں، اور قرآنِ پاک اور احادیثِ شریفہ میں جابجا اُن کی تصریح ہے لیکن اُن کے بیان میں اخلاقِ شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لئے اُن کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے،

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل مین سب سے پہلے اُس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہئے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو، اور جس کے ساتھ رسولون اور پیغمبرون کی توصیف اکثر کی گئی ہو، اور مسلمانون کو اُس سے متصف ہونے پر کتاب الٰہی اور پیام نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہو، اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیون کی بنیاد ہو،

گو اس معیار کو سامنے رکھکر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے، اور غور وفکر کرنے والوں مین اس بارہ مین اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن جہان تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہی، اس مین کامیابی کی کوشش کرون گا،

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتون کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اور جن کو گنا کر اُس نے اپنے اچھے بندون کی توصیف کی ہے، یا اُن اوصاف والون کے لیے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآن پاک اور احادیث نبوی مین جابجا ان کی تفصیل ہے جیسے :-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ہ الَّذِیْنَ	ایمان والے مراد کو پہنچ گئے جو اپنی
هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ہ	نماز مین عاجزی کرتے ہین جو بیکار
وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	باتون کی طرف رُخ نہین کرتے،
وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوْنَ	جو زکوٰۃ دیتے، اور اپنی شرمگاہون
وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	کی حفاظت کرتے ہین، لیکن اپنی
حٰفِظُوْنَ ہ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ	بیویون سے اور اپنی (شرعی) باندیون

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَ
الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى
صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ
الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

(مومنون ۱)

سے کہ اُن پر کوئی الزام نہین، تو جو
اس کے سوا کے خواہان ہون تو وہی
حد سے بڑھنے والے ہیں، اور وہ جو
اپنی امانتون اور اپنے عہد کا لحاظ
رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازون کے
پابند ہین، یہی اصلی وارث ہین جو
فردوس کے وارث ہون گے اور
وہ اس مین ہمیشہ رہیں گے،

ان آیتون مین جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہین نکمّی اور بے کار باتون سے کنارہ کشی عصمت اور پاکدامنی، امانت داری اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ
الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ
وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ

اور لیکن اصلی نیکی اس کی ہے جو اللہ پر
اور آخرت پر اور فرشتون پر اور کتاب الٰہی
پر اور پیغمبرون پر ایمان لایا، اور اپنا مال
اس کی محبت کے ساتھ رشتہ دارون کو
اور یتیمون کو اور غریبون کو اور مسافر کو اور
مانگنے والون کو اور گردنون کو چھڑانے
مین دیا، اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی اور

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا	اپنے قول کو جب انھون نے اقرار کرلیا
عَاهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي	پورا کرنے والے، او مصیبت مین اور
الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ	تکلیف مین اور لڑائی کے ہل چل کے
الْبَاْسِ ط (بقرہ - ۲۲)	وقت ثابت قدم رہنے والے،

ان آیتون مین جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں، وہ یہ ہین، سخاوت، قول و قرار کو پورا کرنا اور مشکلون مین ثابت قدمی،

سورۂ آل عمران مین ہے،....

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَ	ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے
وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ ۔	والے اور (خدا کی) فرمانبرداری کرنے
(آل عمران - ۲)	والے او خدا کی راہ میں خرچ کرنیوالے

اس آیت مین ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ مین ان منفقون کا حال ہے، جو خدا کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہون گے،

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ	جو خوشحالی اور تنگ دستی دونون حالتون
وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ	مین (خدا کے نام) خرچ کرتے ہیں، اور
وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ	غصہ کو روکتے، اور لوگون کو معاف کرتے
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔	ہین، اور اللہ نیکی کرنے والون کو
(آل عمران - ۱۴)	دوست رکھتا ہے،

اس اوپر کی آیت مین فیاضی، عفو و درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہی سورۂ معارج مین ہی

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ	اور جن کے مال مین مانگنے والے، اور
مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ وَ	مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے، اور جو
الَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ	روز جزا کو سچ مانتے ہین، اور جو اپنے
وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم	رب کے عذاب سے ڈرتے ہین، بے شبہہ
مُّشْفِقُونَ ۝ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ	اُن کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز
غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ	نہین، اور جو اپنی شرمگاہون کی حفاظت
لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ	کرتے ہین، مگر اپنی بیویون اور شرعی
أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ	باندیون سے، کہ اس مین اُن پر کوئی
فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغَىٰ	ملامت نہین، جو اس کے علاوہ چاہین،
وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ	وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہین، اور
الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ	جو اپنی امانتون کا اور اپنے عہد کا
لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (معارج-۱)	پاس کرتے ہین، اور جو اپنی گواہیون
وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ	پر قائم رہتے ہین،

ان آیتون مین سخاوت نفس، عفت و عصمت، امانتداری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتون مین شمار کیا ہے، جو اُس کے جنت مین جانے کی سبب ہوئی ہین،

سورۂ احزاب مین اُن مردون اور عورتون کا ذکر ہے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشایش

اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے،

وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں
وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ	صبر کرنے والے، اور صبر کرنے والیاں
وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ	اور عاجزی کرنیوالے اور عاجزی کا کرنیوالیاں
وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ	اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں
وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ	اور روزہ رکھنے والے، اور روزہ رکھنے
وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ	والیاں، اور اپنی شرمگاہوں کی
وَالْحٰفِظٰتِ ۔	حفاظت کرنے والے، اور حفاظت
(احزاب۔ ۵)	کرنے والیاں،

ان میں سچائی، صبر، عاجزی اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے،

سورۂ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے،

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ	(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ
یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا	ہیں جو زمین پر ہولے چلتے ہیں اور
وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ	جاہل جب اُن سے (جہالت کی) باتیں
قَالُوْا سَلٰمًا (ع ۶)	کریں تو وہ کہیں سلامت رہیئے،
(۲) وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ	(۲) اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو

ــه یا سلام کہیں،

يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ	فضول خرچی کرین اور نہ تنگی کرین بلکہ
بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (فرقان ۷۰)	دونون کے بیچ کی راہ ہو،
(۳) وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِي	(۳) اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان
حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (۷)	نہین لیتے، اور نہ بدکاری کرتے ہین،
(۴) وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ	(۴) اور جو جھوٹی گواہی نہین دیتے،
الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا	اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے
كِرَامًا (〃)	گذرین تو شریفانہ وضع سے گذر جائین،

پہلی آیت مین عاجزی اور فروتنی اور بردباری، دوسری آیت مین اعتدال اور میانہ روی تیسری میں عدم ظلم، اور عفت، اور چوتھی مین سچائی، اور متانت و سنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ رعد مین وہ صفتین بتائی گئی ہیں، جو عقبیٰ مین کام آئیں گی،

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا	جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہین،
يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَ	اور قول کو توڑتے نہین، اور جس کے
الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ	جوڑنے کو خدا نے کہا ہے، اُس کو
بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ	جوڑے رکھتے ہین، اور اپنے مالک
رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ	سے ڈرتے ہیں، اور بُری طرح حساب
الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا	ہونے سے سہمے رہتے ہیں اور جنھون نے
ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا	اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا، اور

الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ	نماز کھڑی کی، اور ہم نے جو اُن کو دیا، اس ہے
سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ	چھپے اور کھلے، (اچھے کامون مین) خرچ
بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ	کیا، اور بُرائی کو بھلائی سے دور کرتے
عُقْبَی الدَّارِ (رعد-۳)	ہین، انہی کے لیے پچھلا گھر ہے،

اس ایفاے عہد سے وہ بھی مراد ہوسکتا ہے، جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جاسکتا ہے، جو خدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے، اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہلِ قرابت اور حقدارون کے حقوق ہین، ان دو کے سوا ان آیتون مین انکی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگون سے بھلائی کرتے ہین، یا یہ کہ بھلائی کرکے بُرائی کو دھو دیتے ہین

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُھَا	اس پچھلے گھر کو ہم اُن کے لئے کرین گے،
لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ	جو زمین مین غرور، اور فساد کرنا نہین
وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ	چاہتے، اور آخر انجام پرہیزگارون
(قصص-۹)	کے لئے ہے،

یعنی غرور و نخوت نہین کرتے،

وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ	اور جو بڑے گنا ہون اور بے حیائی
وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ	کے کامون سے بچتے ہین، اور جب
یَغْفِرُوْنَ۔ (شوریٰ-۴)	انھین غصہ آتا ہے، تو معاف کردیتے ہین

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہین ہوتے، اور معاف کردیتے ہین،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (مائدہ ۶) بیشک اللہ انصاف والون کو پیار کرتا ہے،

عدل و انصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہئے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ بے شک اللہ نیک کام کرنے والون کو پیار کرتا ہے، (بقرہ - ۲۴)

اس پیار اور محبت کے استحقاق مین ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے،

حدیثون مین جن اخلاقی فضیلتون کا بیان ہے، وہ متفرق طور سے پچھلے صفحون مین گذر چکی ہین، اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئین گی،

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سر فہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے، اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آجاتی ہیں،

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں، اس کا دل ہر برائی کا گھر ہوسکتا ہے، اور جو سچا ہے، اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے، کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں، ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں، ان میں سے جس ایک کو فرمایئے آپ کی خاطر سے چھوڑ دوں، ارشاد ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو، چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا، اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا، اور پھر بدکاری

کے لیئے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گذرا کہ صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی، اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دون گا، اگر ہان کہون گا تو شراب اور زنا کی سزا دیجائے گی، اگر نہین کی تو عہد کے خلاف ہوگا، یہ سوچ کر ان دونون سے باز رہا، جب رات زیادہ گذری، اور اندھیرا خوب چھاگیا تو چوری کے لئے گھر سے نکلنا چاہا، تو پھر اسی خیال نے اُس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ کچھ ہوئی تو کیا کہون گا، ہان کرون گا تو ہاتھ کٹے گا، اور نہین کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے، اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا، صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمتِ نبویؐ مین حاضر ہوا، اور عرض کی یارسول اللہ جھوٹ نہ بولنے سے میری چارون بُری خصلتین مجھ سے چھوٹ گیئن، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسرور ہوئے،

یہ روایت سند کے رو سے کتنی ہی کمزور ہو مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی بُرائیون سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا وہ بُرائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا، ایماندار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل مین نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اُس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگون کو اس کے قول وفعل پر اعتبار

لہ اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورۂ ن مین کتب سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہین معلوم ہوا،

ہوگا، جو کہے گا، کرے گا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی،

صدق، صفاتِ ربانی مین سب سے بڑی صفت ہے، خدا سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے قیامت کے وعدہ کے سلسلہ مین خدا آپ فرماتا ہے،

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًاه (نساء-۱۱) اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات مین"

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد ہے،

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ	وعدہ کیا اللہ نے سچ، اور کون ہے اللہ
مِنَ اللّٰهِ قِيْلًاه (نسآء-۱۸)	سے زیادہ سچا بات مین،

خدا سچا ہے، اس لیے اسی کی ساری شریعت سچی ہے، فرمایا:-

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ه (انعام-۱۸)	اور ہم ہین سچے،
قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ	کہدو (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو
اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًاه (آل عمران-۱۰)	ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو،
وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ	اور جو سچائی کو لے کر آیا، اور اس
صَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ	سچائی کو سچ مانا، وہی تو پرہیزگار
الْمُتَّقُوْنَ (زمر-۴)	ہین،

اس آخری آیت مین "سچائی" سے گو مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے، مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگارون کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ

ہوتے ہین، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہین، اور اپنے ہر قول اور عمل مین سچائی کو پیش کرتے ہین،

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولون کے وعدون کو سچا ہوتے اپنی آنکھون سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں،

وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (احزاب ۳) اور خدا اور اُس کے رسول نے سچ کہا،

چونکہ رسول، خدا سے علم پاتے ہین، اس لئے وہ بھی سچے ہوتے ہین،

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یٰسین ۲) اور پیغمبرون نے سچ کہا،

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبرون کا سب سے پہلا وصف ہے، کیونکہ اُن کی ساری باتین، دعوے، تبلیغ اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہون تو اُن کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبرون کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّہٗ اور کتاب مین ابراہیم کا حال بیان کر

کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (مریم ۳) کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے،

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے،

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِدْرِیْسَ اِنَّہٗ اور کتاب مین ادریس کا حال بیان کر

کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (مریم ۴) وہ بڑے سچے اور نبی تھے،

حضرت مریمؑ جنھون نے اللہ کی باتون کے سچ ماننے مین ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا، اس وصف سے ممتاز ہوئین، فرمایا گیا،

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (مائدہ-۱) اور اُن (عیسیٰ) کی مان بڑی سچی تھین،

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر مین ایسے سچے نکلے، بندون کی زبان سے صدیق کہلائے،

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (یوسف ۶) یوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ اور کتاب مین اسمٰعیل کا ذکر کر،

كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ بے شبہہ وہ وعدہ کا سچا، اور بھیجا

رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ (مریم-۴) ہوا نبی تھا،

خدا کی خوشنودی والی جنت جن لوگون کو ملے گی، اُن مین وہ بھی ہون گے، جو دنیا مین دوسری صفتون کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے،

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ ۝ (آل عمران ۲) صبر کرنے والے اور سچے،

خدا نے جن لوگون کے لئے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہیں، اُن مین اسلام و ایمان اور خدا کی فرمان برداری کے بعد پہلا درجہ سچون اور راست بازون کا ہے، فرمایا:-

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ	بے شک اسلام قبول کرنے والے
وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	مرد اور عورتین، اور ایمان لانے والے
وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ	مرد اور عورتین، اور فرمانبردار مرد
وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	اور عورتین، اور سچے، مرد اور سچی
الآیہ	عورتین .. ..
اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا	خدا نے اُن کے لیے مغفرت اور بڑی
عَظِیْمًا ۝ (احزاب ۵۰)	مزدوری رکھی ہے،

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی مین ملے گا، اور وہ وہان ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے،

ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ (مائدہ) یہ ہو کہ سچے بندون کو انکا سچ کام آئے گا،

اس امتحان مین جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا، چنانچہ فرمایا،

لِیَجْزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیْنَ	تاکہ اللہ سچے اُترنے والون کو اُنکی
بِصِدْقِھِمْ ۝ (احزاب ۳)	سچائی کا عوض دے،

اسلام مین سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہین کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچون کا ساتھ دو، سچون ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو، اور ان ہی کی صحبت مین

رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو، کعب بن مالکؓ اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ نہ جا سکے تھے، ہر قسم کی تکلیفیں سہکر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا اس کی طرف اشارہ کرکے خدا فرماتا ہے،

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ	اے ایمان لانے والو، خدا سے ڈرو،
وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (توبہ ۱۵)	اور سچوں کے ساتھ ہو،

اہل تفسیر کے نزدیک یہاں اہل سچوں سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا، مگر بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم او صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے،

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں، جس کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں، بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں، اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں، بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی عمل میں سچائی، اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں، یعنی زبان کی سچائی،

دل کی سچائی اور عمل کی سچائی، —

زبان کی سچائی | یعنی زبان سے جو بولا جائے، وہ سچ بولا جائے، اور منھ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول وقرار کو نباہنا بھی اسی قسم مین داخل ہے، اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورۂ احزاب مین ایک آیت ہے،

لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ	تاکہ اللہ سچّون کو ان کی سچائی کا عوض
وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ الآيہ	دے، اور منافقون کو سزا دے اگر
(ع-۳)	چاہے .....

اس آیتِ پاک مین صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کے مختلف پیرایون مین ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا ہو سکتا ہے، پھر پوچھا کیا بخیل بھی ہو سکتا ہے، جواب دیا، ہو سکتا ہے، پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہو سکتا ہے، فرمایا نہین[۱]، کسی صحابی کہتے ہین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے، لیکن خیانت کاری

۱؎ موطا امام مالک باب ما جاء فی الصدق والکذب،

اور جھوٹ پر[۲] (نہیں) مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر بُرائی ہو سکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہو سکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لیئے ارشاد ہوا[۱] کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہو گا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگرچہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو[۲] ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس میں چار باتیں ہوں، وہ پکا منافق ہے، اور جس میں اُن میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اُس کو نہ چھوڑ دے، جب[۱] امانت اُس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب[۲] بات کرے جھوٹ بولے، جب[۳] کوئی قرار کرے، تو پورا نہ کرے، اور جب[۴] جھگڑے تو حق کے خلاف کہے[۵]" یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ "منافق کی علامتیں تین ہیں، جب[۱] کہے تو جھوٹ بولے، جب[۲] وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جب[۳] امین بنایا جائے، تو بے ایمانی کرے[۶]" صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے

---

[۱] عن ابی امامۃ عند احمد، وعن سعد بن ابی وقاص عند البزاز وابی یعلیٰ اور الطبرانی فی الکبیر والبیہقی من حدیث ابن عمر وقد روی مرفوعاً وموقوفاً [۲] مسند احمد عن ابی ہریرۃ وطبرانی، نیز مسند ابی یعلیٰ عن عمر بن الخطاب، یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب وترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لی گئی ہیں [۳] صحیح بخاری کتاب الایمان، صحیح مسلم وابوداود وترمذی ونسائی [۴] صحیح بخاری کتاب الایمان، وکتاب الادب وصحیح مسلم،

اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو[1]

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے، اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے، اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے، اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے، اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہانتک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے[2]

دل کی سچائی، صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے، اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں، اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لئے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آکر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے، اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی، لیکن چونکہ یہ اقرار اُن کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ، (منٰفقون - ۱)	اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں،

[1] صحیح مسلم [2] صحیح بخاری، کتاب الادب،

یعنی اپنی شہادت مین جھوٹے ہین، زبان سے تو یہ کہتے ہین کہ ہم اقرار کرتے ہین کہ آپ خدا کے رسول ہین، لیکن اُن کا یہ اقرار اور اُن کی یہ گواہی اُن کے دل کا اقرار اور گواہی نہین، اُن کے دل مین کچھ ہے، اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچّائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے جس کی بُرائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو، اور ظاہر کچھ اور کیا جائے، تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولتمند پیش ہون گے، اور ان ہر ایک اپنے علم و دولت اور جانبازی کے کارنامے بیان کرے گا، لیکن ان کارنامون کو سن کر خدا کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو، اور فرشتے بھی یہی کہین گے[1]، یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہین کئے گئے تھے، تاہم چونکہ اُن مین اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کئے گئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھوٹ کہا کہ اُن کے کارنامون کی حقیقی غرض خدا کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی کا خدا کے یہان کوئی معاوضہ نہین،

عمل کی سچّائی

عمل کی سچّائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو، یا یوں کہیے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہون، مثلاً ایک شخص نماز مین خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمائش ہے، تو یہ شخص ظاہر کرکے

---

[1] ترمذی کتاب الزہد باب الریا و السمعہ،

کھلا ہوا ریا کار اور جھوٹا ہے، لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھکر باریک ہے، ایک شخص نمایش کے لیے ایسا نہین کرتا، تاہم ظاہری طور پر اُس کی نماز سے جو خشوع وخضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن مین وہ خشوع وخضوع نہین ہے، اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہین کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال مین صادق نہین، اس لئے زبان کی سچّائی اور دل کی سچّائی کے ساتھ عمل کی سچّائی بھی ضروری ہے،

اسی لئے جن مسلمانون نے غیر متزلزل ایمان کے ساتھ خدا کی راہ مین جان و مال سے جہاد کیا، وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، خدا نے فرمایا،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا	مسلمان تو وہی ہیں، جو اللہ اور اس کے
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا	رسول پر ایمان لائے، پھر کسی طرح
وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ	کا، شک (و شبہہ) نہین کیا، اور
أَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ	اللہ کے رستے مین اپنی جان و مال سے
هُمُ الصَّادِقُونَ (حجرات-۲)	جہاد کیا، یہی سچے لوگ ہین،

یہ سچے اس لئے ٹھہرے کہ اُن کا یہ عمل اُن کی دلی کیفیت کا سچّا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اُس کی تصدیق کردی،

اس صدق عملی کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اُس مین کسی قسم کا ضعف و تردّد نہ پیدا ہو، مثلاً ایک شخص احکامِ الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے لیکن جب اُس کی آزمایش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہوجاتا ہے اس لئے

ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہین کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو، منافق لوگ اس امتحان مین پورے نہین اتر سکتے، کیونکہ عدم یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہین، چنانچہ اللہ تعالی فرماتا ہے،

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا	اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے
نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنزِلَتْ	ہین کہ (جہاد کے بارے مین) کوئی سورت
سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ	نازل ہو، پھر جب کوئی سورۃ اترتی
فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ	ہے، اس مین لڑائی کا تذکرہ ہو تو
فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ	(اے پیغمبر) جن لوگون کے دلون مین
إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ	(نفاق کا) روگ ہے، تم ان کو دیکھو گے
مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ	کہ وہ تمھاری طرف ایسے (خوفزدہ)
طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ	دیکھ رہے ہین، جیسے کسی پر موت کی
فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا	بیہوشی طاری ہو، تو ان پر تف ہو،
اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ،	(رسول کی) فرمانبرداری چاہیے، اور
	صاف وصحیح جواب دینا چاہیے اور جب
	بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے
(محمد - ۳)	رہین تو یہ ان کے حق مین بہتر ہے،

اس مرتبہ سے بڑھکر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و

قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے، اس کو وقت پڑنے پر پورا کرکے بھی دکھایا جائے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کرلے، اور اس مین کسی قسم کا ضعف نہ ہو لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اُس مین ضعف ظاہر ہو، اس لئے صحابۂ کرام مین جن لوگون نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کرکے دکھایا ہے، خدا نے اُن کو سچا کہا ہے،

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوۂ بدر مین شرکت کا موقع نہین ملا تھا، اس کی تلافی کے لئے انھون نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ مین شرکت کا موقع ملا، تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤن گا، چنانچہ اس کے بعد غزوۂ اُحد مین شریک ہوئے اور نیزے تلوار اور تیر کے تقریباً اسّی زخم کھاکر شہادت حاصل کی، ایفاے عزم کی یہ بہترین مثال تھی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اُن کی شان مین یہ آیت نازل فرمائی[1]۔

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	مسلمانون مین کچھ لوگ ایسے ہین کہ
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ	خدا کے ساتھ انھون نے (جان نثاری
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ	کا) جو عہد کیا تھا، اس مین سچے اترے
مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا	سو بعض تو، اُن مین سے ایسے تھے
بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا، لِیَجْزِیَ	جو اپنی پوری کر گئے (یعنی شہید ہوے)
اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ	اور بعض ان مین سے ایسے ہین جو

[1] بخاری تفسیر سورۂ احزاب،

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

(احزاب - ۳)

(شہادت کے) منتظر ہین اور انھون نے (اپنی بات مین) ذرا سا بھی تو ردوبدل نہین کیا، تاکہ اللہ سچون کو اُن کی سچائی کا عوض دے، اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا اُن کو معاف کرے، بیشک اللہ معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔

صدق عمل کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا حرف، دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگون کو صدیق کہا ہے، اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہین عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھون سے اس کا مشاہدہ کرتے ہین، بعض بعض صحابیون کے حالات مین اس کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "مین خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہون" آپ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تو تمھارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے "میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لئے رات کو جاگا کرتا ہون، (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہون (روزہ) گویا مین علانیہ عرش الٰہی کو دیکھ رہا ہون گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہین، گویا مین دوزخیون کو داویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہون" ارشاد ہوا کہ "تم نے جان لیا اسی پر قائم رہو" [۲]

[۱] یعنی ان منافقون کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بنجائین تو خدا ان کو معاف فرمادے

[۲] اسد الغابہ تذکرہ حارث بن مالک،

صحابۂ کرام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صحبتوں میں اُن کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت حنظلہؓ اسدی حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گذرے، انھوں نے پوچھا، حنظلہ کیا ہا ہے؟ بولے میں منافق ہو گیا، ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوتے ہیں، اور آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں، تو گویا ہم اُن کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں، تو سب بھول جاتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونوں بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمھاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے، یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے،[1]

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے فرمایا،

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ	ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا، تو تم
(تکاثر)	سے یہ غفلت نہ ہوتی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے:

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے،

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ	نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ،	مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی تو اُن کی ہے،

[1] ترمذی ابواب الزہد،

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ	جو اللہ اور روزِ آخرت اور فرشتوں
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ	اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر
وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی	ایمان لائے، اور مال اللہ کی حُب
الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی	پر رشتہ داروں اور یتیموں
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ	اور محتاجوں اور مسافروں اور
السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی	مانگنے والوں کو دیا، اور (غلامی
الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ	وغیرہ کی قید سے لوگوں کی گردنوں
وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ	(کے چھڑانے) میں (دیا)، اور نماز پڑھتے
بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا	اور زکوٰۃ دیتے رہے، اور جب
وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ	(کسی بات کا) اقرار کرلیا، تو اپنے
وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ	قول کے پورے اور تنگی، اور تکلیف
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا	میں اور جل چل کے وقت میں ثابت
وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ	قدم رہے، یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے
(بقرہ - ۲۲)	اور یہی ہیں پرہیزگار،

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے ان کے تین ۳ قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں، اوّل اُن کے ایمان کا کمال، دوسرے اُن کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں ان کا ہر طرح پورا اترنا، اور جو لوگ علم اور عمل کے (ان) تمام فضائل کے درجۂ کمال

کو پہنچ جاتے ہیں، اُن کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، صدّیق کہتے ہیں[۵۷]، جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبۂ کمال ہے، چنانچہ آیتِ ذیل میں نبی کے بعد ہی صدّیق کا نام لیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمرہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہی،

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ	تو وہ (جنت میں) اُن (مقبول بندوں)
عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ	کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام
وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَ	کیے یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور
حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا ،	(دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ
(نساء - ۹)	(کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں ،

سورہ حدید میں ایمان کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے،

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ	اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ (حدید)	لائے وہی صدیق ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ صدّیقیت اُس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے، جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہو سکتا، یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ "انسان سچ

---

۵۷ الصدیق الذی یصدق قولہ بالعمل ، (مجمع البحار فتنی)	صدّیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو،

بولتے بولتے صدیق ہوجاتا ہے"، اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہین ہوتا، بلکہ اس کے لئے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے،

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی اور جب ان تینون مین کوئی مسلمان کامل ہو، تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے،

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے، سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہین، اور اس کی بہت سی صورتین ہین، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کئے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لئے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ مین ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ مین ڈال دینا، دوسرون کو بچانے کے لئے یا حق کی حمایت مین اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمین ہیں، جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہین،

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنون کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیمون کو محیط ہے، اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسرون کو فائدہ پہنچایا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر بنیادی کامون کی بنیاد ہی،

سورۂ بقرہ کے شروع مین اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندون کے کچھ اوصاف بتائے

ہین، ان مین سے ایک یہ ہے،

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس مین سے

(بقرہ-۱) کچھ (خدا کی راہ مین) خرچ کرتے ہین،

بعض اہلِ تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہین[1]، بلکہ یہان جس طرح روزی کی تخصیص نہین کی گئی کہ کیا دیگئی، غلہ کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس مین سے کچھ خدا کی راہ مین دینے کی صورت کی بھی تعیین نہین کی گئی، خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے، اس کو اس مین سے اس شخص کو دینا چاہیے، جس کو یہ نہین ملا، یا ضرورت سے کم ملا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو ملا ہے، اس مین سے کچھ اُن کو دینا جو اس سے محروم رہے ہین، یا جو اس کے محتاج ہین، متقیون کی نشانی ہے، اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح مین سخاوت اور فیاضی ہے،

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن، نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر مین اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الٰہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندون کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی مین یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اس مین اپنے ہم جنسون کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور،

جذبہ نہ ہوگا، اسی لئے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کرکے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایثار (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید آئی ہے، اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا،

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اس میں
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ	سے کچھ خرچ کرو، جو ہم نے تم کو دیا ہے
يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ	اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں
وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ	نہ خرید نا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (بقرہ-۳۴)	ہے، اور کافر ہی ہیں ظالم

اس آیتِ پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے، اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کرکے خدا کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا، وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ کافرِ نعمت ہے، جو خدا کی روزی کی نعمت پاکر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں نہیں دیتا،

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پُرتاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر اُبھارا ہے، کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہوسکتا ہے، نہ دوستی و محبّت سے اور نہ کسی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمھاری نہیں، بلکہ

میری ہی دی ہوئی ہے، خرچ کر کے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اُس دن یہی کام آنے والا ہے،

خدا کی راہ مین جو سخاوت کی جائے ضروری ہے کہ اُس مین خلوصِ نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو، اور نہ اس کا اولا ہنا دینا ہو، خود رسول کو فرمایا، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، (مدثر-۱) اور احسان نہ کر (یا احسان نہ دھر) کہ زیادہ بدلہ چاہے) اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا، اس کی مزدوری خدا دے گا، اور قیامت کے غم وملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا، ارشاد ہے،

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ	جو اپنی دولت خدا کی راہ مین خرچ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ	کرتے ہین، پھر اس کے خرچ کیے پیچھے
اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ	نہ تو احسان دھرتے ہین، اور نہ الاہنا
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ	دیتے ہین، اُن کی مزدوری ان کے
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ،	پروردگار کے پاس دھری ہے، اور
(بقرہ-۳۶)	نہ اُن کو ڈر ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہونگے،

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنائت ظاہر ہوتی ہے، فرمایا گیا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا	اے وہ لوگو جو ایمان لائے اس مین
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ	سے جو تم نے کمایا، اور اس مین سے

أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ۚ وَ	جو ہم نے تمھارے لئے زمین سے نکالا
لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ	اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے
تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ	بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو، کہ
إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ	تم دیتے ہو، حالانکہ تم اب اس کو لینے
(بقرہ - ۳۷)	والے نہیں مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں بیچ جو،

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو، اس کا دینا بھی پسند کرو جب تک ایسا نہ کروگے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آسکتا، صاف فرمایا، :-

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا	ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے، جب تک
تُحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ	تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو
فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ،	پسند ہے، اور جو بھی تم خرچ کرو خدا
(آل عمران - ۱۰۰)	جانتا ہے،

یعنی خدا دل کے حال سے خبردار ہے، کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے، تو چھپی رہے مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے، اور اسی لئے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے، اور اس طرح نیکی کے کام میں جو کچھ تم دیتے ہو، اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا، دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور رجاداو

محتاجون کی مدد مین جو کچھ دیتے ہو، اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو، اور دین مین تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کریگا، فرمایا،

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ ۷-۳۷)

اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمھارے ہی لئے ہے اور تم نہین خرچ کرتے، مگر اللہ کے لئے، اور جو بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دیدیا جائے گا، اور تمھارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی،

اور اسی لئے کہ دنیا مین جو کچھ دے گا، وہ آخرت مین اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے، اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے،

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ (بقرہ ۸-۳۲)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے،

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝ (حدید ۲)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، تو وہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے اور ہے اس کے لئے عزت کی مزدوری

آگے چل کر فرمایا،

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ	بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات
وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	کرنے والیاں اور قرض دیتے ہین اللہ
يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ	کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا
(حدید - ۲)	اور ان کے لئے عزت والی مزدوری ہے

کہین حکم کی صورت مین ہے،

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (مزمل ۲)	اور اللہ کو اچھا قرض دو،

قرضِ حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لئے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے، اور اس کے بدلہ مین لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے، نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتون کا عہد لیا تھا، ان کو قرآن مین مسلمانون کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے، ان مین نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے،

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا
(مائدہ - ۳)	قرض دیتے رہے،

تو ان باتون کا نتیجہ یہ ہوگا،

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ	تو مین تم سے تمھاری برائیان اتار دونگا
لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	اور تم کو ان باغون مین داخل کردن گا

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (مائدہ-۳) جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے، اور خوشی نیتی کے ساتھ کارخیر میں خرچ کرتے تھے، خدا نے ان کی تعریف فرمائی،

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ (توبہ-۱۲)	اور بعضے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں، اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں، اللہ سے نزدیک ہونا، اور رسول کی دعا لینا،

خدا نے ایسے سخی داتاؤں کو خوشخبری دی،

اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (توبہ-۱۲)	ہاں! وہ اُن کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے، اُن کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے،

متقی سخیوں کے لیے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اُس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے،

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ	اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے،

وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ	آسمان اور زمین تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں
الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ	کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں
الضَّرَّآءِ ، الآیۃ (آل عمران ۱۴۰)	حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں ...

سورۂ بقرہ مین اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ مین کیا جائے، ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گونا کیونکر ہو گا، دور ہو جاتا ہے۔ فرمایا،

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ	اُن کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ	مین خرچ کرتے ہین، ایک دانہ کی
اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ	سی ہے، جس سے سات بالین اُگتی
کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ط	ہین ہر بال مین سو دانے ہوتے ہین اور اللہ
وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ط	جس کیلئے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ
وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (بقرہ ۳۶)	کشایش والا ہے، سب جانتا ہے،

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑون دانے بن جاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑون دانے پیدا کر لیتا ہے، خدا گنجایش اور کشایش والا ہے، اُس کے ہان ایک کا سو بن جانا کچھ مشکل نہین ہے، اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے۔ اسی رکوع کے آخر مین اللہ تعالیٰ نے اُن کی جو خدا کی خوشنودی کے لئے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہین، ایک اور مثال دی ہے،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور اُن کی مثال جو اپنا مال خدا کی
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا	خوشنودی چاہنے کے لئے اور اپنے
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ	کو پکا کرنے کو دیتے ہین، ایک باغ
اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا	کی سی ہے، جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس
ضِعْفَيْنِ، فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ	پر مینھ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا
فَطَلٌّ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	دیا، اور اگر مینھ نہین پڑا تو اوس ہی
بَصِيْرٌ ○	پڑی، اور اللہ تمھارے کام
(بقرہ ۳۶)	دیکھتا ہے،

اس مثال مین ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا، اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین مین پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے، ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ مین جو دیا جائے، وہ ایک کے بدلہ مین سو ہو جاتا ہے، اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے، اس لئے ہماری نیتون کے بھید سے بھی آگاہ ہے،

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورہ واللیل مین بیان کیا گیا ہے، فرمایا

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَ	تو جس نے (راہ خدا مین) دیا، اور
صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ	پرہیز کیا، اور اچھی بات کو مانا،

لِلْیُسْرٰی ،	توہم اس کے لیے (نیکی کی) سہج بات کا
(لیل - ۱)	راستہ آسان کرین گے ،
وَسَیُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي	۲۔ اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ
يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۝ وَمَا	پرہیزگار بچایا جائے گا ، جو اپنا مال
لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ	پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے ، اور اس پر
إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ	کسی کا احسان نہین جس کا بدلہ دیا
الْأَعْلَىٰ ، وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ،	جائے ، بلکہ اپنے پروردگار برتر کی
(لیل - ۱)	خوشی کے لیے اور وہ خوش ہو جائیگا ،

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا مین دینے کی عادت ، اطاعت و عبادت یا نیک کامون کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے ، جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے ، یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے ، دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو داد و دہش کا عادی ہے ، دوزخ کی آگ حرام ہے ، مگر شرط یہ ہے کہ اس جود و سخا کا سبب دنیا وی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو ، بلکہ مقصود صرف خدا ہو ، اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اُس کا دامنِ دل پاک ہو جائے ، تو خدا فرماتا ہے ، تو خدا بھی اس کے اس نیک عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا ، اس دوسری آیت مین یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل مین پاکیزگی آتی ہے ،

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے، جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا، اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لئے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلون کے اسی میل کو دھونا چاہا، اور جود و سخا اور داد و دہش کی بڑی تعریف، اور جمع مال، حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی، اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤن کے دلون سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے،

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ	پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب
الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۙ	کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ	کی، اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے
(ھمزہ-۱)	کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی،

ایک اور آیت مین مال کی محبت پر کافرون کو طعنہ دیا ہے،

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۙ	اور تم مال و دولت سے بہت ہی
(الفجر-۱)	محبت رکھتے ہو،

یہی محبت، سچائی، اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے، اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر مین نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی، اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ مین دینا) کے سلسلہ

مین ان لفظون مین ادا کیا ہے ،

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ	شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے،
یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ	اور تمھین بے حیائی کی بات (بخل)
یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَ	کو کہتا ہے، اور خدا تم سے اپنی طرف
فَضْلًا ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ	سے گناہون کی بخشایش اور فضل وکرم
	کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ کشایش
(بقرہ ۔ ۳۷)	والا ہے، جانتا ہے،

قرآن کی اصطلاح مین دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اُس وقت تک کسی کو نہین ملتا جب تک اُس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا،

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ	وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے
یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ	اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی، اسکو
خَیْرًا کَثِیْرًا ط (بقرہ ۔ ۳۷)	بڑی دولت ملی،

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائین گے اُس کا سراسر دھوکا ہے، اور خدا کا یہ وعدہ کہ اپنے سے اُس کے فضل وکرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے،

ایک اور آیت مین ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمایش ہی، اس آزمایش مین پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو نجات اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے، جس کے پاؤن اس بازی مین ٹھہر گئے، وہی بامراد ہوا، اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا،

اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ ط وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ط فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ط وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰهُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ،

(تغابن - ۲)

تمھارا مال اور تمھاری اولاد تو جانچ ہی، اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہی تو اللہ سے ڈرو جتنا ہو سکے، اور (اس کی باتون کو) سنو اور مانو، اور (راہ خدا مین) خرچ کرو، اپنے لئے بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب مین، اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض، تو وہ اس کو تمھارے لیے دونا کر دیگا، اور تمھارے گناہ معاف فرمائیگا، اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہی، اور برائی کا بدلہ لینے مین) بردبار ہے،

ان آیتون مین انفاق اور کار خیر مین دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے، قومون کی ترقی کا مدار بہت

کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں مین لگاتی اور افرادمین بانٹتی رہین یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد مین اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہین، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی، اور تمول کی بُرائیوں سے لوگ بچے رہین گے، اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کرین گے، اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہی،

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے، وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہین،

۱۔ میری چیز ہے مین دوسرون کو کیون دون،

۲۔ دوسرون کو دونگا تو میری کمی ہو جائے گی، جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی،

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسون کا خاتمہ کر دیا ہی اس نے یہ بتایا اور اپنے پیرودن کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت مین میرا تیرا کسی کا نہین وہ صرف خدا کا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اسی کی چیز ہے، اور اسی کی راہ مین دی جانی چاہیے،

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِي سَبِيْلِ	اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ مین
اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ	خرچ نہین کرتے، اور آسمانون اور
وَالْاَرْضِ (حدید۔۱)	زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے،

بخل کی برائی مین کہا،

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ	اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس مین بخل
بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	کرتے ہین جس کو اللہ نے اپنے فضل
هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ	سے انھین دیا ہے کہ یہ اُن کے حق مین
لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ	بہتر ہے بلکہ یہ اُن کے حق مین بُرا ہے
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ	قیامت کے دن اُن کے گلے مین اسکا
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ	طوق ڈالا جائے گا جس کا بخل کیا تھا
(آل عمران ۔ ۱۸۰)	اور آسمانون کی اور زمین کی میراث ہے

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک مین بیسیون جگہ یہ آیت ہے ،

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ	اور خدا ہی کا ہے، جو کچھ آسمانون
الْاَرْضِ ۔	مین اور زمین مین ہے ،

اسی طرح بیسیون مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے ،

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ	آسمانون اور زمین کی ملکیت دیا
الْاَرْضِ ،	بادشاہی ، اُسی کی ہے ،

منافقون نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کرین، تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہین، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائین، اللہ تعالیٰ نے منافقون کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی، اور ساتھ ہی منافقون کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ اُن کے دینے سے ہو گا، تردید کی، فرمایا،

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا	وہی لوگ ہین جو کہتے ہین کہ خدا کے
عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ	رسول کے پاس جو لوگ ہین، اُن پر
حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ط وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ	خرچ نہ کرو، تاکہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائین،
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ	اور اللہ ہی کے ہین خزانے آسمانون
الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ،	کے اور زمین کے، اور لیکن منافقین
(منافقون - ۱)	سمجھتے نہین ہین،

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی کی کل چل رہی ہی اُن کے بل بوتے سے ہے، خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ مین جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہان سے جس کو چاہے، جو چاہے دے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا،

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اسی کے پاس ہین آسمانون کی اور
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ	زمین کی کنجیان، پھیلا دیتا ہے روزی
وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ	جس کے لئے چاہے، اور ناپ دیتا
عَلِيْمٌ (شوریٰ - ۲)	ہے، وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے،

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونون انسان کی جانچ کے ذریعہ کے راستے ہین، اگر ایک مین انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار، اور جذبۂ شکر

ف (یا) یہان تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائین،

کا امتحان ہے، تو دوسرے مین انسان کی قناعت پسندی، بے طمعی، اور جذبۂ صبر کی آزمایش ہے، فرمایا،

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ	سو آدمی جو ہے جب اُس کا مالک
رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ	اُس کو جانچے، پھر اُس کو عزت دے،
رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا	اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ
ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ	میرے مالک نے مجھے عزت دی،
فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا	اور جب اوس کو جانچے تو اس کی روزی
	اس پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے
(فجر)	مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں،

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونون خدا کے کام ہین، اور مصلحت سے ہین، دولتمند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی مین کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی، یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چارون طرف سمٹی آرہی ہے مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لئے کافی ہے مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہین، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظون مین کھینچکر اس کی غلطی بتائی ہے،

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا	سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آلگے،
ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ	تو ہم کو پکارے پھر جب ہم اپنی طرف

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ط
بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ، قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ
مِن قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم
مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ فَأَصَابَهُمْ
سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ط وَالَّذِينَ
ظَلَمُوا مِنْ هَٰؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ
سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَمَا هُم
بِمُعْجِزِينَ أَوَلَمْ يَعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن
يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ط إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

ہے اس کو کوئی نعمت دین تو کہے کہ
یہ تو مجھے علم پر ملا ہے (خدا فرماتا ہے) بلکہ
یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اسکو نہین
سمجھتے یہی بات اُن کے پہلون نے کہی
تھی، تو اُن کو اُن کی یہ کمائی کام نہ آئی
اور جو کمایا تھا، اس کی برائیان اُن
پر پڑین، اور جو اُن مین سے گنہگار
ہین، اُن پر بھی اُن کی کمائی کی برائیان
پڑنے والی ہین، وہ تھکا نہین سکتے،
کیا اُن کو یہ خبر نہین کہ اللہ ہی روزی
جس کے لئے چاہتا ہے پھیلاتا ہے، اور
(جس کو چاہتا ہے،) ناپ کر دیتا ہے اس مین

لہ اسکا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا، دوسرا یہ ہے کہ دولت کے حصول کے طریقون کا مجھے ہنر معلوم تھا، اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص مین قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے، (دیکھو روح المعانی جلد ۲۴ ص ۱۱ مصر ۱۲)

سہ چنانچہ قارون کو جب راہ خدا مین خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا۔

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي (قصص ۸۰)

قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے، جو میرے پاس ہے،

(زمر-۵) ایمان والون کے لیے البتہ نشانیان ہین"

ہرجاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آجائے توسخاوت اور فیاضی کا ہرراستہ اُس کے لئے آسان ہوجائے، اسلام نے انسانون کو یہی یقین دلایا ہے، خدانے فرمایا،

وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ	اور کوئی چلنے والا نہین زمین مین مگر
اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا وَیَعْلَمُ	یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے، وہ جانتا
مُسْتَقَرَّھَا وَمُسْتَوْدَعَھَا کُلٌّ	ہے، جہان اسکو ٹھرنا ہے، (یعنی دوزخ
فِی کِتَابٍ مُّبِیْنٍ۔	یابہشت) اور جہان اس کو سونپا
	جاتا ہے، (یعنی قبر) سب (علم الٰہی
(ھود-۱)	کی) کھلی کتاب مین موجود ہے،

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی مین سے جوکچھ دوسرے کو مل جاتا ہے وہ تقدیر مین اُسی کا حصہ تھا، اُس لئے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہین، اسلام نے اپنے پیروؤن کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لئے اُن یقینیات کو مسلمانون کے رگ ریشہ مین رچادینا چاہا ہے، وہی سب کوروزی پہنچاتا ہے، خداتعالیٰ پوچھتا ہے،

وَمَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ	اور تم کو کون روزی دیتاہے آسمان
وَالْاَرْضِ ط ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ	سے اور زمین سے اللہ کے ساتھ کوئی
(نمل-۵)	اور خدا بھی ہے،

روزی دینا اُسی کا کام ہے،

اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ۝ (ذاریت -۳) بے شبہہ اللہ جو اللہ ہے وہی روزی دینے والا ہے، زور آور، مضبوط،

احادیث مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طرح طرح کے پُر اثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے، فرمایا "تم باندھو نہین، ورنہ تم پر باندھا جائے گا"[1] یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منھ بند کرو گے، اور دوسرون کو نہ دو گے، تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منھ تم سے بند کرلے گا، اور تم کو نہین دے گا" ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا "تم مین سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثون کا مال زیادہ پیارا ہے"؟ لوگون نے کہا ہم مین کوئی ایسا نہین جسکو اپنے مال سے اپنے وارثون کا مال زیادہ پیارا ہو؟ فرمایا "تو اُس کا مال تو وہی ہی جس کو اُس نے آگے بھیجا، اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے"[2] ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت مین ڈال دیا، پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا یا کھا لیا تو اس کو فنا کرچکا، اور پہن لیا تو اس کو پرانا کرچکا"[3]

فرمایا "اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہین کہ میرے پاس اُحد پہاڑ برابر سونا ہو، اور تیسرے

---

[1] صحیح مسلم ۲ باب الحث علی الانفاق [2] صحیح بخاری جلد ۲ باب ما قدم من مالہ فھو لہ [3] جامع ترمذی باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا، حدیث حسن صحیح،

دن تک اُس مین سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑ دن مین کھون گا کہ اس کو خدا کے بندون مین ایسے ایسے دا ہنے بائین پیچھے بانٹ دو[1]" پھر فرمایا "ہان جن کے پاس یہان زیادہ ہے ان ہی کے پاس وہان قیامت مین کم ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائین پیچھے بانٹ دو[1]"

فرمایا "رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اُس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو وہ ہاتھون سے اُس کو صحیح مصرف (حق) مین لٹا رہا ہے، دوسرے اُس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اُس کے مطابق بتا رہا ہے، اور سکھا رہا ہے[2]"

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اُس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) مین ہے، اور اس مین دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو، اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآن پاک مین آئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان مین آئے گی،

یہ بھی سخاوت نہین کو کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے، اور جب موت سامنے آکر کھڑی ہو جائے، اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے، تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کامون مین لٹا جاؤن، قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نقشہ کس پُر اثر انداز مین کھینچا ہے اور

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما احب ان لی مثل احد ذہبا۔ [2] صحیح بخاری کتاب العلم،

اور مسلمانون کو اپنی زندگی ہی مین کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ — اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس مین

مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ — سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم مین سے

الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ — کسی ایک کو موت آنے لگے، تو کہے کہ

اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ — اے میرے مالک تونے مجھے تھوڑی مہلت

فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ — اور نہ دی کہ مین خیرات کرتا، اور نیکون

الصّٰلِحِیْنَ ۔ (منافقون-۲) — مین ہوتا،

خدا نے اس کے جواب مین فرمایا ،

وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ (منافقون-۲) — اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دیگا جب

اَجَلُھَا وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ — اسکا وقت آجائے گا اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو،

اس لئے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہیے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے، فرمایا "یہ کہ تم صدقہ کرو، اور تم تندرست ہو مال کی خواہش ہو، اور جینے کی بھی امید ہو، اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلان کو اتنا دو اور فلان کو اتنا دو، حالانکہ وہ تو اب (تمھارے بعد) فلان کا ہو ہی چکا[1]"

فرمایا "اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لئے برا ہے[2]"

---

[1] صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۸۳ مصر باب بیان افضل الصدقہ [2] ایضاً باب الید العلیا،

عِفّت وپاکبازی

عفّت وپاکبازی اُن ساری اخلاقی خوبیون کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لئے اسلام نے اس کو اُن اخلاقی محاسن مین گنایا ہے، جو مسلمانون کے چہرہ کا نور ہین، چنانچہ سورۂ مومنون مین مسلمانون کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہین ان مین اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرمگاہون
حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	کی پاسبانی کرتے ہین، مگر اپنی بیبیون
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ	یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیون) سے
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى	تو اُن پر کچھ الزام نہین، لیکن جو اس کے
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	علاوہ کے طلبگار ہون، تو وہی لوگ حد
الْعٰدُوْنَ ۝ (مومنون-۱)	سے باہر نکلے ہوئے ہین،

سورۂ معارج مین مسلمانون کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے اُن مین ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے، فرمایا،

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ، (معارج ۱۰)

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہین ،

جن مسلمانون کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے ان مین وہ بھی ہین ، جو عفیف اور پاکدامن ہین ،

وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (احزاب - ۵)

اور اپنی شرم گاہون کی پاسبانی کرنیوالے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتین ،

ان دونون آیتون سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاکدامنی کے لئے قرآن کی اصطلاح "حفظ فروج" ہے ، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہین ، اور فروج اپنے معنی مین ایک مجازی استعمال ہے ، کتنے لفظ ہین ، جو شرم کے قابل لفظون سے بچاؤ کے لئے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے ، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم مین بالکل ہی وہ بے پردہ ہوگئے ، فروج کے اصلی معنی دو چیزون کے درمیان خلا کے ہین ، اور اسی لئے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہین جدھر سے دشمنون کے حملہ کا ڈر ہو ، اس بنا پر یہ انسانون کے اعضا مین سے اس خلار کا نام ہے جو ان کے دونون پاؤن کے بیچ مین ہے ، اور جدھر سے دشمنون کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو ، اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو اس طریقہ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظون کے اندر پیوست ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے ،

عفت و پاکبازی کے لئے قرآن کا دوسرا لفظ احصان ہے جو حِصن سے بنا ہے جس کے

معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہین، اس سے حصانٌ، اِحصانٌ، مُحصِنٌ اور مُحصَنٌ الفاظ بنائے گئے ہیں، پہلا لفظ قرآن مین نہین آیا، مگر عربون کے اشعار مین آیا ہے، اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہین، دوسرے کے معنی حفاظت مین لینے یا حفاظت مین رکھنے کے ہین، یہ قرآن مین تین موقعون پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریمؑ کی عصمت و پاکدامنی کے بیان مین، ماضی معروف کے صیغہ مین،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ
أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (تحریم-۲)	کو محفوظ رکھا،
وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا	اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو
فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا،	محفوظ رکھا، تو ہم نے اس مین اپنی
(انبیاء-۶)	روح پھونکی،

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اُس کو اپنے نکاح مین لاکر اپنی حفاظت مین لے لیا، لونڈیون کے بیان مین ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح مین آکر بدکاری کرین تو اُن کی سزا کیا ہے، فرمایا،

فَإِذَا أُحْصِنَّ ۝ (نساء-۴)	تو جب نکاح کے قید مین آچکین،

اسی سے اس کا اسم فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت مین لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَۃٌ (حفاظت مین لائی گئی) نکاح کے سلسلہ مین قرآن مین آیا ہے،

مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (نساء-۴)	حفاظت مین لانے والے نہ مستی نکالنے والے

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ ط　　حفاظت مین آنے والیان نہ مستی

(نساء-۴)　　نکالنے والیان،

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید مین لایا جائے صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہین، اسی لئے قرآن پاک مین اس کے علاوہ مُحْصَنٰتُ (حفاظت مین رکھی ہوئی بی بیان) دو معنون مین آیا ہے، ایک بیاہی عورتون کے معنی مین، جیسے

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ،　　اور بیاہی عورتین (یعنی جو عورتین

(نساء-۴)　　کسی کے نکاح مین ہین، وہ دوسرے

مرد پر حرام ہین،

دوسرے شریف آزاد بی بیون کے معنی مین جیسے

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا　　اور جس کو تم مین سے مسلمان شریف

اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ　　وآزاد بیون کے نکاح کا مقدور نہ ہو

(نساء-۴)　　(تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)

عورتون کی عصمت کے بیان مین قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے،

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (نساء-۶)　　پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیان،

یعنی اپنے شوہرون کی غیر حاضری مین اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کرتی ہین

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رُتبہ ہے کہ وہ نبوّت و رسالت کا لازمی جزء ہو، بنی بنی کے سلسلہ نسبت اور بنی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہو، حضرت عیسیٰ کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا، قرآن نے اسکی تردید کی، اور اُن کی عصمت اور پاکدامنی کی شہادت دی، اور دو موقعون پر اس شہادت کی تصریح کی،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيٓ	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی
اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (تحریم ۲)	شرمگاہ کو محفوظ رکھا،
وَالَّتِيٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ
فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا	کو محفوظ رکھا، تو ہم نے اس مین
(انبیاء ۲)	اپنی روح پھونکی،

حضرت یوسفؑ نے جس پاک بازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی،

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ	اور مین نے اس کو اس سے چاہا تو
فَاسْتَعْصَمَ ط (یوسف ۴)	وہ بچا رہا،

خدا نے فرمایا مین نے ایسا اس لئے کیا،

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ	تاکہ ہم اس سے بُرائی اور بے حیائی
الْفَحْشَآءَ ط اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا	کو دور کرین، وہ بے شبہہ ہمارے

اَلْمُخْلَصِيْنَ۔ (یوسف ۳) چنے بندون مین تھا،

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتون سے پاک رکھے جاتے ہین،

حضرت یحیٰ کی تعریف مین فرمایا گیا،

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (آل عمران ۴) اور سردار ہوگا، اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا، اور نبی ہوگا صالحون سے

اسلام مین اہلِ بیتِ نبوی کی زندگی جس عفت عصمت اور پاکبازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظون مین دی،

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (نور ۳) یہ لوگ تہمت سے پاک ہین، اُن کے لئے بخشایش ہے اور عزت والی روزی،

عفت و پاکدامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان مین فَاحِشَةٌ[1] آیا ہے جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہین، جیسے،

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ مگر یہ کہ وہ عورتین کھلی برائی کرین

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ (نساء ۳) اور تمھاری عورتون مین سے جو

[1] اس کا یہ منشا نہین ہے کہ قرآن مین ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی مین آیا ہے، بلکہ وہ لغت کے رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہو،

نِّسَاءِکُمۡ، (نساء-۳) کھُلی بُرائی کرین،

اس بُرائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآنِ پاک کی ذیل کی آیت مین مسلمانون کو اُس برائی سے روکا گیا ہے،

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّسَآءَ سَبِیۡلًا (بنی اسرائیل ۴) اور زنا کے قریب نہ جاو، بیشک یہ بڑی بُرائی اور بُرا چلن ہے،

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے، وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہین فرمایا کہ "تم زنا نہ کرنا" بلکہ یہ کہا کہ "تم زنا کے قریب نہ جانا" اس طرزِ ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعلِ بد ہی سے بچنے کی تاکید کی، بلکہ اس سے قریب ہو کر گذرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے، اس کی تقریب اور تمہید کے کامون سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے، کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظرون سے یا بیحیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی مین ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا، یا اور کسی طرح سے اسکی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے،

اسی لئے اسلام نے ان ساری باتون کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہین حرام قرار دیا، مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے، مسلمان مردون اور مسلمان عورتون دونون کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہون تو اپنی نظرین نیچی رکھین،

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ	اے پیغمبر ایمان والوں سے کہدے کہ
اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ	وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں، اور اپنے
ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ	ستر کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے
بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۔	بڑی ستھری بات ہے، اللہ جانتا ہے
(نور - ۴)	جو وہ کرتے ہیں،

عورتوں کی ذراسی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لئے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئیں، مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لئے زمین پر ہولے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلیں، مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد وعورت مل جل کر نہ بیٹھیں کسی غیر عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتیں درحقیقت لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہیں، فرمایا،

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ	اور اے پیغمبر ایمان والی بی بیوں سے
مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ	کہدے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں، اور
فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ	اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں،
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا	اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں،

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى
جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ
اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ
اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ
اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ
اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ
اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ
اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ
مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ
لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ
وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ
مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا
اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (نور - ۴)

مگر جو طبعًا کھلا رہتا ہے[1]، اور اپنی اوڑھنی
اپنے گریبانون (یعنی سینون کے مقام)
پر ڈال لین، اور اپنا سنگار نہ کھولین مگر
اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے یا اپنے شوہر
کے باپ، یا اپنے بیٹون، یا اپنے شوہر کے
بیٹون، یا اپنے بھائیون یا بھتیجون، یا
اپنے بھانجون یا اپنی عورتون[2] یا اپنی غلامون
یا اپنے ان مرد نوکرون کے آگے جن کو غرض
نہین، یا اُن لڑکون کے آگے جو عورتون
کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہین، اور نہ
مسلمان عورتین اپنے پاؤن
سے دھمک دین کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی
ہین، اس کا پتہ لگ جائے اور تم سب
مل کر اے مسلمانون خدا کے آگے توبہ کرو
تاکہ تم فلاح پاؤ[3]

اور حسب ذیل ادب اگو پیغمبر کی بیون کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتون کے لیے

---

[1] جیسے آنکھون کا سرمہ، ہاتھون کی مہندی، یا انگلیون کی انگوٹھی، اسی لئے چہرہ، ہتھیلیان اور قدم ستر مین داخل نہین [2] یعنی سہیلیان اور خادمائین اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے، (روح المعانی ۱۲)

اس مین پیروی کا نمونہ ہے،

يٰنِسَاۤءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ	اے پیغمبر کی بیویو! تم نہین ہو جیسی ہر
مِّنَ النِّسَاۤءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا	کوئی عورت، اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو
تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ	سو تم دب کر مرد سے بات نہ کرو کہ جسکے
فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا	دل مین روگ ہی، وہ خواہش کرے ہلے
مَّعْرُوْفًا، وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ	اور نیک بات کہو، اور اپنے گھرون
وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ	مین وقار سے رہو، اور جیسے نادانی
الْاُوْلٰى،	کے پہلے زمانہ مین دستور تھا، ویسے اپنے
(احزاب ۴۰)	بناؤ سنگار کرکے دکھاتی نہ پھرو،[1]

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا	اے ایمان والو! نبی کے گھرون مین
بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ	اس کے بدون کہ تم کو اجازت دیجائے
لَكُمْ، الآیۃ (احزاب ۰۰)	(کھانے کی دعوت کے لئے) داخل نہو،

گو یہ حکم یہان خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرون کے ساتھ خاص نہین، چنانچہ عفت و پاکدامنی ہی کے سلسلہ مین سورۂ نور مین اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھرون کی نسبت بھی ہے،

[1] یعنی تم سے جرات کرکے تمھار اخواہان ہو۔ التبرج اظہار الزینۃ للناس الاجانب (لسان العرب)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا	اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے
بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا	سوا دوسرے گھروں مین نہ جایا کرو،
وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ	جب تک خبر نہ کر لو، اور اُن گھر والون
خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ	کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمھارے
(نور-۴)	حق مین شاید تم یاد رکھو،

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے، تو چاہئے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہین کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے، چنانچہ کاشانۂ نبوّتی کے تعلق سے حکم ہوتا ہے،

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا	اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویون سے
فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ	کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کے
ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ	اوٹ سے، اس مین تمھارے اور
وَقُلُوْبِهِنَّ ط (احزاب-۷)	اُن کے دلون کی بڑی ستھرائی ہے،

یہ حکم گو شانِ نزول کے لحاظ سے ازواجِ مطہرات رضؓ کے سلسلہ سے ہے، مگر اہل بیت مین عام مسلمان گھرون کے لئے بھی حسن ادب کا ایک نمونہ ہے،

مسلمان عورتین جب گھر سے باہر نکلین تو اپنے کو ایک چادر سی ڈھانپ لین تاکہ انکی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتون کی آنکھون سے اوجھل رہے، اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیان ہین، اُن کو چھیڑنا تو کجا اُن کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے، فرمایا

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ	اے نبی! اپنی بیویون اور اپنی بیٹیون

وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ
يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ
ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا
يُؤْذَيْنَ ، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ
وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ
لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ
فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ،

(حزاب - ۸)

اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدے
کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں
نیچی لٹکالیں، اس سے یہ ہوگا کہ وہ
پہچان پڑیں گی، (کہ یہ شریف ہیں)
تو اُن کو ستایا نہ جائے، اللہ بخشنے والا
مہربان ہے، اگر اس پر بھی منافق، اور
جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ
ہے، اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے
نہ رکے، تو ہم تجھے اُن پر بھڑکائیں گے،
پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں
تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن،

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے، اور جب انھیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا، تو کہتے تھے، کہ ہم اُن کو لونڈی سمجھے تھے اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیئے، شریروں کی نسبت فرمائی کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انھیں کافی سزا دی جائے، بلکہ اُن کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے، اور مسلمان بی بیوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے

گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں، اس کے لئے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور، اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں، اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بی بیاں ہیں، جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے،

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا[1] اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے، اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے، مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ ابن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا، کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے، عورتیں بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں، بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں، اور گریبان کھلا رکھتی تھیں، کہ جو چاہے دست درازی کر سکے[2] اور نشان کے لئے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں، کہ اسلام نے آکر ان مراسم کی اصلاح کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لئے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری،

---

[1] تفسیر سورۂ طبری، تفسیر سورۂ نور ص ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد عن جابر [2] سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدہ کا یہ شعر پڑھئے

رحیب قطاب الجیب منها رفیقة   بجس الندامی بضة المتجرد

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ	اور تمھاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی
اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا	ہو کر رہنا چاہیں، تو اُن سے دنیا کی زندگی
عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَنْ	کے عارضی فائدہ کے لیے زبردستی بدکاری
يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ	نہ کرایا کرو، اور جو اُن کو اس پر مجبور کریگا تو منکی
اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے
(نور - ۴)	والا ہے،

اسی لئے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے،[1] اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لئے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے، کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی، سنن ابی داؤد (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی، وحی الٰہی نے اُن کی اس درخواست کا یہ جواب دیا،

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ	بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرکہ
مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ	عورت سے نکاح کرے گا، اور بدکار
اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ	عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (نور - ۱۰)	کریگا، ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے،

[1] صحیح مسلم باب تحریم مطل الغنی وغیرہ، ۱۲،

اس آیت مین انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتون کو اپنے قبضہ مین لانے کے لئے نکاح کا خیال بدکار ہی مردون کے دل مین آسکتا ہے، اسی لئے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا،

اَلْخَبِيثٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ	گندی عورتین، گندے مردوں کے لئے
لِلْخَبِيثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِينَ	ہوتی ہین، اور گندے مرد گندی عورتون
وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبٰتِ،	کے لئے، اور پاک عورتین پاک مردون کیلئے
(نور – ۳)	اور پاک مرد پاک عورتون کے لئے،

اسی لئے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت مین پسندیدہ نہین، بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے[1] سے جائز نہین، اور ان کی دلیل سورۂ نور

[1] جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے بعید ہے کہ وہ ایسون سے نکاح کرین، یا انکحوا الایامیٰ منکم اور فانکحوا ما طاب لکم من النسا سے منسوخ ہے، یا مخصوص ہے لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے، بلکہ اگر زن وشو مین سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو، تو قاضی نکاح کو فسخ کردے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ مین یہی فیصلہ کیا، ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زن وشو مین کفو ہونا شرط ہے، اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہین ہوسکتا، اس لئے نکاح فریقین مین سے جو عفیف ہے، اس کے اعتراض کے بعد قائم نہین رہ سکتا ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے، جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو، توبہ کرنے کے بعد جائز ہے، (دیکھو احکام القرآن جصاص رازی وتفسیرات احمدیہ ملاجیون وتفسیر کبیر رازی وروح المعانی تفسیر آیت مذکورہ)

کی اوپر والی آیت کے علاوہ اُس حدیث سے ہے جس کو ابو داؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے، اور ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو، اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے[1]

غرض اہل ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاکبازی ہے، اُن کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصوّر نہیں آنا چاہیے، چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے، اُن کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں، جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے، اور جو بدکاری نہیں کرتے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ	اور جو خدائے برحق کے ساتھ کسی اور
اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ	خدا کو نہیں پکارتے، اور کسی ایسی جان کا
حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ	جس کو خدا نے منع کیا ہے، خون نہیں بہاتے،
(فرقان ۶۰)	اور بدکاری نہیں کرتے،

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے جس کا انکار سراسر کفر ہے، اس کے بعد جو دو باتیں ہیں، اُن میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسری عزّت و آبرو سے،

قرآن پاک میں اس عفّت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں جن کا بیان اوپر آیا ہے اور جو حقیقت میں لا تقربوا الزنی

---

[1] ابو داؤد کتاب النکاح،

(بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحین ہین، اُن کی مزید تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عام احکام اور مواعظ مین بھی فرمائی ہی،

چنانچہ آپ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب سے معاف ہی مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہین[1]، حضرت عائشہ رضی کی بڑی بہن حضرت اسماء رضی ایک دفعہ باریک کپڑون مین سامنے آئین تو فرمایا کہ اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیون کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہین[2]، حکم دیا کہ مخنث زنان خانون مین نہ جانے پائین[3]، فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اُس کے اہل خانہ کی بے ستری ہو[4]، فرمایا کہ جو عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے[5]، سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گذرنے والون مین تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے[6] تاکہ مردون کی بھیڑ بھاڑ اور دھکون سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اُس کے شوہر کی غیر موجودگی مین اکیلا نہ جائے[7] کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہی، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہون یا اُن پر پردہ پڑا نہ ہو، اور کوئی اندر گھس گیا تو اُس کی ذمہ داری خود گھر والون پر ہے[8]،

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی نظرة الفجاءة [2] ابوداود کتاب اللباس باب فیما تبدی المرأة زینتہا [3] ابوداود کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالة البیت [5] ابوداود کتاب الترجل باب فی المرأة تطیب للخروج [6] ابوداود کتاب الاستیذان باب فی مشی النساء فی الطریق [7] مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوة بالاجنبیة والدخول علیہا [8] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالة البیت،

یہ ساری ہدایتین اسی لئے دی گئی ہین کہ مسلمان گھرون کی معاشرت عفت اور پاکدامنی کی تصویر ہو،

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتون پر بس نہین کی، بلکہ اُن کے لئے جو سوسائٹی کی عزت وحرمت کو خطرہ مین ڈالین، شرعی ثبوت کے بعد دنیا مین قانونی سزا بھی مقرر کی، تاکہ اُس کا خوف لوگون کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے،

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا	بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری
كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ	کرنے والے مردان مین سے ہر ایک کو سَو
(نور-۱)	کوڑے لگاؤ،

احادیث مین ہے، مردون اور عورتون[1] مین سے جو بدکاری مین پکڑے جائین اُن کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے، اس جرم مین عورتون کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے، اس لئے قرآنِ پاک مین ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتون سے جن باتون پر بیعت لیجائے اُن مین ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرین گی، فرمایا،

وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ	اور وہ بدکاری نہ کرین گی، اور نہ اپنی اولاد
وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ	کو مار ڈالا کرین گی، اور نہ اپنے ہاتھون اور
أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ (ممتحنہ-۲)	پاؤن کے بیچ مین بہتان باندھ کر لایا کرینگی،

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے، لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے

[1] یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی،

عورتون سے لی گئی، حالانکہ یہ کام مردون کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہین کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو،[1] یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم مین داخل ہو، اور ہاتھ پاؤن کے بیچ مین تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے، جاہلیت مین ایک عورت کئی کئی مردون سے ملتی تھی، جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ اُن مین سے کس کا لڑکا ہے، بعض عورتین دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہرون کے سر تھوپتی تھین، یہ ساری باتین عفت اور پاکدامنی کے خلاف تھین، اس لئے اُن سے باز رکھا گیا، اور خاص طور سے اُن سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہین، فتحِ مکہ کے وقت آپ نے قریشی بیویون سے،[2] اور مدینہ مین انصاری خاتونون سے بھی اس پر عہد لیا،[3] بلکہ مسلمان مردون سے ان باتون کا عہد لیا گیا، اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پر بیعت کی،[4]

دوسری طرف عورتون کو مردون کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت مین چار چشم دید گواہ پیش کرے، اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم مین اسّی کوڑے مارے جائین گے، اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے، اور گواہ نہ ہون تو مرد قسم کھائے، ورنہ عورت قسم کھائے کہ

---

[1] مفسرین مین صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گذرا ہے، [2] صحیح بخاری فتح مکہ [3] تفسیر طبری سورہ ممتحنہ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان،

یہ الزام غلط ہے، اور اگر دونوں اپنے دعوون پر قائم رہین، تو اسلام مین دستور یہ ہا ہے کہ اپنے دعوی کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے[1]،

اسلام کی نظر مین حقوق اللہ مین تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے، اور حقوق عباد مین تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے، اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاک بازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسول! کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ، حالانکہ اُس نے تم کو پیدا کیا، بولے اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گا، بولے اس کے بعد، فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لئے یہ آیت نازل فرمائی ہے[2]

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ	اور جو خدا کے ساتھ (کسی) دوسرے
اِلٰھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ	معبود کو نہ پکارین، اور ناحق (ناروا)
الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا	کسی شخص کو جان سے نہ مارین کہ اس
یَزْنُوْنَ۔	کو خدا نے حرام کر رکھا ہے، اور نہ زنا
(فرقان - ۶)	کے مرتکب ہون،

---

[1] اس کی تفصیل سورہ نور مین ہے کہ اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہین، مگر شروع سے عملدرآمد اسی پر رہا ہے، بخاری باب اللعان [2] بخاری کتاب الادب باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل معہ،

حدیث مین اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ دونون جرم اپنی نوعیت مین بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوسناک ہین، کہ جن سے یہ امید نہین ہو سکتی، اُن سے یہ فعل ظہور مین آیا، اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا،

ایک حدیث مین ہے کہ "زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھون کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہین رہتا"[1] کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے، اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھ کر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہین کرتا۔ اس حالت مین ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی مین گل ہو جاتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے، اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے، تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے،

اسلام مین زانیون کی سزا بعض حالتون مین سو کوڑے مارنا، اور بعض حالتون مین سنگسار کرنا ہے، لیکن اُن کو آخرت مین جو عذاب دیا جائے گا، وہ اس سے بہت زیادہ سخت، اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے لوگون کے اخروی عذاب کی دردناک صورتین دکھائی گئین، اُن مین بدکارون کے عذاب کی صورت اُن کے فعلِ قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا، جس کے اوپر کا حصہ تنگ، اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا، اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی، اور اس مین بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتین تھین، جب اس آگ کے شعلے

---

[1] بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شراب الخمر

بلند ہوتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اُس کے اندر سے نکل آئین گے لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے[1]، یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا،

اس کے بخلاف پاکباز اور پاکدامن لوگون کے فضائل بھی نہایت موثر انداز مین بیان کئے گئے ہین، ایک حدیث مین ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، خداوند تعالی سات آدمیون کو اپنے سایہ مین لے گا جن مین ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن اس نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ مین خدا سے ڈرتا ہون[2]

یہ تو وہ شرف ہے جو پاکبازون کو آخرت مین حاصل ہوگا، لیکن پاکبازی کی دنیوی برکتین بھی کچھ کم نہین، ایک حدیث مین آپ نے زمانۂ قدیم کے تین آدمیون کا قصہ بیان کیا ہے، جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعۃً پانی برسنے لگا، تینون نے پانی سے بچنے کے لئے ایک پہاڑ کے غار مین پناہ لی، سوء اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منھ بند ہوگیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا کچھ بھی نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمال صالحہ کے واسطے سے خدا سے دعا کرین، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان مین پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی،

"خداوندا میرے ایک چچا زاد بہن تھی، جس سے مین بڑی محبت رکھتا تھا، مین نے اس سے

[1] بخاری کتاب الجنائز [2] بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش،

اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک مین اُس کو سو دینار نہ دیدون وہ راضی نہ ہوئی، مین نے سو دینار کما کر جمع کیے، اور اس کو دے کر اپنی خواہشِ نفسانی پوری کرنی چاہی لیکن اُس نے کہا کہ خدا سے ڈرو، مین فوراً رک گیا، خداوندا اگر تو جانتا ہی کہ مین نے صرف تیری مرضی کے لئے ایسا کیا ہے، تو اس پتھر کو ہٹا دے، چنانچہ وہ سرک گیا[۱]

یہ روایت عفت و پاکبازی کو اُن اعمال مین شمار کرتی ہے، جن سے خدا کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے،

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب اجابۃ دعاء من بر والدیہ،

دیانتداری اورامانت

آپس کے لین دین کے معاملون مین جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہی، وہ دیانتداری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار مین ایماندار ہو، اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو، اُس کو پوری دیانت سے رتی رتی دیدے، اسی کو عربی مین امانت کہتے ہین، اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوعِ انسانی کے سپرد کیا ہے، امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى	ہم نے (اپنی) امانت آسمانون پر اور
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	زمین پر، اور پہاڑون پر پیش کی، تو
فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ	انھون نے اُس کے اٹھانے سے انکار
مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ	کیا، اور اس سے ڈرے اور انسان
كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝	نے اس کو اٹھالیا، بے شبہ وہ ظالم
(احزاب ۹)	اور نادان ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانون کے سپرد ہوئی ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کرین، اگر ہم ایسا نہ کرین تو خائن ٹھہرین گے،

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیام لے کر اُس کے خاص بندون پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ بندون کے لیے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لیے قرآن مین اس فرشتہ کا نام "الامین" رکھا گیا ہے،

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ (شعراء-۱۱)	اس پیغام کو لے کر امانت والی رُوح اُتری،
مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ (تکویر-۱)	اُس کا کہا مانا جاتا ہے وہان امانت والا ہے

اکثر پیغمبرون کی صفت مین بھی یہ لفظ قرآن مین آیا ہے کہ انھون نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا:

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ (شعراء-۱۰)	مین تمھارے لیے امانت دار قاصد ہون،

یعنی خدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے، وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہون، اس مین اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہین ہے،

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے مکہ والون کی طرف سے "امین" کا خطاب ملا تھا، کیونکہ آپ اپنے کاروبار مین دیانتدار تھے، اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے، وہ آپ جون کا تون اُن کو واپس کرتے تھے،

نیک عمل مسلمانون کی صفت یہ بتائی گئی،

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ	اور جو اپنی امانتون اور وعدہ کا پاس
رٰعُوْنَ (مومنون-۱)	رکھتے ہین،

بعض روایتون مین ہے کہ خانۂ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی، فتح مکہ کے وقت وہ اُن کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی، اس پر یہ آیت اتری،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	بے شبہہ تم کو اللہ حکم دیتا ہی کہ امانتون
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (نساء-۸)	کو اُن کے مالکون کے حوالہ کر دیا کرو،

اس حکم کے مطابق یہ امانت اُن کو واپس کی گئی، انھون نے سبب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدانے یہی حکم دیا ہے، وہ اُس وقت تک مسلمان نہین ہوئے تھے، اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان[۱] ہوگئے، بہر حال یہ واقعہ صرف شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے، اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکسان ہوگا، اسی لئے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت مین وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیفِ شرعی ہے[۲]، اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل وانصاف ہے، اور جو حاکمون کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے[۳]، اور وہ تمام امانتین بھی اس مین داخل ہین جن کو ان کے مالکون کے سپرد کرنا ضروری ہے،

---

[۱] تفسیر کشاف زمخشری۔ [۲] ایضاً [۳] تفسیر ابن جریر طبری،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں، جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ہر مالی، قانونی، اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے، تو اس کے مانگنے پر یا یون بھی اس کو جون کا تون دے دینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اسکو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے، تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے، کسی مجلس مین آپ ہون، اور کچھ باتین آپ دوسرون کے متعلق وہان سُن لین، تو ان کو اُسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسرون تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے اپنے کسی نجی کے کام مین مشورہ مانگا، تو اُس کو سُن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا، اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے، تو اُس کو اُس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے، اور وہ اسکی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے، یا بے سبب سستی کرتا ہے، یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے، تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے،

قرآن پاک اور حدیثون مین ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے، اُن مسلمانون مین جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوشخبری سنائی ہے، وہ بھی ہین،

وَالَّذِينَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (مومنون ۱) — اور جو اپنی امانتون اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہین،

پھر جن مسلمانون کو جنت مین عزت کی جگہ دی جانے والی ہو اُن مین بھی وہ داخل ہین۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ — اور جو اپنی امانتون اور اپنے قول و

عَهْدِهِمْ رَاعُونَ (معارج-۱) — قرار کی پاسبانی کرتے ہین،

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی، یا سفر مین گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض دے کر گرو رکھی،

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ — تو جو امین بنایا گیا، اس کو چاہیے کہ

وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ، — اپنی امانت ادا کر دے، اور چاہیے کہ اپنے

(بقرہ-۳۹) — پروردگار اللہ سے ڈرے۔

یعنی لے کر مکر نہ جاے یا دینے مین حیلے حوالے نہ کرے، یا اس مین بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کرکے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اُس کے اُس بھروسہ پر غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ انہی چیزون کا نام خیانت ہے جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے،

وَتَخُونُوا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ — اور اپنی امانتون مین جان بوجھ کر خیانت

تَعْلَمُونَ ۝ (انفال-۳) — نہ کرو،

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر مین دو لڑکیون کی بکریون کے پینے کے لیے پانی بھر دیا، اور اس کی کوئی مزدوری اُن سے نہین مانگی، اور اُن لڑکیون مین سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی، اور سفارش کی کہ اُن کو نوکر رکھ لیجیے،

تو اس موقع پر قرآنِ پاک کی یہ آیت ہی،

یٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ، اِنَّ خَیْرَ مَنِ	اے میرے باپ اس کو نوکر رکھیے،
اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ،	سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں،
(قصص۔۳)	وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو،

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیے اُس کو رکھا جائے اُس میں اُس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو، اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اُس کی اہلیت کا ثبوت دے اور اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دوررس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے، مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں، تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے،

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو الگ الگ کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے، امانت کے خلاف بتایا گیا ہے، اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کے رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں،

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے

اٹھایا ہے، اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
راز دار حضرت حذیفہؓ کہتے ہین کہ مین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتین سنی تھین،
ایک کو تو آنکھون سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ امانت داری لوگون کے
دلون کی جڑ مین اتری ہے، (یعنی اُن کی فطرت ہوتی ہے) پھر انھون نے کچھ قرآن جانا، کچھ
سنت سے سیکھا، (یعنی فطری امانت کے جوہر مین کسب اور اچھی تعلیم کی ترقی ہوتی ہے) حضرت
حذیفہؓ کہتے ہین کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا "پھر یہ حال
ہو گا کہ آدمی سوئے گا، اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی، اور اس کا ایک
ہلکا سا نشان رہ جائے گا، اور پھر سوئے گا، تو امانت چلی جائے گی، اور ایک آبلہ کی طرح
کا داغ رہ جائے گا، جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہین ہوتا، لوگ ایسے ہو جائین گے،
کہ لین دین کرین گے، لیکن کوئی امانتداری نہین کرے گا، اس وقت امانتداری کی مثال ایسی
کمیاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہین گے کہ فلان قوم مین ایک امانت دار شخص
ہے، آدمی کی تعریف ہو گی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے
دل مین رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمانداری نہ ہو گی"[1]

حدیث کے پہلے ٹکڑے مین انسانون مین ایمان داری کا جوہر فطری طور سے موجود
ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے
اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے، اور بتایا گیا ہے،

[1] صحیح بخاری باب رفع الامانۃ و کتاب الفتن والرقاق و صحیح مسلم و مسند احمد و ترمذی و ابن ماجہ،

آخر زمانہ مین وہ ایسا ہی رہ جائے گا، جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے،

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ نے فرمایا جس مین امانت نہین، اس مین ایمان نہین، جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس مین دین نہین، اُس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ مین محمدؐ کی جان ہے کسی بندہ کا اُس وقت تک دین درست نہ ہو گا، جب تک اُس کی زبان درست نہ ہو اور اس کی زبان درست نہ ہوگی، جب تک اس کا دل درست نہ ہو گا، ...... اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا، اور اُس مین سے خرچ کرے گا، تو اس کو اس مین برکت نہین دیجائے گی، اور اگر اُس مین سے خیرات کرے گا تو قبول نہین ہوگی، اور جو اس مین سے بچ رہے گا، وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہو گا، بُری چیز بری چیز کا کفارہ نہین بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے، [۱]

حدیث کی کئی کتابون مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "جس مین امانت نہین، اس مین ایمان نہین" [۲] اور یہ ظاہر ہے کہ کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دھوکا دے سکتا ہے،

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اُس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپؐ نے فرمایا جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے [۳]، اس لئے آپ نے فرمایا کہ مجلس مین

۱؎ کنز العمال ج ۲ ص ۵ احیدرآباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ ۲؎ کنز العمال ج ۲ ص ۱۵، از طبرانی اوسط و طبرانی کبیر و ابن عدی فی الکامل و بیہقی فی شعب الایمان ۳؎ ادب المفرد بخاری باب المستشار مؤتمن

جو باتین ہون وہ امانت ہین یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہئے، الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے رد کرنے کا کام لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا المجالس بالامانۃ یعنی نشستیں امانت کے ساتھ ہون، مگر تین موقعون پر کہین کسی[۱] کے ناحق قتل کی، یا کسی کی آبرو ریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش[۲] ہو" تو متعلقہ لوگون کو اس سے آگاہ کر دینا چاہئے،

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے، بلکہ میان بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتین ہوتی ہین، وہ بھی ایسے راز ہین جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے،[۳] راز کے یہی معنی نہین ہین کہ جس کو کہنے والا راز کہکر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہین چاہتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے، اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے[۳]، امانت مین خیانت کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے[۴]،

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت مین لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطون کے مطابق لیتا ہے لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت مین لے کر اس کے حقوق ادا کرنے مین کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی

---

[۱] ابوداؤد باب فی نقل الحدیث [۲] ابوداؤد کتاب الادب [۳] ایضاً [۴] صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق،

امانت مین خیانت کرتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین فرمایا کہ عورتون کے باب مین خدا سے ڈرو۔ فرمایا "کیونکہ تم نے اُن کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت مین لیا ہے۔"[1]

قیامت کی نشانیون مین آیا ہے کہ "سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا، اور سب سے آخر مین جو چیز رہ جائے گی، وہ نماز ہوگی، اور کتنے نمازی ہین جن کی نمازون کا کوئی حصہ خدا کے ہان نہین۔"[2] فرمایا "میری اُمت اُس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہین سمجھے گی"[3] یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی، اس کو آمدنی اور کارِ خیر مین دینے کو جرمانہ جب تک مسلمان نہین سمجھین گے، اُن کی فطری صلاحیت باقی رہے گی،

---

[1] صحیح مسلم حجۃ الوداع [2] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵، از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباس [3] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵، از سنن سعید بن منصور،

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اُس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے، عفّت اور پاکبازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصّہ ہے، آپس میں ایک دُسرے کے ساتھ مروّت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے، اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے،

اس وصف سے متّصف سب سے پہلے خود خداوند تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے جو اس کی ذاتِ اقدس کے لائق ہیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو بُرائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن اُن کو پکڑتا نہیں، اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے، اُس کو نامراد نہیں لوٹاتا، حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "عزّت اور جلال والے خدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے، تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے[1] شرماتا ہے"، ایک دفعہ تین صاحب مجلس نبوی میں آئے، آپؐ کے اردگرد

---

[1] بیہقی کتاب الاسماء والصفات الہ آباد ص ۴۰ ۔

صحابہ کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہان ذرا سی جگہ ملی، اس مین بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرے صاحب چلے گئے، آپنے فرمایا کہ مین ان صاحبون کی خبر نہ دون؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ مین آکر بیٹھا، وہ خدا کی پناہ مین آیا، تو خدا نے پناہ کی جگہ دی، اور جو پیچھے جا کر بیٹھا وہ شرمایا، خدا نے بھی اس سے شرم کی، (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا، اُس نے خدا سے منھ پھیرا[1] تو خدا نے بھی اس سے منھ پھیرا،

سورۂ بقرہ میں ہے،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا، (بقرہ-۳)	خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہین،

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے مین وہ شرماتا نہین، جیسا کہ قرآن مین دوسری جگہ ہی، وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ، (احزاب-۷) "خدا حق بات کہنے سے نہین شرماتا" حدیث مین بھی ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ[2]، "اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہین"، قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے، اس کی نسبت خدا کی طرف خدا کی غیرت وحیا کے خلاف ہے، حدیث مین آتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ غیرت مند ہے، اور اسی لئے اس نے بدکاریون کو حرام کیا ہے[3]،

---

[1] بخاری کتاب العلم وصحیح مسلم باب السلام [2] بخاری کتاب الادب باب ما لا تستحی من الحق [3] صحیح مسلم کتاب التوبہ، عربی مین غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہی مگر اس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب ہو جاتے مین، غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہین، جو محبت مین شرکت کو نہین چاہتی،

موسیٰ علیہ السّلام کو مدین کے سفر مین دو لڑکیون سے سابقہ پڑا تھا، وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھین، تاہم یہ وصف اُن مین ایسا نمایان تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا، ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیون کو پانی پلاکر پلٹ نہ جاتے، وہ اپنے مویشیون کو پانی نہین پلاتی تھین، تاکہ مردون کی کشمکش سے الگ رہین، اور جب ان کے باپ نے ان مین سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لیے بھیجا،

فَجَآءَتۡهُ اِحۡدٰىهُمَا تَمۡشِیۡ عَلَى اسۡتِحۡيَآءٍ، (قصص۔ ۳) — تو اُن دو لڑکیون مین سے ایک شرماتی اُن کے پاس آئی،

اس آیت مین واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح وستایش بھی مقصود ہی،

یہ وصف انسان مین بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے، اور اگر اس کی مناسب تربیت کیجائے، تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہے، اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگون کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے، اسی لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، ستر عورت کا خیال، نگاہین نیچی رکھنا، بے حیائی کی باتون کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا، یہان تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اسکی اجازت نہ دینا، اسی لئے ہے کہ آنکھین شرم سے جھپکتی رہین، اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ انسان یکسر بے حیا بن جائے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بچہ تھے، تو خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا، آپ اینٹین

اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے، آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی، ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا، میرا تہبند، حضرت عباسؓ نے تہبند باندھ دیا[1]، نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں،

کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردہ
اَشَدَّ حَیَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِیْ	نشین کواری لڑکی سے بھی زیادہ
خِدْرِھَا[2]،	شرمیلے تھے،

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے، جیسے سورہ احزاب میں مذکور ہے،

اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ	تمھاری اس بات سے رسول کو ایذا
فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ، (احزاب-۷)	پہنچتی تھی، تو تم سے وہ شرماتا تھا،

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیے اُس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے، جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم وحیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا، بلکہ بعض حالتوں میں اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لئے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے، شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے، اور وہ یہ ہے

---

[1] بخاری کتاب الحج باب فضل مکہ و بنیانہا [2] بخاری کتاب الادب باب الحیاء،

کہ امر حق کے اظہار مین شرم و حیا دامنگیر نہ ہو، لیکن دوسرون کی مروت سے چپ رہجانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی مین تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔[1]

یہی حیا جو ایمان کا ایک جزو ہے شرعی حیا ہے، یعنی جس طرح ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام فواحش و منکرات سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزون سے روکتی ہے، اس لئے وہ دونون ایک ہی ہین، لیکن جن لوگون مین فطرۃً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے، اُن کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے مین مدد ملتی ہے، اس لئے بذاتِ خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہین، بلکہ اصلاح کے قابل ہے، اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہان تک اظہار حق، وعظ و پند، تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے، اور شریعت نے ان موقعون پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً خدا نے قرآن مجید مین جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتون کو ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو، لیکن اگر وہ بندون کے فائدہ کی ہو تو اُس کے کہنے سے خدا نہین شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہین

[1] بخاری کتاب الادب باب الحیاء

چھوڑ دیتا، فرمایا،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۔ (بقرہ-۳)	اللہ کسی مثال کے بیان کرنے مین (ذرا بھی) نہین جھینپتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو، یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)

حضرت زینبؓ کی دعوتِ ولیمہ مین صحابۂ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتین کرتے رہے، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہین کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگون کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آدابِ نبوت کے خلاف تھا، اس لئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا،

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۔ (احزاب-۷)	اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی، اور وہ تمھارا لحاظ کرتے تھے، اور اللہ تو حق (بات) کے کہنے مین (کسی کا کچھ) لحاظ کرتا نہین،

اپنی ذاتی تکلیف کے لئے لوگون کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لئے آپ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا، اس لئے خداوند تعالیٰ نے لوگون کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے مین شرم و حیا کا موقع نہین،

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابۂ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرتی آتی ہین، اور یہ سمجھتی ہین

کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے، تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! خدا حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی، اکابر صحابہؓ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے، تاہم چونکہ کمسن تھے اس لئے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم و حیا کا موقع نہ تھا، اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی، اس لئے جب حضرت عمرؓ سے انھوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے مجھے بڑی خوشی ہوتی،[۱]

انصاریہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں، اور یہ اُن کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں،

نعم النساء نساء الانصار	انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں
لم یکن یمنعهن الحیاء ان	کہ دین کا علم حاصل کرنے سے اُن کو
یتفقهن فی الدین،[۲]	حیا نہیں روکتی تھی،

ان موقعوں یعنی تبلیغ و دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلم اور

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب ما لا یستحی من الحق للتفقہ فی الدین [۲] مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال المغتسلۃ من الحیض فرصۃ من مسک فی موضع الدم

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحیاء لا یاتی الا بخیر[1]	حیاء سے صرف بھلائی پہنچتی ہے،

اور جس شخص کو کسی بُرے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبہ حیا ہے جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی روک نہیں سکتا، اس لئے فرمایا کہ

ان مما ادرک الناس من	لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں
کلام النبوۃ الاولیٰ اذا	پائی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں
لم تستحی فاصنع ما شئت[2]	شرم وحیا نہیں تو جو چاہو کرو،

امام نووی نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے، جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔

قرآن وحدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں، اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے اسی

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحیاء [2] بخاری کتاب الادب باب اذا لم تستح فاصنع ما شئت و فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۳۴

بنا بر حدیث شریف مین آیا ہے کہ ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہی، اور اسلام کا خاص خلق[1] حیا ہی، یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخین ہین، اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہی[2] فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہان تک کہ تنہائی کی حالت مین بھی شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہین چاہئے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو، کیونکہ تمھارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہین جو صرف بول وبراز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہین، تو اُن سے شرماؤ، اور اُن کا خیال رکھو،[3] مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے،

---

[1] موطا امام مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی الحیاء [2] صحیح بخاری کتاب الایمان [3] ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع،

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، اُن کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا، اُس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگ دلی، اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے اسی لئے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے، وہ رحمٰن یعنی "بڑا رحم والا" ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام "رحیم" آتا ہے، یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے، اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے، مسلمان کو حکم ہے، جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے، دنیا میں جو کچھ ہے، وہ خدا کی رحمت کے جلوؤں کے سوا کچھ اور نہیں ہے، خدا کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں،

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً — اے ہمارے پروردگار تونے اپنی رحمت

وَعِلْمًا ، (مومن-۱) اور علم مین ہر چیز کو سما لیا ہی،

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، بلکہ

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (حشر-۳) وہ بڑا رحم والا مہربان ہی،

مسلمانون کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤن مین کہین،

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ، اور تو سب رحم کرنے والون مین

(مومنون-۶) سب سے بہتر رحم کرنے والا ہی،

دنیا مین رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہین، وہ اسی کی رحمت کے آثار اور پرتو ہین

چنانچہ حدیث مین ہے کہ "خدا نے رحمت کے سنو ٹکڑے کیے، جن مین سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لئے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا، اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہین، یہان تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤن نہین رکھتا کہ کہین اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے"[1]

بنی نوعِ انسان مین محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبرون کی ذات ہی اور پیغمبرون مین سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور خداوند تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے،

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ (لوگو! تمھارے پاس تم ہی مین کے ایک رسول آئے ہین، تمھاری تکلیف

---

[1] بخاری کتاب الادب،

عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ	ان پر شاق گذرتی ہے، (اور) اُن کو تمھاری
رَّحِيْمٌ،	بہبود کا ہر کا ہے، اور مسلمانون پر بہت
(توبہ - ۱۶)	شفیق (اور) رحیم ہین،

پیغمبرون کے بعد اگلے پیغمبرون کی امتین ہین، اور ان امتون مین سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے،

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ	اور جو لوگ اُن کے پیرو ہوئے اُن کے
اتَّبَعُوْهُ رَأْفَةً وَّرَحْمَةً (حدید - ۴)	دلون مین اور ہم نے ترس اور رحم ڈالدیا،

اور اس وصف مین اُمت محمدیہ بھی ان کی شریک وسہیم ہے،

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى	اور جو لوگ محمدؐ کے ساتھ ہین وہ کافرون
الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح - ۴)	پر زور آور ہین، آپس مین رحم دل ہین،

آپس کے تعلقات مین ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلہ رحم کہتے ہین، کیونکہ قرابتون کے سارے رشتے رحمِ مادری سے پیدا ہوتے ہین، اور رحم رحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہین، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے، اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا مین پیدا ہوا ہے، حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا،

الرحم شجنۃ من الرحمٰن،[1]	رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی شاخ ہے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ،

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے، اور ساری محبتون کے جذبے اس کی شاخین ہین، بچون کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہین کہ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے، پھر دونون زانون کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونون پر رحم کر کیونکہ مین ان دونون پر رحم کرتا ہون۔[۱]

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور اس کو لپٹانے لگا، آپ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ "تم اس پر رحم کرتے ہو"؟ اس نے کہا ہان، ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو، اور وہ سب رحم کرنے والون سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔[۲]

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن علیہ السلام کا بوسہ لیا، اقرع ابن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہین، مین نے ان مین سے کسی کا بوسہ نہین لیا، آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ جو شخص رحم نہین کرتا اس پر رحم نہین کیا جاتا۔

ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچون کو چومتے ہین، لیکن ہم لوگ نہین چومتے، ارشاد ہوا کہ خدا نے جب تمھارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے۔[۳]

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الفخذ [۲] ادب المفرد باب رحمۃ العیال [۳] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ۔

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹون پر ترس کھانا امتِ محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اس لئے فرمایا کہ "جو شخص ہمارے چھوٹون پر رحم نہین کرتا، وہ ہم مین سے نہین ہے"[1] اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے، کہ رحم ہمیشہ چھوٹون اور زیردستون پر کھایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹون تک نہین، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹون تک وسیع ہے،

خود اپنی قوم کی ہمدردی محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے اسی لئے قرآن مجید نے صحابۂ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے، "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" یعنی وہ لوگ آپس مین رحمدل ہین، اور حدیث مین اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال مین بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانون کی باہمی رحمدلی، باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دکھ پہنچتا ہے، تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے[2] جس کے معنی یہ ہین کہ جذبۂ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانون کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہین، اور انفرادی طور پر مسلمان کے تمام افراد اس جسم کے اعضا اور جوارح ہین اس لئے جس طرح ایک عضو کے درد دکھ مین تمام جسم شریک ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے درد دکھ مین تمام مسلمانون کو شریک ہونا چاہئے

اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے، وہ مسلمانون ہی کے ساتھ مخصوص نہین ہے بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اور اس مین تمام بنی نوع انسان شامل ہین چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثون مین عام رحم کی تعلیم دی ہے، اور فرمایا ہے کہ جو شخص

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان [2] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم،

انسانون پر رحم نہین کرتا، خدا بھی اُس پر رحم نہین کرے گا، یہ بھی فرمایا کہ "رحم کرنے والون پر رحم کرنے والا خدا رحم کرے گا، زمین والون پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا"[۱]

رحم دلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوعِ انسانی ہی تک محدود نہین ہے، بلکہ اس مین بے زبان جانور بھی شامل ہین، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا، تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا"[۲] ایک شخص نے آپ کی خدمت مین عرض کی کہ مین بکری کو ذبح کرتا ہون تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کرون، آپنے دو بار فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا بھی تم پر رحم کرے گا"[۳]

جانورون کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا، اور اب بھی جاری ہے وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا، اس لئے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی[۴]،

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظون مین دی ہے، جو بلاغت کی جان ہین، فرمایا،

مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ،[۵] جو رحم نہین کرتا اس پر رحم نہین کیا جاتا

اُن دو لفظون کی تشریح دفترون مین نہین سما سکتی، رحم دلی کا ہر منظر، اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ اُن ہی دو لفظون سے اُبھارا جا سکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسرون

---

[۱] بخاری ابواب البر والصلة باب ما جاء فی رحمة الناس [۲] ادب المفرد باب رحمة البهائم [۳] ادب المفرد باب ارحم من فی الارض [۴] ابو داود کتاب الجهاد باب فی التحریش بین البهائم [۵] صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمة الناس والبهائم،

پر رحم نہین کرتا، اس پر خدا بھی رحم نہین فرمائے گا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسرون پر رحم نہین کھاتا، تو دوسرے بھی اس پر رحم نہین کھائین گے، محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح مین لکھا ہے کہ اس مین تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لیے اس مین مسلمان، کافر، مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہین اور اُن کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا، اُن پر ہلکا بوجھ لادنا، اور اُن کو بہت نہ مارنا، یہ سب چیزین اسی رحم مین شامل ہین،[1] غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم تیمیون کی غمخواری، بیکسون کی تسکین، بیمارون کی تسلی، غریبون کی امداد، مظلومون کی حمایت، اور زیر دستون کی اعانت کرتے ہین، اور اس حدیث نے حلم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لیے مبارک ہین وہ جو رحم کرتے ہین کہ اُن پر رحم کیا جائے گا،

[1] فتح الباری جلد ۱۰ ص ۳۶۸ مصر،

عدل و انصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصّوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دونوں میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اُس کو عربی میں "عدل" کہتے ہیں[1]، اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے، اور وہی بات کہی، اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہو گا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلّہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علماء نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اُس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے، اور وہی کرتا ہے جو حق ہے[2]، قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے، فرمایا۔

---

[1] مفردات راغب اصفہانی [2] کتاب الاسماء والصفات بیہقی، ص ۷۱، الہ آباد

وَاللّٰہُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ ؕ (مومن۔۲) اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے،

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت مین ہے،

وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ (احزاب۔۱) اور اللہ حق بات کہتا ہے،

یہ اللہ تعالیٰ کے عدلِ قولی کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ دونون باتین قرآن پاک کی ذیل کی آیت مین یکجا ہین،

وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا اور تیرے رب کی بات سچائی ، اور

وَّعَدْلًا ؕ (انعام۔۱۴) انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی،

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات مین اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے، اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے،

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا خدا نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی

ہُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ اور خدا نہین اور فرشتون نے اور علم والون

قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ (اٰل عمران۔۲) نے، وہی خدا انصاف کو لے کر کھڑا ہے،

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل وانصاف صرف نظم وسلطنت ہی کے لیے مخصوص نہین ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ مین عدل کی ضرورت ہے، اور نظام عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت مین جن

اچھی باتون کا حکم دیا ہے، ان مین سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم ہے، فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (نحل - ۱۳) — بے شبہہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے،

عدل قانون کا اقتضا ہے، اور احسان کرنا اور درگذر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نظم عالم کو قائم رکھنے کے لئے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے، اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے، پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہین کیا ہے، بلکہ زندگی کے اہم شعبون کو لے کر ان مین عدل و انصاف کا حکم دیا ہے، مثلاً معاشرتی زندگی مین عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگون کو ہوتی ہی جو ایک سے زائد عورتون سے نکاح کرتے ہین، اس لئے ان لوگون کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے،

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ، (نسآء - ۱) — پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیون مین) انصاف نہ کر سکو گے، تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمھارے قبضہ مین ہو،

عورتون کی طرح یتیمون کے حقوق کی حفاظت کے لئے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے، اس لئے فرمایا

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ (نسآء) — اور خاص کر یہ کہ یتیمون کے حق مین انصاف ملحوظ رکھو،

عام معاملات میں عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید وفروخت

میں وزن وپیمانہ میں ہے، اس لئے فرمایا،

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ	اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری)
بِالْقِسْطِ (انعام - ۱۹)	ناپ کرو، اور (پوری پوری) تول،

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے، کیونکہ خرید وفروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے، جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس لئے وزن وپیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے، وہ نہایت عام ووسیع ہے، اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی کرنے سے انسان کی سخت دنائت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے

عدل وانصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے، اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل وانصاف کا لحاظ رکھا ہے، تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ	اور تمھارے باہمی قرارداد کو، کوئی
بِالْعَدْلِ، (بقرہ - ۳۹)	لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے،
فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ	پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا اگر وہ
سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ	کم عقل ہو یا معذور یا خود ادا ے
اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ	مطلب نہ کر سکتا ہو، تو (جو) اس کا

بِالْعَدْلِ ۔

(بقرہ - ۳۹)

مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے،

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتون مین اکثر لوگون کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو، یا اُس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت مین بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہین رکھتی،

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ
كَانَ ذَا قُرْبٰى ۔

(انعام - ۱۹)

اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیون نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا
قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ
عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔

(مائدہ - ۲)

مسلمانو! خدا واسطے انصاف کیساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگون کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات مین) انصاف نہ کرو نہین ہر حال مین انصاف کرو کہ (شیوۂ) انصاف پرہیزگاری سے قریب تر ہے،

پہلی آیت مین یہ بتایا گیا ہے کہ تمھاری باہمی دوستی ومحبت تم کو بے انصاف نہ بنائے

اور دوسری آیت مین یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے، اور یہ کہ ہر حال مین عدل و انصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے،

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے اس پر بھی رسولِ اسلام علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے وحیِ الٰہی یہ کہلواتی ہے،

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	اور کہدے کہ مین ہر اُس کتاب کو مانتا
مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ	ہون جو اللہ نے اتاری، اور مجھے (خدا
بَيْنَكُمُ ۖ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ	سے) یہ حکم ملا ہے کہ مین تمھارے بیچ
لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۖ	مین انصاف کرون، اللہ رب ہے
لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اَللّٰهُ	ہمارا اور تمھارا، ہم کو ہمارے کامون
يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ	کا بدلہ ملنا ہے، اور تمکو تمھارے
	کامون، ہم مین تم مین کچھ جھگڑا نہین،
(شوریٰ - ۲)	اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیتِ پاک مین ہے، اس کے کئی پہلو ہین، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے، اس کو مین برابر برابر تم سب کو پہنچا دون، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمھارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل و انصاف کرتا ہے، اور تیسرا یہ کہ اب تک تم مین مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولتمندون اور عزت والون کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگون کے ساتھ

سختی کا قانون برتا جائے، میرے خدا نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے، اور یہ حکم دیا ہے کہ عام و خاص، اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکسان اور برابری کا سلوک کیا جائے، کیونکہ ہمارا تمھارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اُس کے غلام ہین، اس لیے اس کے سب غلامون کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے، ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمھارے اعمال کا بدلہ ملے گا، اس مین جھگڑنے کی کوئی بات نہین، سب کو قیامت مین اُس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اُس کو پسند آئے گا، اس کو ویسا انعام ملے گا، اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی،

عدل و انصاف کی راہ مین ان دونون سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ مین بھی عدل و انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم کی روشنی مین اہلِ ایمان کو اس کٹھن منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشادِ خداوندی ہوا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	اے ایمان والو! انصاف کی حمایت
قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ	مین کھڑے ہو، اللہ کے لئے گواہ بنو،
لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ	اگرچہ تمھارا اپنا اس مین نقصان ہی
وَالْأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيًّا	ہو، یا ماں باپ کا، یا رشتہ دارون کا،
أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا	اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے، تو
فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا	اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیرخواہ ہے تو تم

وَاِنْ تَلْوٗاۤ اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا،	انصاف کرنے مین اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان موڑوگے یا کچھ بچاؤ گے تو اللہ تمھارے کام سے واقف ہے،
(نساء - ۲۰)	

ان آیتون مین عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات مین عدل وانصاف کی حمایت تمھارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو، اور خدا واسطے کہو، عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی مین نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ مین آئے، نہ عزیزون اور قرابت دارون کا، نہ دولتمند کی طرفداری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی مین کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچالیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی مین دولتمند کی خاطر نہ کرو، اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ، اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کرو یا کہو، پھر سچ کہنے مین کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہہ مین پڑجائے، یا پوری بات نہ کہو، کچھ چھپالو، تو یہ سب باتین عدل اور انصاف کے خلاف ہین، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ مین رد و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ مین ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہو جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہی، غرض یہ ہی کہ عدل وانصاف کی راہ مین کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لئے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے،

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرف دارانہ گواہی دیتا ہے، وہ غلطی مین مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہین ہو سکتا، اس لیے نہ گواہون کو اس لیے طرفداری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل مین لانا چاہیے، بلکہ دونون کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیے، کہ وہی اُن کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھکر دلی ہے، لوگ عدل وانصاف کے فیصلہ یا گواہی مین اسی لیے غلط بیانی کرتے ہین کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے، اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونون بندون کے حق مین تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمھاری کم بین نظر تو اُس پاس تک جاکر رہ جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر مین سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندون کے ساتھ وہ کرتا ہے، جس مین اُن کی بھلائی ہی غور کیجئے کہ ان لفظون مین عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی مین کسی خاص انسان کی بھلائی کیلئے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھیے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دو یا تو کیا یہ صحیح نہین ہے، کہ اس نے اس طرح حقیقت مین سچائی کا خون کر کے نظمِ عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ غلط گو انسان کی محدود نگاہ مین

صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع ونقصان کا خیال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے، جس کا ایک فردہ خاص انسان بھی ہے، اسی لئے رشوت دے کر حاکمون کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مین گناہ ہے، اور بعض مفسرون کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت مین :-

وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا	اور نہ مال حاکمون تک پہنچاؤ تاکہ لوگون
فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ	کے مال مین سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ
وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (بقرہ-۲۳۰)	اور تم جان رہے ہو،

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے[۱]

دو شخصون یا دو گروہون مین مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لئے اس مین بھی عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے، اور کس حالت مین دیا گیا ہے جب دونون طرف سے تلوارین میان سے نکل چکی ہون اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کے گر رہی ہون، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیون مین بجھ رہا ہو، اس عالم مین بھی مسلمانون سے یہی کہا گیا کہ عدل وانصاف کا دامن ہاتھون سے نہ چھوٹے، فرمایا،

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ	اور اگر (تم) مسلمانون کے دو فرقے باہم

---

[۱] تفسیر روح المعانی،

اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا	ہیں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو پھر
فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى	اگر اُن میں کا ایک (فرقہ) دوسرے
الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ	پر زیادتی کرے، تو جو زیادتی کرتا ہے
حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ	اس سے تم (بھی) لڑو، یہاں تک
فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا	کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے،
بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ	پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں
يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ،	برابری کے ساتھ صلح کرا دو، اور
	انصاف کو ملحوظ رکھو، بیشک اللہ
(الحجرات - ۱)	انصاف کرنیوالوں کو محبوب رکھتا ہے،

عدل وانصاف حکومت وسلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لئے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں، اسی لئے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو، ارشاد ہوا،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا	امانت والوں کو پہنچاؤ، اور یہ کہ جب
حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ	لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے
تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ، (نساء - ۸)	لگو، تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو،

اہل تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں "امانت" سے مراد منصفانہ فیصلہ اور

منصفانہ حق ہے، جو ایک کا دوسرے پر چاہیے، خدا نے اس آیت مین اسی منصفانہ فیصلہ اور
حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے، اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے، اور یہ
فیصلہ دوست دو دشمن، کافر و مسلم سب کے ساتھ یکسان عدل و انصاف کیساتھ ہونا چاہیئے
چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیون کے معاملات مین حکم ہوا،

وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ	اور اگر فیصلہ کرو تو ان مین انصاف کے
بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ	ساتھ فیصلہ کرنا، کیونکہ اللہ انصاف
(مائدہ ۷-۶)	کرنے والون کو دوست رکھتا ہے،

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف
کرنے والون کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے
اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے، یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس
کے لئے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآنِ مجید مین اگرچہ اس کی کوئی تصریح
نہین کی گئی ہے، تاہم اشاراتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہو اس کیلیے
یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوتِ نطق سے محروم
نہ ہو، صاحب علم ہو، چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے،

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ	اور خدا ایک دوسری مثال دیتا ہے
اَحَدُھُمَآ اَبْکَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی	کہ دو آدمی (ہین) ان مین کا ایک
شَیْءٍ وَّھُوَ کَلٌّ عَلٰی مَوْلٰىہُ	گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ وہ) اپنا

اَیْنَمَا یُوَجِّھْہُ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ
ھَلْ یَسْتَوِیْ ھُوَ وَمَنْ یَّاْمُرُ
بِالْعَدْلِ وَھُوَ عَلٰی صِرَاطٍ
مُّسْتَقِیْمٍ ۝

(النحل - ١٠)

غلام کہ خود کچھ نہین کرسکتا، اور (گونگے
ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بار
خاطر بھی ہے کہ جہان کہین اُس کو بھیجے
اس سے کچھ بھی ٹھیک نہین بن آتا، کیا
ایسا غلام اور وہ شخص (دونون) برابر
ہو سکتے ہین، جو (لوگون کو) عدل و
انصاف کی تاکید کرتا ہے، اور وہ خود
بھی سیدھے راستہ پر ہے

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر مین لکھتے ہین کہ وہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے، اس کو صفت نطق سے متصف ہونا چاہیئے، ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا، اور قادر ہونا چاہیئے کیونکہ حکم سے علوے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے، اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوے مرتبت حاصل نہین ہو سکتا، اور عالم ہونا چاہیئے تاکہ ظلم و انصاف مین تمیز کرسکے، اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف کی صفت، قدرت اور علم دونون کو شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے، تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیئے، پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہین رکھتا تو دوسرے کو صاحبِ قدرت ہونا چاہیئے پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہین آتا، اس لئے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیئے تاکہ وہ ہر کام سلیقہ سے کرسکے،

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے، کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے، وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی

شعبہ ایسا نہین ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حادی نہ ہو،

ان آیات کے رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے، تاہم امام وحاکم وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لئے حدیث مین امام عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، سات شخصون کو خدا اپنے سایہ مین لے گا، جن مین ایک شخص امام عادل ہوگا[1]

---

[1] بخاری کتاب المحاربین، باب فضل من ترک الفواحش،

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول وقرار کر لیا جائے اُس کو پورا کرنا ایک راست بازی کا شعار ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ، (آل عمران ۱۰ رعد) بے شبہہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ الْمِیْعَادَ، (زمر-۲) اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ، (آلِ عمران-۲۰) (اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

وَعْدَ اللّٰہِ ط لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ، (روم-۱) اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (حج-۶) اور اللہ ہر گز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ،

فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَھْدَہٗ (بقرہ-۹) تو البتہ اللہ اپنے قول وقرار کے خلاف نہ کرے گا،

وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ (توبہ-۱۴) اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنیوالا کون ہے؟

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اسکے بندونکی خوبیون مین سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کرین وہ پورا کرین، اور جو قول وقرار کرین اُس کے پابند رہین، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منھ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے، اور کسی سے جو قول وقرار کرے، اُس کا پابند نہ رہے،

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہین، لیکن اسلام کی نگاہ مین اس کی حقیقت بہت وسیع ہے، وہ اخلاق معاشرت، مذہب اور معاملات کی اُن تمام صورتون پر مشتمل ہے، جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے، اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی، اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لئے قرآن مجید مین بار بار اس کا ذکر آیا ہے، اور مختلف حیثیتون سے آیا ہے، ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ مین ہے،

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا (بقرہ - ۲۲)	اور اپنے قرار کو جب قول دین پورا کرنے والے،

بعض آیتون مین اس کو کامل الایمان مسلمانون کے مخصوص اوصاف مین شمار کیا گیا ہے،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ (مومنون ۱)	اور وہ جو اپنی امانتون اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہین

ایک دوسرے سورہ مین جتنی مسلمانون کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اُس تصویر

کا ایک رُخ یہ ہے،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ	اور وہ جو اپنی اما نتون کا اور اپنے عہد
رٰعُوْنَ (معارج - ۱)	کا پاس کرتے ہین،

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے، جو عہد کے وسیع معنی مین داخل ہے، اس لئے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا، اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانون کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا، اس کے برعکس ایک آیت مین پہلے عہد کی عام پابندی کا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا،

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ	اور عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ (قیامت
کَانَ مَسْئُوْلًا، وَاَوْفُوا الْکَیْلَ	مین) عہد کی بازپرس ہوگی، اور جب
اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ	ناپ کرو، تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو،
الْمُسْتَقِیْمِ، ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ	اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی
اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا،	رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر طریق
(بنی اسرائیل - ۴)	ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے،

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لئے تاکیداً پابندیِ عہد

کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لئے زبانی قول وقرار کی ضرورت نہین، بلکہ عرفِ عام کے سارے مسلّمات سوسائٹی کے قول وقرار ہین،

تمام عہدون مین سو سب سے پہلے انسان پر اُس عہد کو پورا کرنا واجب ہے، جو خدا اور اس کے بندون کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے، جو روزِ الست کو بندون نے اپنے خدا سے باندھا، اور جس کا پورا کرنا اُن کی زندگی کا پہلا فرض ہے، اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت مین کیا گیا ہے، اور تیسرا وہ عہد ہے، جو عام طور سے قول وقرار کی شکل مین بندون مین آپس مین ہوا کرتا ہے، اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے، اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے،

اَلَّذِیۡنَ یُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ	جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا
وَلَا یَنۡقُضُوۡنَ الۡمِیۡثَاقَ وَ	کرتے ہین، اور اپنے اقرار کو نہین
الَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ	توڑتے، اور جو خدا نے جن تعلقات
بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ،	کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، ان کو جوڑے
(رعد-۳)	رکھتے ہین،

اس آیت مین پہلے اس فطری عہد کے ایفاء کا ذکر ہے، جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اُس قول وقرار کا جو باہم انسانون مین ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری

عہد کا ہے، جو خاص کر اہلِ قرابت کے درمیان قائم ہے۔

سورۂ نحل مین اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو خدا کو حاضر وناظر بتا کر یا خدا کی قسمین کھا کھا کر بندے آپس مین کرتے ہین، فرمایا،

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا	اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس مین
عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا	ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس
الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا	کو پورا کرو، اور قسمون کو پکی کرکے
وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ	توڑا نہ کرو، اور اللہ کو تم نے اپنے پر
كَفِيْلًا، (نحل - ۱۳)	ضامن ٹھہرایا ہے،

اس معاہدہ کے عموم مین صحابۂ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہین، جو اسلام لاتے وقت انھون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے، اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہین، جو جاہلیت مین کسی اچھی غرض سے کئے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس مین آجاتے ہین، جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمین کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کرین،

سورۂ انعام مین ایک اور عہدِ الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے، فرمایا،

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ	اور اللہ کا قرار پورا کرو، یہ اس نے
وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ،	تم کو نصیحت کر دی ہے، تاکہ تم
(انعام - ۱۹)	دھیان رکھو،

اس عہدِ الٰہی مین خدا کے وہ فطری احکام بھی داخل ہین جن کے بجالانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے، یا خدا نے تم سے لیا ہی، اسی طرح اُس نذر اور منّت کو مشتمل ہی جس کو خدا کے مقدّس نام سے تم نے مانا ہے، اور انسانون کے اس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے، جو خدا کی قسمین کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہین،

صلح حدیبیہ مین مسلمانون نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا، کہ فریقِ مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی، اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی، اس حالت مین اس معاہدہ کا توڑ دینا، کیا مشکل تھا، مگر یہی وُہ وقت تھا جس مین مسلمانون کے مذہبی اخلاق کی آزمایش کی جاسکتی تھی، کہ اپنی قوت اور دشمنون کی کمزوری کے باوجود وہ کہان تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہین، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی، اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال مین اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکون نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، ان سے لڑنے کی اجازت گو دے دی گئی تھی، اور مکہ فتح بھی ہوچکا تھا، پھر یہ حکم ہوا کہ اُن کو چار مہینون کی مہلت دو،

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ	اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے
اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ	اُن مشرکون کو پورا جواب ہی جن
الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ	سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لو
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا	(تم اے مشرکو!) ملک مین چار مہینے

اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ (توبہ) — اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے،

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکون اور مسلمانون کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہین رہی، تو ساتھ ہی ان مشرکون کے ساتھ ایفاے عہد کی تاکید کی گئی جنھون نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا، فرمایا،

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ — مگر جن مشرکون سے تم نے عہد کیا تھا،

الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ — پھر انھون نے تم سے کچھ کمی نہین کی،

شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ — اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی

اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ — تو اُن سے ان کے عہد کو اُن کی مقررہ

اِلٰى مُدَّتِهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ — مدت تک پورا کرو، بے شک اللہ

الْمُتَّقِيْنَ، (توبہ-۱) — کو خوش آتے ہین تقوی والے،

اور ان مشرکون کے ساتھ اس ایفاے عہد کو اللہ تعالی تقوی بتاتا ہے، اور جو اس عہد کو پورا کرین اُن کو متقی فرمایا، اور اُن سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا، آگے بڑھ کر اُن مشرکون سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنھون نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، اللہ تعالی مسلمانون کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش مین ان عہد شکن مشرکون کیساتھ اُن مشرکون کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جاے جنھون نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہی،

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ — مشرکون کو کیسے اللہ کے پاس اور اسکے

عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ — رسول کے پاس کوئی عہد ہو، مگر وہ

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ	جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا	معاہدہ کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے
لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ	رہیں تم ان سے سیدھے رہو بیشک
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ-۲)	اللہ کو تقوی والے خوش آتے ہیں،

سیدھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو، اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں، ان کا شمار تقوی والوں میں ہے، جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے، اور تقوی والے اللہ تعالی کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفاء اللہ تعالی کی خوشی اور پیار کا موجب ہے، اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے،

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا	مسلمانو! (اپنے) قراروں کو
بِالْعُقُوْدِ، (مائدہ-۱)	پورا کرو،

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں، اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے، اور اصطلاحِ شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:-

"اوفوا بالعھد" خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے، "یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" اور اس قول مین تمام عقد مثلاً عقد بیع، عقدِ شرکت عقد یمین عقد نذر عقدِ صلح اور عقدِ نکاح داخل ہین اخلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دو انسانون کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونون پر اس کا پورا کرنا واجب ہے"[1]

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا، صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہان تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے، حسن عہد مین داخل ہے، صحیح بخاری مین حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ "مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہین آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کیا کرتے تھے، اور بکری ذبح کرتے تھے، تو اُس کا گوشت اُن کی سہیلیون کے پاس ہدیۃً بھیجا کرتے تھے"[2] یعنی حضرت خدیجہ رضؓ کی وفات کے بعد بھی اُن کی سہیلیون کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا، جو اُنکی زندگی مین جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب مین ایک باب باندھا ہے جس کی سُرخی یہ ہے "حسن العھد من الایمان" اور اس باب کے تحت مین اسی حدیث کا ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری مین حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۵۰۵ [2] بخاری کتاب الادب باب حسن العھد من الایمان،

ایک بڑھیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئی، آپنے اُس سے کہا کہ تم کیسی ہو، تمہارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا، ؟ اُس نے کہا کہ اچھا حال رہا جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہ رضی نے کہا کہ آپنے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی ؟ فرمایا عائشہ! یہ خدیجہ کے زمانہ مین ہمارے یہان آیا کرتی تھی، اور حسنِ عہد ایمان سے ہے" یعنی اپنے ملنے جلنے والون سے حسب توقع یکسان سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مشہور حدیث مین فرمایا ہے، اور حضرت انس رض کہتے ہین کہ آپ ہر خطبہ مین اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے،

لَا دِینَ لِمَن لَا عَھدَ لَہٗ (احمد طبرانی وابن حبان) جس مین عہد نہین، اس مین دین نہین،

یعنی اُس قول و قرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے، یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے، جس کے مجموعہ کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہین کرتا وہ دین کی روح سے محروم ہے،

احسَان

یعنی

بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، اور اس لئے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ اُن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو، اور اس کو آرام پہنچے،

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا، جس کے احسانات کی حد و پایان نہیں، عرش سے فرش تک جو کچھ ہے، وہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے،

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ	اور اگر اللہ کے احسان گنو، تو ان کو
لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ	پورا نہ گن سکوگے، بیشک انسان
لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، (ابراھیم-۵)	بے انصاف ناشکرا ہے،

حضرت یوسف علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے اس احسان کا شکر کہ اس نے کسی سعی

وسفارش کے بغیر اُن کو قید خانہ سے نجات دی، اور وہ اُن کے ماں باپ اور بھائیون کو مصر لے آیا، اُن لفظون مین ادا کرتے ہین،

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْ اِذْ اَخْرَجَنِیْ	اور خدا نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے
مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ	قید خانہ سے باہر لایا اور آپ لوگون
الْبَدْوِ، (یوسف - ۱۱)	کو گاؤن سے یہان لے آیا،

اسی طرح قارون کے قصّہ مین اللہ تعالیٰ کے صفتِ محسن سے متّصف ہونے کا اشارہ موجود ہے، فرمایا :-

اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ۔ (قصص) تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا،

(حاشیہ ص ۴۷۷) لہ اس موقع پر ایک بات خیال مین رہے، عربی مین احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہین، اُردو مین جن معنون مین ہم احسان کا لفظ بولتے ہین، عربی مین جب خاص وہ معنی مراد ہون گے، تو عموماً اس کا استعمال مشتقات مین (الیٰ) یا ب کے صلہ کے ساتھ ہوگا، قرآن پاک مین جہان جہان مُحْسِنْ یا مُحْسِنِیْنَ یا مُحْسِنُوْنَ کے لفظ بلا صلہ آئے ہین، اُن سی حسب موقع احسان کرنے اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لئے جائین گے، اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت مین احسان وکرم بھی داخل ہو سکتا ہے لیکن وہ اسی پر محدود نہین ہے جیسے،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ، (توبہ - ۱۵)	بے شبہہ خدا اچھے کام کرنے والون کی مزدوری برباد نہین کرتا،
لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّۃً فَاَکُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (زمر - ۶)	کاش اگر میرے لئے لوٹ کر جینا ہوتا تو مین اچھا کام کرنے والون مین سے ہوتا
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ، (آل عمران - ۱۴)	اور اللہ احسان کرنے والون کو دوست رکھتا ہے،

اس دنیا مین جہان قدم قدم پر اڈلا بدلا اور داد و ستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامنگیر ہے، احسان، حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے، اور قرآن مجید مین جابجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے، چنانچہ سورۂ نحل مین حکم کی صورت مین ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	اللہ انصاف اور (لوگون کے ساتھ)
وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی،	احسان کرنے کا اور قرابت والون
(نحل - ۱۳)	کو دینے کا حکم دیتا ہے،

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروا نہین کرتا، وہ ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان مین اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت دارون کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہین، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہین، اور عام لوگون کے علاوہ باپ، مان، قرابت دار، یتیم محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اُس کے سب سے زیادہ مستحق ہین، اس لئے خداوند تعالیٰ نے سورۂ نساء کی ایک آیت مین (رکوع - ۵) ان لوگون کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے، اور باپ مان کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتون مین تاکید کی ہے (بقرہ - ۹ زخرف - ۲، انعام ۱۶، اسرائیل - ۳)

بہرحال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض مین داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے، اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ	اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان
(قصص - ۸)	کیا ہی تو بھی (اوروں کیساتھ) احسان کر،

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو قیدخانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہین،

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ	اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور
مِنَ السِّجْنِ،	بھی بڑے بڑے) احسان کئے ہین کہ
(یوسف - ۱۱)	(بے کسی کی شفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتین ہین، اُن کے علاوہ اور بھی سیکڑون شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہین جن کو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً عورتون کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا، جس سے روکا گیا، اور فرمایا گیا کہ کسی عورت کو اپنی زوجیت مین رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کردو، فرمایا،

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ،

(بقرہ - ۲۹)

طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں، جو) دو دفعہ (کرکے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے، یا حسن سلوک کیساتھ

رخصت کردینا

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کردو، اور اس کی ادائی میں لیت ولعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو، فرمایا،

فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ،

(بقرہ - ۲۲)

پھر جب (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جزا (قصاص) معاف کردیا جائے، تو (اجان کے بدلے خونبہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارث مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خونبہا کا) ادا کردینا ہے

قصور واروں کے قصور کو معاف کرنا، اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی خدا کے محبوب بندوں میں ہوں گے،

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ، اور اللہ ان محسنون (یا نیکی کرنیوالون) کو پیار کرتا ہے،

(آلِ عمران - ۱۴)

احسان کے لئے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے۔ اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کئے بغیر اس کو طلاق دے دے، تو شوہر پر نصف مہر[1] واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا، مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کردے، اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حُسنِ خُلق ہے، اور یا شوہر پورا ادا کردے، اور آدھا کاٹے نہین، تو یہ مرد کا حُسنِ خلق ہے، اس کے بعد ارشاد ہے،

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ، اِنَّ اور آپس[2] مین فضل کو مت بھولو، بے

اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ، شک اللہ تمھارے کامون کو

(بقرہ - ۳۱) دیکھ رہا ہے،

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہوجائے، جس سے ناراضی پیدا ہو جائے، تو بھی احسان والون کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کرین، اور اپنے احسان سے باز نہ آئین[3]، فرمایا،

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ اور تم مین جو احسان او گشایش والے

۱؎ یعنی جس حالت مین کہ مہر مقرر ہو چکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہین ۲؎ سعید سے روایت ہے "آپس مین فضل کو مت بھولو" یعنی احسان کو مت بھولو" ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۷۱ مصر ۳؎ کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکورہ بعضون نے یہان "فضل" سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل سے مال مراد لیا ہے

مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا	ہین، وہ قرابت دارون، غریبون
اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	اور خدا کی راہ مین ہجرت کرنے والون
وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	کو نہ دینے کی قسم نہ کھالین، اُن کو چاہئے
وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا (نور-۳)	کہ معاف کرین اور درگذر کرین،

احسان کے اسی وسیع معنی مین اسلام نے ایک اور جامع لفظ معروف کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو، معروف مین داخل ہی، قرآن کا حکم ہے کہ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ (اعراف-۲۴) اور نیکی کرنے کو کہہ، اور اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہی کہ

کُلُّ معروف صدقة	ہر نیکی ثواب کا کام ہی،

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے کہ جس کے لئے غریب و امیر کی تخصیص نہین، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہی، اسی لیے آپ نے فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے"، صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے" فرمایا "کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ" اگر اُس کو کمانے کی قدرت نہ ہو، یا وہ نہ کمائے" فرمایا غریب حاجتمند کی اعانت کرے" صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟ فرمایا نیکی کرنے کا حکم دے" صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے، ارشاد ہوا کہ بُرائی سی باز رہی، کیونکہ یہ اس کے لئے صدقہ ہے" اسی معنی کے لحاظ سے حدیث مین آیا ہے کہ "آدمی اپنے اہل وعیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے، وہ صدقہ ہے، کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا

بھی اسی مین داخل ہے ۱؎ ؛

اسی معنی مین قرآن مجید نے ایک اور لفظ "بِرّ" کا استعمال کیا ہے، اور اس وسیع دائرہ مین کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے،

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (ممتحنہ - ۲)

جو لوگ تم سے دین کے بارے مین نہین لڑے، اور انھون نے تم کو تمھارے گھرون سے نہین نکالا، ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو خدا تم کو منع کرتا نہین (کیونکہ) اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والون کو دوست رکھتا ہے،

صحابہ مین کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلمون پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہین سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشا تمھارا نہین، میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم، اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی، اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیئے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملیگا، ارشاد ہوا،

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ

تیرا ذمہ نہین ان کو راہ پر لے آنا، لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے اور تم جو دوگے خیرات سو اپنے

۱؎ صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقۃ مع فتح الباری ۲؎ ابن جریر و ابن کثیر بحوالہ نسائی تفسیر آیت مذکورہ

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ — واسطے اور تم نہین دیا کرتے لیکن اللہ
اللّٰہِ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ — کی خوشی چاہ کر، اور جو دوگے خیرات
یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ — وہ تم کو پوری مل جائے گی، اور تمہارا
(بقرہ ۳۷-۲۷) — حق مارا نہ جائے گا،

گو یہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگر اس کی وسعت مین ساری دنیا سمائی ہے نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دارومدار ہے، جو نیک کام کرین گے اُن کو خدا کے ہان سے نیک ہی جزا ملے گی ارشاد ہوا،

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا — بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر
الْاِحْسَانُ، (رحمان-۳) — بھلائی،

گو یہ آیت پاک اپنے سیاق کے لحاظ سے آخرت مین نیک کامون کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظون کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونون کو شامل ہے،

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے، قرضدارون پر احسان کرنا ضرورت مندون کو قرض دینا اور تنگدست مقروضون کو مہلت دینا، جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہون، اُن کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے،

عرب مین سود خواری نے لوگون کو اس قدر بے رحم اور سنگدل بنا دیا تھا کہ جو لوگ

قرض نہین ادا کر سکتے تھے، وہ غلامون کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے، اور جو قیمت ملتی تھی، اُس سے اُن کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمدن کے زمانہ مین قرض کی زنجیر مقروضون کے لیے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے،

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۔	اور اگر (کوئی) تنگدست (تمھارا مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمھارے حق مین یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو اصل قرضہ بھی) بخش دو،
(بقرہ ۔ ۳۸)	

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث مین خود خداوند تعالی کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ "قیامت کے دن مین خود تین آدمیون کا فریق ہون گا، جن مین ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی" [1] اس کو اور بھی موکد کر دیا، اور قرض کے معاملہ مین تنگدستون پر احسان کرنے کی متعدد صورتین بتائی ہین یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف

---

[1] بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حرا مع فتح الباری،

یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف مین ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہین کرتا تھا، لوگون کو قرض دیتا تھا، اور جب اس کو کوئی مقروض تنگدست نظر آتا تھا، تو اپنے ملازمون سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو، شاید خدا ہم سے بھی درگذر کرے، چنانچہ خدا نے اس کے صلہ مین اس سے درگذر کیا، دوسری حدیث مین ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا جس سے موت کے بعد فرشتون نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہین، فرشتون نے کہا ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ مین لوگون کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے مین آسانی کرتا تھا، اور اگر تنگدست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا، اور تنگدست کا قرض چھوڑ دیتا تھا،[1]

اس قسم کی بہت سی روایتین ہین، ایک حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے،[2] یہی روایت مسند ابن حنبل مین ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ مین ہوگا،[3]

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسرون کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی مین محدود نہین کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی راہ مین وسیع کر دیا ہے، زندگی تو زندگی

---

[1] بخاری کتاب البیوع باب من انظر معسرا و باب من انظر موسرا و صحیح مسلم باب فضل انظار المعسر [2] مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار المعسر، [3] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۳۰۸،

موت میں بھی اُس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے تو اگر تمھیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اُس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو، اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔[1]"

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے، اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہیئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں کسی شخص کے پاس سے گذرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا تو کیا جب اُس کا گذر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں"؛ فرمایا "نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔[2]" ایک موقع پر ارشاد ہوا، "ایسے نہ بنو کہ خود تمھاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو، کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے، اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے، اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔[3]"

لوگ احسان کو غلطی سے دولت ومول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لئے دولت کی نہیں دل کی ضرورت ہے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح [2] جامع ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو [3] جامع ترمذی ایضاً

اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے حضرت براؑ بن عازب رضؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو۔ ارشاد ہوا تمہاری تقریر گو مختصر ہے لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے تم جانوں کو آزاد کرو، اور گردنوں کو چھڑاؤ۔" اس نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا "نہیں کیلیے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو، اور ظالم رشتہ دار کیساتھ نیکی کرو، اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ، اور پیاسے کو پلاؤ، اور نیکی کے کام کرنے کو کہو، اور برائی کے کام سے باز رکھو، اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔"[1]

ایک دفعہ حضرت ابوذر رضؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتایئے، فرمایا "جو روزی خدا نے دی، اس میں سے دوسروں کو دے۔" عرض کی اے خدا کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو؟ فرمایا "اپنی زبان سے نیک کام کرے" عرض کی، اگر اس کی زبان معذور ہو؟ فرمایا "مغلوب کی مدد کرے۔" عرض کی "اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو، فرمایا "جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو، اس کا کام کر دے۔" عرض کی اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو، فرمایا "اپنی ایذارسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔"[2]

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ کتاب المکاتب [2] مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۳،

عفو و درگذر

عفو و درگذر، اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لئے بھی آباد نہ رہے، اور دم کے دم مین یہ گناہون سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے، اللہ تعالیٰ کے خاص نامون مین سے عَفُوٌّ (درگذر کرنے والا) غَافِرٌ غَفُورٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنے والا ہے،) اس کی شان یہ ہے،

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ	اور وہی ہے جو اپنے بندون کی توبہ
عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوا عَنِ	قبول کرتا ہے، اور برائیون کو معاف
السَّيِّاٰتِ، (شوریٰ-۳)	کرتا ہے،

وہ چاہے تو انسانون کے گناہون کے سبب سے اُن کو ایک دم ہلاک کر دے یا اُن کو معاف کر دے، فرمایا :-

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ	(اگر خدا چاہے تو) گنہگارون کو ان
يَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ،	کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے
(شوریٰ-۴)	اور بہتون کو معاف کر دے،

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کرکے یوں دلاتا ہے

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى، (طٰہٰ - ۴)

اور اس میں شبہہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشایش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے پھر

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غَافِرُ (بخشنے والا) پانچ دفعہ غَفَّارٌ (بڑی بخشایش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عَفُوٌّ (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غَفُوْرٌ (بخشنے والا) کہا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفو و درگذر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے، خدا نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلّی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے فرماتا ہے،

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا، (نساء-۲۱)

یا کسی برائی کو معاف کردو، تو بیشک ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا،

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے تو اس کی قدرت بہرحال کامل نہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصورواروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے، اسی طرح ہم کو چاہیے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں،[1]

[1] تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حبان۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کرینگے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت مین اس اشارہ کی پوری تصریح ہے، فرمایا،

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ط اَلَا	اور چاہئے کہ وہ معاف کردین اور
تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ	درگذر کرین، کیا تم نہین چاہتے کہ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ،	خدا تم کو معاف کرے، اور اللہ معاف
(نور - ۳)	کرنے والا مہر والا ہے،

اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے لوگون کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسرون کو معاف کرو تو خدا تمھین معاف کرے گا، اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابرِ کرم کی کچھ چھینٹین پڑنی چاہیئن، چنانچہ جن مومنون کے لئے خدا نے جزاے خیر کا وعدہ فرمایا ہے، اُن کی ایک صفت یہ بتائی ہے،

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ	اور جب غصہ آئے تو وہ معاف
(شوریٰ - ۱۴)	کرتے ہین،

سکون کی حالت مین معاف کرنا اتنا مشکل نہین، جتنا غصہ کی حالت مین جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہین رہتا لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمانِ کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہو کہ جن مین یہ جوہر ہوتا ہے، وہ اس حالت مین بھی اپنے آپ کو قابو مین رکھتے ہین اور قصورووالون کو معاف کر دیتے ہین،

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہان مذہبی اختلاف درمیان مین ہے کہ ان احمقون کو اچھی بات بتائی جاتی ہے، اور وہ نہیں مانتے اُن کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہین، اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہکر دیتے ہین، ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے،

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ، خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ، (الاعراف-۲۴)	اور اگر تم اُن کو راہ راست کی طرف بلاؤ تو تمھاری ایک نہ سنین اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہین کہ (گویا) وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہین، حالانکہ وہ دیکھتے نہین، (اے پیغمبر) اور گذر (کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگون سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلون سے کنارہ کش رہو

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتین ہو سکتی ہین، یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ مین ان ناگواریون کو برداشت کیا جائے، خدا نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ ان ناگواریون کو برداشت کرو، اور نیکی کا حکم دیتے رہو، صرف یہی نہین، بلکہ اس سلسلہ مین برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو،

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ،	(اگر کوئی تمھارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو

(مومنون - ۶) بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمھاری نسبت کہا کرتے ہین وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔

مذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے، جب کچھ لوگ اُن لوگون کو بھی اُن سے الگ کرنا چاہتے ہین جو اُن کی جماعت مین شامل ہو چکے ہین، لیکن خدا نے اس موقع پر بھی مسلمانون کو عفو و درگذر کا حکم دیا ہے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ
لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ
كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم
مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ
فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ
اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ
(بقرہ - ۱۳)

(مسلمانو!) اکثر اہلِ کتاب باوجودیکہ اُن پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہین کہ تمھارے ایمان لا سے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دین، تو معاف کرو، اور درگذر کرو، یہان تک کہ خدا اپنا حکم صادر فرمائے،

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہین رکھتے تھے، اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کرین تو ان نادانون کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ وہ اگر نہین تو تم تو دنیا ہست کی جزا و سزا کے قائل ہو، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ تمھارے ساتھ برائی کرتے ہین، تو آج نہین تو کل، اس کا بدلہ اُن کو مل جائے گا، فرمایا،

قُل لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا
ایمان والون سے کہدے کہ اُن کو

لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ،	جو اللہ کے جزا و سزا کے واقعات پر یقین نہین رکھتے ، معاف کر دیا کرین ، تاکہ لوگون کو اُن کے کامون کا بدلہ ملے ، جس نے اچھا کیا ، اُس نے اپنے بھلے کے لئے کیا اور جس نے بُرا کیا ، اوس نے اپنا بُرا کیا ، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے ،
(جاثیہ - ۲)	

اس آیت کے شانِ نزول مین لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی ، اس پر بعض مسلمانون کو طیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانون کو عفو و درگذر کی نصیحت[1] فرمائی (تفسیر کبیر امام رازی زیرِ آیتِ بالا ،)

[1] اس قسم کی آیتون کے متعلق جن مین کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے ، عام مفسرون کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے ، جہاد نے کفار کے حق مین عفو و درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے ، لیکن مفسرون مین کچھ ایسے لوگ بھی ہین جو جہاد کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہین سمجھتے ، اور اس لئے ایک دوسرے کو منسوخ نہین جانتے ، امام رازی نے اپنی تفسیر مین کئی موقعون پر اس کی تصریح کی ہے ، لکھتے ہین ، :-

"اس آیت (وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ) مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلون کی بداخلاقی پر صبر کرین اور اُن کی بیہودہ باتون اور کمینہ حرکتون کا جواب اسی قسم کی باتون اور حرکتون سے نہ دیا جائے ، اور اس مین قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہین کیونکہ جاہلون سے اعراض برتنے اور مشرکون سے قتال مین کوئی تضاد نہین اور جب دونون باتین ایک ساتھ ہو سکتی ہین ، تو نسخ ماننے کی ضرورت نہین ، مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتون کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہین ،

(جلد ۴ ، ص ۴۹۶)

غم و غصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے لیکن اس حالت مین بھی اسلام نے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۹۴) ایک اور آیت (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ) کی تفسیر مین لکھتے ہین:

"کہا گیا ہی کہ یہ آیت منسوخ ہی، اور یہ بھی کہا گیا ہی کہ یہ منسوخ نہین، کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال مین آمادہ کیا گیا ہی جب تک اس سے دین اور اخلاق مین کوئی نقصان نہ پیدا ہو" (ج ۷ ص ۳۰۰)

آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا کی تفسیر مین فرماتے ہین:-

"کلبی اور ابو العالیہ نے کہا ہی کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہین، کیونکہ احمقون سے چشم پوشی کرنا، اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونون مین مستحسن ہی، اور عزت و آبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہی (جلد ۶ ص ۵۹۰ طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر) آیت یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جاثیہ) کی تفسیر مین لکھتے ہین:-

"اکثر مفسرون نے کہا ہی کہ:- آیت منسوخ ہے کیونکہ کفار پر عفو و کرم کے عموم مین یہ بھی داخل ہو جاتا ہی کہ اُن سے قتال نہ کیا جائے لیکن جب خدا نے اُن سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا نسخ ہو گیا، لیکن قریب بہ صحت یہ ہی کہ اس آیت کے یہ معنی ہین کہ چھوٹی چھوٹی باتون پر کافرون سے جھگڑا نہ کیا جائے اور اُن کی تکلیف دہ باتون اور وحشیانہ حرکتون سے درگذر کیا جائے" (جلد ۷ ص ۴۰۸ طبع مذکور)

میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانون کو کافرون اور مشرکون اور دوسرے قصور وارون کے اُن ہی قصورون کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہی . . . . جن کے معاف کرنے کا حق بندون کو ہی، اور وہ حقوق عباد ہین، یعنی وہ مسلمانون کا ذاتی قصور کرین تو مسلمان معاف کر دین، اس سے یہ نہین سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر و شرک و عصیان الٰہی کے قصورون کی معافی لازم آتی ہی جن کے معاف کرنے کا حق بندون کو سرے سے حاصل نہین، اور قتال و جہاد حقوق الٰہی کے مقابلہ مین مشروع ہوا ہی، اس لئے جہاد کی آیتین اس مغفرت، اور عفو و درگذر کے اخلاقی احکام مین خلل انداز نہین،

درمنثور مین ابن عساکر سے حضرت ابو مسلم خولانی صحابی رضؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انھون نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا، اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے (جلد ۶ ص ۳۵ مصر)

حضرت مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے، اور وہ اُن کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انھون نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تہمت مین حصہ لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے انکی مالی امداد بند کردی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ	اور تم مین سے جو لوگ صاحبِ احسان
وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْا اُولِي الْقُرْبٰى	اور کشایش والے ہین، قرابت والون
وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ	اور محتاجون اور اللہ کی راہ مین ہجرت
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَ	کرنے والون کو (مدد خرچ) نہ دینے
لْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ	کی قسم نہ کھا بیٹھین، بلکہ چاہئے کہ ان
يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ	کے قصور بخش دین، اور درگذر کرین،
رَّحِيْمٌ ۝	(مسلمانو!) کیا تم نہین چاہتے کہ اللہ
(نور - ۳)	تمھارے قصور معاف کردے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان ہے

اس آیت کے آخری ٹکڑہ سے بھی ظاہر ہے کہ جو دوسرون کے قصور کو معاف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگذر فرمائے گا،

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس کا ذکر اُن اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہین اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے، جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے،

وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ	اور اپنے پروردگار کی بخشایش، اور

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ،

(آلِ عمران - ۱۴)

اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے، جیسے زمین و آسمان (کا پھیلاؤ، یعنی سمائی) اُن پرہیزگارون کے لیے تیار ہے جو خوشحالی اور تنگدستی (دونون حالتون) مین (خدا کے نام پر؟) خرچ کرتے اور غصہ کو روکتے اور لوگون (کے قصورون) سے درگذر کرتے ہین، اور (لوگون کے ساتھ) نیکی کرنے والون کو اللہ دوست رکھتا ہے،

اوپر کی آیت مین متقیون کے دو وصف ایک ہر حال مین راہِ خدا مین دینا، اور دوسرے لوگون کو معاف کرنا، اور درگذر کرنا اور اُن کے لئے دو جزا ہین، ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت، بیان کی گئی ہین، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال مین خدا کی راہ مین دینے کا معاوضہ تو وہ جنت ہے جس کی حدو پایان آسمان و زمین ہی، اور غصہ کو روکنا اور لوگون کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ہمارے شاملِ حال ہوگی، اور وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا،

عفو و درگذر کی اس اخلاقی تعلیم مین اگر قوت اور قدرت کا جزء شامل نہ ہوتو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مرادف ہوجائے، اسی لئے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم

درس مین اس نکتہ کو فراموش نہین کیا ہے، اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو، جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے، اس کی اصلاح ہو جاتی ہے، کیونکہ اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے، جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے،

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ	اور جو ایسے (غیرت مند) ہین کہ جب
الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ۔ وَ	اُن پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی
جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ	ہوتی ہے، تو وہ (واجبی) بدلہ لے لیتے
مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ	ہین، اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی
فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا	برائی، اس پر (بھی) جو معاف کر دے
یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۔	اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ
	کے ذمہ ہے، بیشک وہ ظلم کرنے
(شوریٰ ۔ ۴)	والون کو پسند نہین کرتا،

برائی کا بدلہ برائی، جماعت کا قانون ہے، اور عفو و درگذر افراد کا اخلاقی کمال ہے، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس مین عفو و درگذر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے، اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہون جو بے سبب ظلم کر بیٹھین، یا وہ جو انتقام کے جوش مین آگے بڑھ جائین، خدا کی محبت سے محروم ہین،

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگذر، خودداری کے منافی نہیں ہوتا، بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو مین رکھ کر عفو و درگذر کرتا ہے، اسی لیے فرمایا،

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ	اور البتہ جو شخص صبر کرے، اور (دوسرے
لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ،	کی خطا) بخش دے، تو بے شک یہ
(شوریٰ - ۴)	بڑی ہمت کے کام ہین،

ایک اور آیت مین اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے، اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیونکہ دشمنی دوستی کی صورت مین بدل جاتی ہے،

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا	اور بھلائی اور برائی برابر نہین (اگر
السَّيِّئَةُ، اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ	کوئی برائی کرے، تو اس کا) جواب
فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ	اچھائی سے دو، پھر تو تیرے اور جس کے
عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ	درمیان دشمنی ہے، وہ ایسا ہو جائےگا
وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا	گویا دوست ہے ناتے والا، اور یہ بات
وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ	ملتی ہی انہی کو جن مین صبر ہے اور یہ بات
وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ	ملتی ہو اس کو جس کی بڑی قسمت ہو اور
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ	اگر اس مین (شیطان کے کونچے سے کوئی
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (حٰمٓ سجدہ - ۵)	کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ

مانگ، بیشک وہ سنتا جانتا ہے،

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے، وہ شیطانی کام ہے، اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے، حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر مین منقول ہے کہ انھون نے کہا،

"خدا نے اس آیت مین ایمان والون کو غیظ و غضب مین صبر کا، اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا، اور برائی کے مقابلہ مین عفو و درگذر کا حکم دیا ہے جب وہ ایسا کرین گے، تو خدا ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔[۱]"

ابو مسعود صحابیؓ کہتے ہین کہ مین ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، جان لو، جان لو، مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، فرما رہے تھے کہ اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے، ابو مسعودؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ مین نے پھر کسی غلام کو نہین مارا،

ایک شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ مین اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کرون، آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر یہی پوچھا، تب آپ نے فرمایا "ہر روز ستر دفعہ"[۲] اس سے مقصود نبوی تعداد کی تحدید نہین بلکہ عفو و درگذر کی کثرت ہے،

---

[۱] ابن کثیر تفسیر آیت مذکور [۲] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجار فی ادب الخادم مین یہ دونون حدیثین ہین،

بعض لوگون کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگذر سے اُن کے رعب و داب اور وقار مین فرق آجائے گا، لیکن یہ خیال صحیح نہین، انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے، اور کمزور دن پر دھاک بیٹھ جاتی ہے، مگر اس سے کسی پائدار شریفانہ عزت کا خیال نہین پیدا ہوتا، یہ چیز عفو و درگذر ہی سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، [1]

وَمَا زَادَ اللّٰہُ رجلاً بعفوٍ اِلَّا عزًّا،	اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگذر کرتا ہی نہین بڑھاتا ہے مگر عزت مین،

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع،

حلم و بردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے، اور قصور وار سے اس کے لئے کوئی تعرض نہ کیا جائے، یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے، اور انتقام نہیں لیتا، اور اسی لئے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے، اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا،

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (بقرہ - ۲۸ - ۲۳۵) — اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار،

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (آل عمران - ۱۶) — بیشک اللہ ہی بخشنے والا بردبار،

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (اسرائیل ۵ مکہ) — بیشک وہ (اللہ) ہی بخشنے والا بردبار

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ مغفرت

کا ذکر کر دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدمِ قدرت کا نتیجہ نہین بلکہ اس کی شانِ غفّاری کا نتیجہ ہے۔ دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَلِیۡمٌ، (نسآء-۲) اور اللہ ہے جاننے والا بردبار،

اِنَّ اللّٰہَ لَعَلِیۡمٌ حَلِیۡمٌ، (حج-۸) بیشک ہی اللہ جاننے والا بردبار،

وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا، (احزاب-۶) اور ہے اللہ جاننے والا بردبار،

ان آیتون سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانون کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہین کرتا، بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہوکر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفتِ استغناء کا بھی ذکر فرماتا ہے،

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیۡمٌ ۰ (بقرہ-۳۶) اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے،

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لئے یہ ظاہر فرما دیا کہ وہ مستغنی ہے، اور بردبار ہے، انسانون مین بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً انتقام کے مقابلہ مین حلم، اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لئے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے، اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے، حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت مین تعریف کے قابل ہے، لیکن اسکی ایک حیثیت

ایسی ہے کہ اُس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے، اور اسی لئے اس کے مقابلہ میں اُن میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا، اس لئے اُس نے اپنے حلم اور دارو گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دیا ہے، تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِیٓ	اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو
اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْہُ وَاعْلَمُوْٓا	تمہارے دلوں میں ہے تو اس سے
اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ؀	ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ بخشش
(بقرہ - ۳۰)	والا ہے تحمل والا۔

یہ آیت عورت کے نکاحِ ثانی کے سلسلہ میں ہے، یعنی جب تک اُس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے، اور نکاح نہ کرے دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں، اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے، ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اس لئے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو، دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے، اس لئے اس سے پُرامید بھی رہنا چاہئے،

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے، اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے، اس موقع پر اس کا ارشاد ہے،

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا	اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض
یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَ	دینا تو وہ اس کو دونا کر دے گا، اور
اللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ،	تمھیں معاف کرے گا، اور اللہ ہے،
(تغابن-۲)	قدردان اور تحمل والا،

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا، اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا،

اس آیت مین تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہمارے آنکھون سے چھپ جاتے ہین، اور اس کی خوبیان نظر انداز ہو جاتی ہیں اس لئے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہی لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اُس سے ایک غلطی ہوئی ہے یا اس مین ایک عیب ہے، مگر اس مین کچھ خوبیان بھی ہین تو اس کی ان خوبیون کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہو جاتا ہے، چنانچہ اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے ہمارا کہ اس مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگذر کرتا ہے،

صفتِ حلم سے انبیاے کرامؑ بھی متصف فرمائے گئے ہین، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جن کی بنیادون پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھون اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہین، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے، انھون نے اس

کافر باپ کے ہاتھون طرح طرح کے ظلم سہے، اور آخر مجبور ہو کر اس سے علٰحدگی پر مجبور ہوئے بھی اُن کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ اُن کے ہاتھ سے نہین چھوٹا، اور اس وقت تک اس کے حق مین دعائے خیر کرتے رہے، جب تک اُن کو پوری مایوسی نہین ہو گئی، اور اُن کو قطعی طور سے معلوم نہین ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے، اس واقعہ کے سلسلہ مین ہے،

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝ (توبہ ۔ ۱۴)	اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا، مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر اُن کو (بھی) جب معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے، بیشک ابراہیم بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود خدا سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا)

دوسری آیت مین اس موقع پر جہان قوم لوط کی بربادی کی خبر پا کر وہ اللہ تعالٰی سے عرض معروض کرتے ہین، اُن کی نسبت اللہ تعالٰی فرماتا ہے،

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ (ھود ۔ ۷)	بے شک ابراہیم، بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے،

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم عفو و درگذر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنی توصیف مین حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف مین اوّاہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لئے عفو و درگذر اور رفق و ملاطفت لازمی ہین لیکن ایک اور آیت مین حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی نسبت فرمایا ہے،

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ،	توہم نے اُن کو (ابراہیم کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسمٰعیل کے پیدا ہونے)
(والصّٰفّٰت - ۳)	کی خوشخبری دی،

اس کے بعد جب اُن کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انھون نے کہا ہے :-

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي	اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے
إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ	تامل) اس کی تعمیل کیجئے، انشاء اللہ
(وَالصّٰفّٰت - ۳)	آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائین گے،

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزء ہے حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہے، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ تم مین دو خصلتین ایسی ہین جن کو خدا پسند کرتا ہے، یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ مین کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہئے،

ایک شخص نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت

فرمائیے، آپ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ "غصہ نہ کرو"[1] اگر غصہ آبھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے[2]۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا"[3]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یارسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ ملتا ہوں[4]، وہ کاٹتے ہیں، میں بھلائی کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں تحمل کو راہ دیتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر یہ ایسا ہی ہے، جیسا تم کہتے ہو، تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی[5]۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب [2] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی کثرۃ الغضب [3] یعنی صلہ رحم کرتا ہوں [4] صحیح مسلم باب صلۃ الرحم وادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہین کہ معاملات مین سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے، جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلون کو موہ لے، اور پتھر کو بھی موم کر دے،

اللہ تعالیٰ نے کئی آیتون مین اپنے کو "لطیف" فرمایا ہے[1]، اور حدیثوں مین اس کا نام

---

[1] راغب اصفہانی "لطیف" کے مختلف معنوں مین سے ایک معنی یہ بتاتے ہین،

"وہ اپنے بندون کی رہنمائی مین نرمی (رفق) فرماتا ہے" (لفظ لطف)

امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات مین نقل کرتے ہین :-

"خدا کا نام لطیف اس لئے ہے کہ وہ اپنے بندون کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور اُن کے لئے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے۔ . . . . لطیف اس لئے کہ وہ اپنے بندون کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، اُن کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی اُن کو نہین ہوتا، او اس طرح اُن کی مصلحتون کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی اُن کو نہین ہوتا، . . . . ابن الاعرابی کا قول ہے لطیف وہ ہے جو تمھاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے" (ص ۴۰ الہ آباد)

امام غزالی کہتے ہین :-

"اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتون کو جانتا ہے، پھر اُن کو نرمی کے طریق سے نہ کہ سختی سے اس تک پہنچاتا ہے جس کے حق مین وہ مفید ہین جب عمل مین نرمی اور ادراک مین لطافت ہو تو لطیف کے معنی پوری ہوتے ہین، اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لئے ہے، (روح المعانی تفسیر سورۂ شوریٰ)

رفیق آیا ہے[1] جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ اُن کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق و لطف فرماتا ہے، اور اپنے اس تلطف میں وہ اُن کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا، اور اُن کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا، اور دشمن بھائیوں کو جس طرح اُن کے سامنے نادم و شرمندہ کرکے اُن کے آگے سرنگوں کر دیا، اس کو یاد کرکے وہ فرماتے ہیں،

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ	بے شک میرا رب لطف کرنے والا
اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ	ہے، جس بات کا چاہے، بیشک وہی
(یوسف-۱۱)	علم والا، حکمت والا ہے،

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح اُن کی کامیابی کا ذریعہ بنیں، اُن کی حکمت کو خدا ہی جانتا تھا، اور اسی کو اس کی خبر تھی،

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ اپنے رفق و تلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے،

اَللّٰهُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ	اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے،
مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ	جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے، اور
(شوریٰ-۲)	وہی قوت والا غالب ہے،

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الرفق - ۱۲

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنون اور کافرون کا ذکر ہے، اور نیچے بھی ان دونون قسمون کا تذکرہ ہے، بیچ مین یہ آیت ہی، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر و مومن دونون کے ساتھ ہے کہ دونون کو یکسان وہ رزق پہنچاتا ہی،[1] اور اسی لئے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطاف بے کران کا ایک نتیجہ ہے،

ملتِ حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق مین جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے، تو بارگاہِ الٰہی مین گو یہ دعا[2] مستجاب نہ ہوئی مگر ابراہیم خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا،

اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ (توبہ ۱۴) — بیشک ابراہیم نرم دل بردبار تھے،

اسی طرح جب وہ حضرت لوط کی گنہگار قوم کی سفارش کے لئے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیم کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ، (ھود ۔ ۷) — بیشک ابراہیم بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے،

اَوَّاهٌ کے معنی مین مفسرون کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائین مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے، اور تیسرا دردمند کہتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم پر یہ تینون باتین پوری اترتی ہون وہ ہر شخص کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے تھے وہ دردمند تھے، اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے، اس لئے جلد پسیج

---

[1] تفسیر روح المعانی مین مقاتل کا یہی قول ہی، صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو اوضح جانتے ہین [2] حضرت

جاتے تھے، اور یہ اس لئے ایسا تھا کہ ملتِ حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا، حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون جیسے سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کو بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے آداب سکھائے جاتے ہیں

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ	سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا
يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ٥ (طٰہٰ - ۲)	شاید وہ نصیحت پائے یا (خدا سے) ڈرے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لئے دینِ حنیف کے مبلغِ اعظم اور توحید کے داعیِ اکبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصۂ وافر عنایت فرمایا تھا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے،

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ	تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے
وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا	لئے نرم دل ہوئے، اور اگر تم مزاج کے
انفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ،	اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے، تو یہ لوگ
(آل عمران - ۱۷)	تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے،

اس لئے ایک پیغمبر کے لئے یہ وصف نہایت اہم ہے، تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو، اور وہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں، اور اسی لئے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور

(بقیہ حاشیہ ص ۵۱۱) ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پا کر اس کے بعد ان سے اپنی علیحدگی ظاہر کر دی،

پر ودیعت کیا گیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم وبردباری، عفو ودرگذر، چشم پوشی اور خوش خلقی، غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق وتلطف اور نرم دلی ونرم خوئی ہے، جس طرح حسن فطرت زینت وآرایش سے دوبالا ہو جاتا ہے، اسی طرح رفق ونرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہو جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی، فرمایا:۔

ان الرفق لا یکون فی شیٔ	نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی
الا زانہ ولا ینزع من شیٔ	ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے
الا شانہ [1]	اس کو بدنما بنا دیتی ہے،

"جس چیز" کا لفظ کتنا عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور سختی بگاڑتی ہے، الا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو،

حضرت عائشہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نرم خو ورفیق ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا [2]، جریر بن عبد اللہ صحابیؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا" [3] اور فرمایا کہ "تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی، خدا اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کریگا،

[1،2،3] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔

یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔[۱]"

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی ہے،

الا اخبرکم بمن یحرم علی	کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص
النار وتحرم علیہ النار	آگ پر حرام ہے، اور کس پر آگ
علی کل قریب ھین سھل[۲]	حرام ہے، ہر اس پر جو لوگوں سے قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ "السام علیکم" یعنی تم کو موت آئے۔ حضرت عائشہ سمجھ گئیں، اور انھوں نے جواب میں کہا "وعلیکم السام واللعنۃ" یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "عائشہ ٹھہر جاؤ، خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے، بولیں یا رسول اللہ! انھوں نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہیں سنا، فرمایا" میں نے بھی تو کہدیا کہ علیکم یعنی "تم پر"[۳]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی، مگر اس میں سختی کا نشان نہیں، اور پھر اس طرح سے ہو کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے۔ اور جماعت کو نقصان

---

[۱] ترمذی ابواب الزہد [۲] ایضاً [۳] بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کلہ

پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے ہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور انکی سازشوں کے قلع و قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جا سکتی ہے، فرمایا۔

یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ	اے پیغمبر! کافروں اور دغابازوں سے
وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (تحریم)	جہاد کرو، اور ان پر سختی رکھو،

دوسری جگہ فرمایا:

یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ	اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں
یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا	سے لڑتے جاؤ اور چاہیے کہ وہ تم میں
فِیْکُمْ غِلْظَةً (توبہ-۱۶)	کڑا پن پائیں۔

اسی طرح شریعت کے گنہگاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے اجراء میں نرمی نہ برتیں، مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

وَلَا تَأْخُذْکُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ	اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں
فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ إِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ	پر ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور پچھلے دن
بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (نور-۱)	پر یقین رکھتے ہو،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں بھی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے، ام المومنین فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا، البتہ جب احکام الٰہی

کی خلاف ورزی کیجاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے[۱]"۔ امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن میں آپ نے مسلمانوں، بلکہ ازواجِ مطہراتؓ تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے[۲]، حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:-

"گویا امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفوں پر صبر کرتے تھے، وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے، لیکن خدا کے حق میں آپ اس سختی سے کام لیتے تھے، جس کا خدا نے حکم دیا تھا۔"

(فتح الباری جلد ۱۰ ص ۴۲۹ مصر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ "آسانی کرو سختی نہ کرو[۳]"۔ شارحینِ حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحات میں سختی نہ برتی جائے، اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہے اس میں تنگی نہ کیجائے، ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہو گئی، انھوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا، تو انھوں نے اکیلے ہی خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی، ارشاد ہوا کہ "ایک غلام کی گردن آزاد کر دو"۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں"۔ فرمایا "لگاتار دو مہینے روزے رکھو"

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا [۲] باب یجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ تعالیٰ [۳] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا۔

گذارش کی کہ "یارسول اللہ! روزہ ہی میں یہ حرکت ہوئی، پھر روزہ رکھوں، فرمایا "ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ"۔ عرض پرداز ہوئے کہ "قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دیکر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گذاری ہے"۔ فرمایا صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو، اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ"۔ وہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم میں آئے اور اپنی روداد بیان کرکے بولے کہ "میں نے تمھارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی"۔[1]

---

[1] سنن ابی داؤد باب فی الظہار،

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے، جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ	اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں میں
الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ	اور زمین میں اور وہی زبردست ہے
(جاثیہ - ۴)	حکمت والا،

اسلیے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اختیار کریں اور عاجزی وفروتنی برتیں۔

تواضع وخاکساری کے بہت سے مظہر ہیں، قرآن مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کفار سے درگذر کا، پھر مومنوں کے ساتھ پُرمحبت تواضع کا حکم دیا ہے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ	اور اپنا بازو مومنوں کے لیے
لِلْمُؤْمِنِيْنَ (حجر - ٦)	جھکا دے،

دوسری جگہ فرمایا:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	اور اپنا بازو جھکا رکھ انکے واسطے جو تیرے
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (شعراء - ۱۱)	ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ میش آنا چاہیے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ	اور ماں باپ کے لیے عاجزی کا بازو
مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل ۳)	مہر و محبت سے جھکاؤ۔

"خَفْضِ جناح" یعنی بازو جھکا دینا، تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے، اس سے یہ استعارہ[۱] کیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کرلیتا ہے۔ اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ	اور رحمت والے (خدا) کے (خاص) بندے
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ	تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا	اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں
(الفرقان - ۶)	کرنے لگیں تو ان کو سلام کریں اور الگ

[۱] المثل السائر باب نوع التشبیہ و تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذل ج ۵ ص ۵۵۶ دار الطباعۃ العامرہ

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے خدا کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی کہ خدا جب رحمت اور مہر و کرم والا ہے تو اس کے بندوں میں خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی،

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ — اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین
وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا — پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ نے کسی اترا
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ — والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا اور
فَخُورٍ. وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ — اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر
وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ — اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے
أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ — بول (کیونکہ) بری سے بری آواز
(لقمان - ۲) — گدھوں کی آواز ہے،

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں، بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کیجائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو، اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو،

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع و خاکساری اور دنائت و پستی میں بڑا فرق ہے، تواضع و خاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر و غرور پیدا نہ ہو، اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے اور دنائت و پستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لیے انسان اپنی خود داری

کو کھو دے، چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو، وہاں اسلام نے عارضی اور نمایشی طور پر خودداراًنہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے، صحابہؓ جب عمرہ کے لیے آئے تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر رکھا تھا، اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمدؐ اور ان کے اصحابؓ ضعف کی وجہ سے خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ طواف کا تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو۔[1]

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ و صدقہ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے، اور ظلم و فخر پر اترانا ناپسند ہے۔[2]

بہرحال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے، اور ضعف، ذلت، بیچارگی اور بے سر و سامانی سے مختلف ہے، ضعف و ذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے لیکن خاکساری اس کو بلند مرتبہ بنا دیتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص خدا کے لیے خاکساری کرتا ہے، خدا اس کو بلند کر دیتا ہے۔"[3] ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا، اور اس کو اختیار دے گا

---

[1] مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف و صحیح بخاری عمرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب [3] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی التواضع۔

کہ ایمان کا جو حلہ پسند کرے، اس کو پہن لے[1]۔"

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے[2]۔" اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطائف پیدا کرنا ہے، اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے۔

[1] ترمذی ابواب الزہد [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کا پہلو ملحوظ رکھے تاکہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مروت اور محبت بڑھے، سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، حال پوچھنا ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا، اچھی باتیں کرنا، اچھی باتیں سمجھانا، اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے توریت میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا، اس کو قرآن پاک میں بھی دہرا دیا ہے

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ) اور کہو لوگوں سے اچھی بات،

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے، ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بتایا ہے، ارشاد ہے:

وَقُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے

هِيَ اَحْسَنُ ط اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ	کہدے کہ وہ بات کہیں جو سب سے
بَيْنَهُمْ ط اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ	اچھی ہو، بیشک شیطان جھگڑا ہوتا
لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝	ہے آپس میں، بیشک شیطان انسان
(بنی اسرائیل - ۶)	کا کھلا دشمن ہے۔

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دیدی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے جو شیطان کا کام ہے، وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے لہجہ میں کہیں اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر و محبت پیدا ہو، اسی لیے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطاب سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے کسی کو یا کافر یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہیں پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے، فرمایا:-

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا	اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن
تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط بِئْسَ الْاِسْمُ	دو، اور نام لے کر پکارو،
الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ج (حجرات - ۲)	ایمان کے بعد بُرا نام ہے۔

اسی لیے برائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ	ہاں، مگر جس پر ظلم ہوا ہو اس کو حق ہے
(نسآء - ۲۱)	کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے[۱]"، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہیے، اس کی زبان سے حق و صداقت، بہبودی و خیر خواہی، نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اچھی بات بولے، ورنہ چپ رہے[۲]"۔ اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ کلمۂ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے، کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا، اگر تمھیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا، آج نہیں تو کل اس کو مل کے رہے گی، ایک دفعہ آپ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا، پھر ارشاد فرمایا "دوزخ سے بچو، اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے[۳]"۔

ایک دفعہ آپ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا، ایک بدوی صحابی مجلس میں حاضر تھے، بے تابانہ بولے کہ یا رسول اللہ یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا

[۱] صحیح بخاری باب طیب الکلام [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان [۳] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ۔

جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے، اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اچھی بات صدقہ ہے۔"[2] یعنی جس طرح صدقہ دیکر کسی غریب کی حاجب روائی اور دلجوئی کیجاتی ہے، اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے، اور سچی سعی وسفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ "یارسول اللہ نجات کیونکر ملے۔" فرمایا "اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمھارے گھر میں تمھاری گنجائش ہو، اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔"[3] ایک دفعہ ایک صحابی نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا "اس کا ڈر ہے۔"[4]

---

[1] ترمذی ما جاء فی قول المعروف [2] صحیح بخاری کتاب الصلح [3] ترمذی باب حفظ اللسان [4] ترمذی ایضاً۔

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے اور دوسروں کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے،

صحابۂ کرام میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہی تھا، کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہوکر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ان کو اپنے گھر دیے، باغ دیے، کھیت دیے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا[1]، اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا، پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، اور ان کی مدح وستائش کی[2]،

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ — اور ان کے واسطے جنھوں نے ان

---

[1] صحیح بخاری اول مناقب انصار [2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری،

مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ	(مہاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام
اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ	(مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اُو
صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ	محبت رکھتے ہیں، اس سے جو اپنا گھر
اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا، اور ان
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ	(مہاجروں) کو دیے جانے سے دل میں
مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ	کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجر بھائیوں
	کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص
	اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے
(حشر - ۱)	تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں، ان ایثار کے پیکروں نے عرض کی جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے ہم کو یہ منظور نہیں، فرمایا "اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تم کو نہیں پوچھیں گے"[۱]

ایک مرتبہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی آپ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول

[۱] صحیح بخاری اول باب مناقب انصار،

کرلیا، اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یارسول اللہ! یہ مجھے عنایت ہو، آپ نے اسی وقت اُتار کر اُن کے حوالہ کر دی، صحابہؓ نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی حاجت تھی اور آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے، تم نے کیوں مانگ لی، بولے ہاں میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے،[1]

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، کاشانۂ نبوی میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لیے آپ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا خدا تعالیٰ اس پر رحم فرمائیگا، یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی، اور وہ اسکو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں صرف بچوں کا کھانا، بولے بچوں کو سلا دو، اور چراغ کو بجھا دو، ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے، البتہ مہمان پر ظاہر کرینگے کہ کھا رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا "خدا تعالیٰ تمھارے اس حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا"[2]

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کیگئی ہے اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے[3] لیکن قرآنِ پاک کا سیاق وسباق عموم کو چاہتا ہے جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے،

[1] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء وباب من استعد الکفن [2] صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ وصحیح بخاری تفسیر سورہ حشر [3] ایضاً

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس میں وہ منفرد ہے اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلوں میں افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے، قرآن پاک میں مسلمانوں کو اُمَّةً وَّسَطًا (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے[1]، اس لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے، انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔

دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا	اور تو نہ پکار اپنی دعا (یا نماز) میں اور
تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ	نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈھ لے، اس کے
سَبِيلًا (بنی اسرائیل - ۱۲)	بیچ میں راہ،

یعنی نہ چلا کر دعا کیجائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے یا مخالف اس کو سنکر برا بھلا کہے

[1] تفسیر کبیر فخر الدین رازی تفسیر آیہ مذکور (بقرہ)

اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کیجائے

ہماری چال ڈھال کیسی ہو اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح یں ہے،

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (لقمان-۱) اور چل بیچ کی چال،

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال یں متانت اور وقار باقی رہے اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ

ریاکار زاہدوں کی نمائشی چال بنجائے[1]

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں، سارے مذہبوں نے اس کی تاکید پر تاکید

کی ہے، اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے، اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہو لیکن اسلام

نے اس راہ یں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے، اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں

کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کر بھیک مانگنے کی نوبت آجائے اور محتاجوں یں ایک نئے

محتاج کا اور اضافہ ہو جائے، فرمایا:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (بنی اسرائیل-۳)

اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن یں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے، ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا،

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ یں کہا

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا اور جو خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں

---

[1] دیکھو ابن جریر طبری، روح المعانی،

وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ	اور نہ بہت تنگی کریں اور ہو اس کے
قَوَامًا (فرقان - ۶)	درمیان اعتدال سے،

یعنی نہ اسراف ہو نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو،

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اکلفوا من الاعمال ما تطیقون	اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کر سکو،

عمل کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں[1]، مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخر دم تک نباہ سکو، دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے، مسند بزاز میں حضرت حذیفہ رض صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[2]،

ما احسن القصد فی الغنی ما	دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی
احسن القصد فی الفقر ما احسن	ہے، محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے
القصد فی العبادۃ	عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے،

غرض یہ ہو کہ نہ اتنا دولتمند ہو کہ انسان قارونِ وقت بنکر حق سے غافل ہو جائے، نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے، لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان وشکوہ، عز وجاہ اور عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں،

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۵۱ [2] بروایت کنز العمال جلد ثانی ص، حیدر آباد، دکن

اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر دنی اور مبتذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہیں، اور یہ بھی بے اعتدالی ہے، ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولتمندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے، نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گر جانا چاہیے۔

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں، اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے، حضرت عثمان بن مظعون کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گذر چکا ہے کہ انھوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمھارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔

خودداری

یا

عزتِ نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے، زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں یہ وصف نہ ہوگا اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی، نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائیگا اور نہ اسکی طرف لوگ متوجہ ہوں گے، اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذات الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ۹۲، موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام "عزیز" لیا گیا ہے، عزیز کے معنی

ہیں عزت والا اور غالب کہیں کہیں عزیز کے ساتھ قوی (قوت والا) یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لیے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے، جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو، اسلام جب کمزور تھا، تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے، اور ادھر کافروں کی ظاہری شان وشوکت اور جاہ وعزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلب گار تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا،

اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ	کیا یہ ان کے پاس عزت چاہتے ہیں
فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ۝	تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری
(نساء - ۲۰)	خدا کے واسطے ہے،

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو خدا کے پاس ہے۔

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ	جو عزت چاہے، تو ساری عزت
الْعِزَّۃُ جَمِیْعًا (فاطر-۲)	اللہ کی ہے،
تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ	(اے خدا) تو جس کو چاہے عزت دے

لہ عزۃ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عزو شرف اور نخوت، (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے، اس لیے ہر جگہ اس کے وہ معنی لیے جائیں گے جو سیاق وسباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے یہ ہے: کسی کا ایسی حالت دمنزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے (دیکھو لسان العرب دمفردات راغب اصفہانی، وابن جریر طبری آیات عزۃ دسورۂ بقرہ ونساء وص ومنافقون)

تَشَآءُ (آل عمران-۳) اور جس کو چاہے ذلت دے،

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقون کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معزز ان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکال دیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ	اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اسکے
لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ	رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے،
لَا يَعْلَمُوْنَ (منافقون-۱)	لیکن منافق نہیں جانتے۔

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے، جو کبھی چھینی نہ جائے گی، اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہیے، اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے اور اسی لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بنکر دنیا کے سامنے آنا چاہیے، تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جو کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرما لیا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ہم حق پر اور کافر باطل پر نہیں ہیں، ارشاد ہوا "بیشک ایسا ہی ہے"۔ عرض کی "تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں"[۱]، ارشاد ہوا "میں خدا کا رسول ہوں اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا"، حضرت عمرؓ کی محدود

[۱] صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد۔

نظر جہاں تک کام کر رہی تھی، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس سے بہت آگے تھی، اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا،

غزوۂ خندق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیے قبیلۂ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ ہر سال دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصار کے سرداروں کو بلا کر آپ نے مشورہ کیا تو انھوں نے عرض کی:

"یا رسول اللہ جب ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے، تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی، اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور کے بدولت ہم عزت پا چکے ہیں، ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں۔"[1]

صحابۂ کرام جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے، ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا، مسلمان جب تک مسلمان رہے، یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولو العزمیوں کا باعث تھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت

[1] سیرت ابن ہشام و تاریخ طبری ذکر واقعۂ احزاب (بلفظہ)،

اور خود داری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے، اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز آتی رہتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۝ (آل عمران - ۱۲)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی سربراہی) کے لیے ظہور میں لائی گئی،

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے، فرمایا غرور نہیں خود داری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں، اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون - ۱۰) ایک مسلمان صالحہ بی بی کے کپڑے پرانے تھے، تو بولیں کیا میں مسلمان نہیں، یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ہوئے ذلت نہیں، اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں،

شیخ ابو حفص سہروردی کہتے ہیں کہ خود داری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے، کیونکہ خود داری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے، اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اسکی جگہ سے اوپر لیجانے کو کہتے ہیں[۱]،

یہ خود داری عین شرافت ہے جس میں یہ خود داری نہیں، لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں، اس وقار اور خود داری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو یا مصلحت نہ ہو تو

[۱] یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورۂ منافقون کی آیت وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ کی تفسیر میں لکھے ہیں۔

بہت سی باتوں سے اعراض اور درگزر کرنا پڑتا ہے، قرآن میں سچے مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے:

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (فرقان - ٦) — اور جب وہ ہو نکلیں بیہودہ باتوں کی طرف سے تو گذر جائیں شریفانہ

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گذر جائیں کہ نہ وہ آپ اُدھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاقی خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو، لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھاپن یا تنگ ظرفی یا غرور و نمائش کی بو تک نہ آئے، یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جزء شامل نہ ہو، یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق و امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے، مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں، ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے[1]۔

اسلام میں ستھرے رہنے کا جو حکم ہے، طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر

مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندہ آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے، تو فرمایا "کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟" ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا "کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا؟" ایک شخص آپ کی خدمت میں نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا "تمھارے پاس کچھ مال ہے؟" اس نے کہا، اونٹ، بکری، گھوڑے، غلام سب کچھ ہیں، ارشاد ہوا کہ "جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل و احسان کا اثر تمھارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے"[1]

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے، اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کونسی عبادت ضروری ہو سکتی ہے، اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اذا سمعتم الاقامۃ فامشوا	جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے
الی الصلوٰۃ وعلیکم بالسکینۃ	سکون اور وقار کے ساتھ چلو،
والوقار ولا تسرعوا[2]	جلدی نہ کرو۔

لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے، اور اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، آہستہ چلنا، نگاہ جھکائے رکھنا، آواز

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب فی الخلقان [2] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب لا یسعی الی الصلوٰۃ ولیأتہا بالسکینۃ والوقار

کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے،

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے، اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، ابوداؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے:

الهدى الصالح والسمت الصالح	نیک طور طریق، نیک انداز اور
والاقتصاد جزء من خمسة	میانہ روی نبوت کے پچیس ۲۵ اجزاء
وعشرين جزء من النبوة	میں سے ایک جزو ہے۔

کیونکہ انہی اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان خوبیوں کے بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دَلّ کا ہے، اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار، گفتار، شکل وصورت، وضع ولباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے، اور نیک مسلمانوں کا طور وطریقہ اختیار کرے۔ اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، ارشاد ہوا "وقار" بولے "خداوندا میرے وقار کو اور بڑھا دے"[1]

فقر وفاقہ کی حالت یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استغنا ہے، اور شریعت میں وہ ایک

---

[1] ادب المفرد باب الختان الکبیر۔

قابلِ ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے اصحابِ صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا	(خیرات) تو ان حاجت مندوں کا
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ	حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے
ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُھُمُ	بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو
الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	جا نہیں سکتے، بے خبر ان کی خودداری
تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمٰھُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ	(کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے
النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ	تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صورت
	سے ان کو (صاف) پہچان جائے
	(کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے
(بقرہ - ۳۷)	نہیں مانگتے۔

اس آیت میں فقر و فاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے، صاحب کشاف نے لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے، بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے، ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں، ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے

کیا معنی ہیں، اصحاب عفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے، لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اسکی یہی خاموشی لجاجت و اصرار کا سوال ہے، کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے، اور خاموشی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو اس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس لیے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب عفہ لوگوں سے لجاجت و اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے، جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں، اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے،[1]

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے، اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا، یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا، اور اپنی عزت و آبرو

[1] تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶ - ۵۲۷

گنوادی تھی، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا آپ نے دیدیا، پھر سوال کیا اور آپ نے پھر دیا، لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ" میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا، جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے، اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے، اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا"

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے، اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے، خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعہ سے"

روزمرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے، لیکن کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھا دو، میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا، اسی لیے کمال خودداری

یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی، جن میں ایک بات یہ تھی،

لا تسألوا الناس شیئاً — تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا،

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے،

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ نے پہلے تو اس کی اجازت ہی نہیں دی، پھر فرمایا کہ "اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو"۔[1] صالحین کی تخصیص غالباً اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے۔ ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے، جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیے ہے۔ اور اس کی عطا سے رسول کے لیے ہے۔ اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے، اور اسی فیضِ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ و باب فی الاستعفاف میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر کہ اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ "مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو" گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیے،

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں، جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک و احتشام، تکلف و تصنع اور جاہ و حشم کی نمائش کا نام نہیں، بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اتنا اونچا کر دے کہ اگر وہ غریب و مفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سربلند رہے، اور اگر وہ صاحب امارت و حکومت ہو تو اپنے رعب و دبدبہ کے لیے ظاہری نمائشی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جا رہے تھے، جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت ابو عبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لیکر استقبال کو نکلے، جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا، تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے، پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے، اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے اور اسی شان سے اسلام کا فرماں روا رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا، حضرت ابو عبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین! آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر کاندھے پر ڈال لیے ہیں، اور ناقہ کی نکیل آپ

کے ہاتھ میں ہے، اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں، یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنڈ آیا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا اے ابو عبیدہؓ! اگر تمھارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کر امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عبرت بناتا، ہم سب سے ذلیل قوم تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی، تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل کر دے گا،[۱]

[۱] مستدرک حاکم جلد اول ص ۶۲ کتاب الایمان علیٰ شرط الصحیحین،

شجاعت اور بہادری

قدیر (قدرت والا) قادر، مقتدر، قوی، جبار (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قاہر (جو ہر کوئی کو دبائے) غالب اور عزیز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں، جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہوجاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کرکے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم وستم اور خونریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے، اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سمجھایا کہ قوت بذاتہٖ کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے، اس لیے تعلیم محمدیؐ نے بہادری وشجاعت کو سراہا اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے، کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کرسکیں، اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ

جہاد کامیاب ہو سکے،

اُن مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لڑائیوں میں دادِ مردانگی دیں، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے:۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ	اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی
الضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ	کے وقت ثابت قدم رہیں، وہی
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ	لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی
ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ہ (بقرہ-۲۲)	متقی ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو، وہ زبان سے کہے یا نہ کہے، اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اسکی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے اور جب وہ ایسا کر گذرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے، اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے۔ ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ	اے ایمان والو جب تم کافروں سے
الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ	میدانِ جنگ میں مقابل ہو تو ان
الْاَدْبَارَ (انفال-۲)	کو پیٹھ مت دو،

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر

بزدلی نہ دکھائیں، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "ایمان والے" کہکر خطاب کیا ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی "ایمان" مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے، کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائیگا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا،

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ	اور جو ان کو اس دن پیٹھ دے گا، مگر
اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا	یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو، یا کسی
اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ	(مسلمان) دستہ سے جا ملنا ہو تو وہ اللہ کا
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ	غضب لیے پھرا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (انفال - ۲)	اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے۔

یہ تو سلبی تعلیم تھی، یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدانِ جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہیے، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجابی حکم دیتا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ	اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ
فِئَةً فَاثْبُتُوْا (انفال - ۶)	سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو،

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔

مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے،

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح - ۴)	وہ کافروں پر زور آور ہیں،

اَشِدَّآءُ کا ترجمہ اس آیت میں زور آور، زورمند اور قوی دست کیا جا سکتا ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں
طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ	اور ان کے لیے تم سے جو ہو سکے اپنی
مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ	زور و قوت اور گھوڑے باندھا ہوا
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ	رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں
عَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ	اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ	کو جنھیں تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے
(انفال - ۸)	مرعوب کرو،

اس "قوت" کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامانِ جنگ و قتال سے کی گئی ہے، مثلاً
قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی، مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ معنًی مفسرین نے
اس کو عام رکھا ہے، اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے[۱]، غرض اس آیت میں
اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان و اسلحہ تیار رکھنے اور ان کے
استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے
مرعوب اور خوف زدہ رہیں، اور ان سے معاہدہ کرکے توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں،
برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ

---

[۱] تفسیر طبری آیتِ مذکور،

کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جا رہی تھی، متوحش ہو رہے تھے، اس پر وحی الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا،

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ	گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے
وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (انفال-۱)	ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں،

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے،

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ	جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ	کہ تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں، انکی
اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِىْ يُغْشٰى عَلَيْهِ	آنکھیں گردش کھاتی ہیں، جیسے کسی
مِنَ الْمَوْتِ (احزاب-۲)	پر موت کی غشی آجائے۔

سورۂ محمد میں ان کے دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے،

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ	جب اتری کوئی ثابت سورت اور
وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ	مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو ان کو
الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھے گا کہ
يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ	تکتے ہیں تیری طرف، جیسے ٹک ٹکی
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ	لگ گئے، وہ جس پر موت کی بیہوشی ہے
(محمد-۳)	سو خرابی ہو ان کی،

ایک اور روایت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا،

وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ | اور جب تو انھیں دیکھے تو ان کے بدن
وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ | اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو انکی
كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ | بات تو سنے، جیسے ٹیک سے لکڑی کی ہوئی
یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ | لکڑیاں ہیں، جو کوئی چیخے، سمجھیں ہم ہی
(منافقون-۱) | پر کوئی آفت آئی،

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں، دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہو کہ ذرہ کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں، ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے، دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں، مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں اسلیے ذرہ ٹھیلنے سے دھڑسے زمین پر آرہتے ہیں،

اسلام اپنے پیرووں میں شجاعت و بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہو، گو اس میں یہ مادی وجسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہیں ہو، لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے، اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھیے کہ منافقین کے جسمانی طول وعرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے کہ چونکہ ان کا یہ دکھاوے کا قالب ایمان اور یقین کی رُوح سے خالی ہی، اس لیے اُن میں شجاعت اور بہادری نہیں، اسی بنا پر وہ اپنے پیرووں میں شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر

رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں،

۱- جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں، صرف فضل الٰہی اور نصرت خداوندی چاہیے،

۲- ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آجائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی، اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا،

۳- خدا کی راہ میں مارا جانا، زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے، اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا، وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے،

تعداد کی قلت و کثرت تعداد کی قلت و کثرت پر جد وجہد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے، کامیابی و ناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں، بلکہ جد وجہد کرنے والوں کی ایمانی و اخلاقی کیفیت پر منحصر ہے، تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس میں ایمان و یقین کی قوت موجود ہے، تو بفضلِ خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پا سکتی ہے، اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھا دیا ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً	کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی
كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ (بقرۃ-۳۳)	فوج پر غالب آگیا ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے، اِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ (مائدہ-۴) اس میں قوم

ایک زبردست قوم بستی ہے" اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں،

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ	تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس
وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ	جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو اور اللہ
مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (مائدہ - ۴)	پر بھروسہ کرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو،

بدر اور اُحد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے،

ارشاد ہوا،

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ	اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا،
شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ	اگرچہ تعداد میں بہت ہو، اور اللہ
مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (انفال ۲۰)	ایمان والوں کے ساتھ ہے،
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ	کر، بیشک اللہ توکل کرنے والوں
اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ	کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد
لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا	کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور
الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ	اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ	کون تمہاری مدد کریگا، اور مومنوں کو
(آل عمران - ۱۷)	چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

فتح و شکست حکمِ الٰہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے،

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے،
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (انفال-١)	بیشک اللہ غالب، حکمت والا ہے،

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا، بلکہ اس کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لیے خوشخبری سنا دی، فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے، ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ	اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق
عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ	دلا، اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر
عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا	(ثابت قدم) ہوں تو وہ دو سو پر
مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ	غالب ہوں اور اگر تم میں سے سو
يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (انفال ۹)	کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے،

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کے شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتا دی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر و توکل کی قوت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم و بصیرت سے محروم ہیں،

اس کے بعد اس آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کر دی گئی ہے، پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ کہ ایک مسلمان اپنے سے دو چند کا مقابلہ

کرے اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں۔

فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ	تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں
یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ	تو دو سو پر غالب ہوں اور اگر
اَلْفٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰہِ	تم سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بحکم
وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ	خدا غالب ہوں اور اللہ صابروں
(انفال - ۹)	کے ساتھ ہے۔

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمد اللہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے۔ اور وہ اپنے اس یقین وایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروا نہیں کرتا، اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسا رکھتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے ہے کہ

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا	ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا)
الرُّعْبَ ۝ (آل عمران - ۱۶)	رعب ڈال دیں گے،
سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا	میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا)
الرُّعْبَ (انفال - ۲)	رعب ڈال دوں گا۔

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا، چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دیئے۔

پر مجبور ہوئے،

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ — اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب

(احزاب-۳) — ڈال دیا،

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ — اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب

(حشر-۱) — ڈال دیا،

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا.

موت کا وقت مقرر ہے انسان کی کمزوری کی اصلی وجہ موت کا ڈر ہے، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے اور نہ بلائے آسکتا ہے، اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، وحیِ محمدیؐ نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے، یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کرگئی ہے، غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور اس عقیدہ کو یاد دلایا،

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ — اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا — کے حکم کے سوا وہ مرسکے، لکھا ہوا

(آل عمران-۱۵) — وقت مقرر ہے.

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مرسکتا ہے، پھر موت سے خوف کیوں ہو اور اس سے بزدلی کیوں چھائے، جنگ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو

خدا نے فرمایا،

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ	(اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ اگر موت سے
فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ	یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ
(احزاب - ۲)	بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا،

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی، وہ خود آکر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا،

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِىْ بُيُوْتِكُمْ	(اے پیغمبر ان سے) کہہ دے کہ اگر تم
لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ	اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کا
الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ	مارا جانا لکھا جا چکا تھا، وہ آپ نکل
(آل عمران - ۱۶)	کے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے،

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے، یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں،

لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا	اگر یہ (مرنے یا مارے جانے والے) ہمارے
وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ	پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے
حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ	جاتے (اور یہ خیال اس لیے ان کے
يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۗ	دل میں آتا ہے) تاکہ اللہ ان کے اس

خیال کو انکی دلی حسرت بنائے، اور

(آل عمران - ۱۷) (واقعہ تو یہ ہے کہ) اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہوں تو ٹال لیں۔

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ | اگر تم سچے ہو تو اپنی جان سے
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آل عمران) | موت ہٹا لو،

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے۔ ان کے خطرہ کا ذکر کر کے ان کی تشفی کی گئی،

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ | پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو
اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ | ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں
النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ | سے ایسے ڈرنے لگے جیسے خدا سے ڈرہو
خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ | یا اس سے بھی بڑھکر، اور کہنے لگے کہ
عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ | اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں
اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ | فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ ہم کو
الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ | تھوڑے دن اور مہلت دی اے
لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ | پیغمبر) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ
فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا | تھوڑا ہے، اور آخرت پرہیزگار کے
يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ | لیے بہتر ہے۔ اور تمہارا حق ذرا بھی

فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ط	دبایا نہ جائے گا، جہاں تم ہوگے موت
(نساء - ١١)	تم کو پالے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو،

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو، موت سے چھٹکارا نہیں، پھر میدان جنگ سے تم کیوں گھبراؤ، بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے،

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ	وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے
اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ	کے لیے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے
فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا	سو تم ان سے خوف کرو تو اس نے
وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ	ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا اور بول
الْوَکِیْلُ،	اٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا
(آل عمران - ١٨)	اچھا کارساز ہے۔

شہادت اور غزا کا رتبہ

میدانِ جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی، وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی اور رضا اور جنت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے، اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑا سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ	اللہ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں کو
اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ	اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے

الجنّة، یقاتلون فی سبیل	کہ ان کے لیے جنت ہے، اللہ کی راہ
اللہ فیقتلون ویقتلون ۵	میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور
(توبہ - ۱۴)	مارے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے سورہ نسا میں اہل ایمان کو جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کر چکے ہیں،

اعلان ہے،

فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین	تو جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچتے
یشرون الحیوۃ الدنیا	ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور
بالاخرۃ ومن یقاتل فی سبیل	اور جو اللہ کی راہ میں لڑے، پھر
اللہ فیقتل او یغلب فسوف	مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو
نؤتیہ اجرا عظیما (نسا - ۱۰)	بڑی مزدوری دیں گے۔

ان کے گناہوں کے سارے دفتر دھل جائیں گے۔

فالذین ھاجروا واخرجوا	تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے
من دیارھم واوذوا فی	گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں
سبیلی وقتلوا وقتلوا	ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، اتار دوں گا
لاکفرن عنھم سیاتھم	ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا
ولادخلنھم جنت الایۃ (العمران ۲۰)	ان کو جنت میں۔

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ انکی زندگی تھی۔

وہ ان کو از سرِ نو اسی وقت دے دی جائے گی، اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیالِ باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں، ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، اور کہدیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا — اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ — مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے
اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ — رب پاس روزی پاتے ہیں، خدا نے
فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ — ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا،
فَضْلِهٖ (آل عمران - ۱۷) — اس سے خوش ہیں۔

اُن کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے، پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ — اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۗءٌ — ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہیں لیکن
وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ - ۱۹) — تم کو اس کی خبر نہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہوں، اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و غایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسیاتی غیظ و غضب اور بہادری کی نیک

نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کردی گئی ہے، اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی۔ فرمایا:

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال، سو اللہ کے پاس
فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ كَذٰلِكَ	بڑا مال غنیمت ہے، تم (اسلام سے) پہلے ایسے
كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ	ہی تھے تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام
عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا (النساء - ۱۳)	بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اسکی پامردی کی نمایش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمایش کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ وانتقام کے لیے لڑتا ہے تو آپ نے ان سب کا مشترک جواب دیا،

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ	جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لیے
اَعْلٰى فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1]	لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شخص سے قیامت کے دن اُس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا، تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ، سو تم اپنا اجر پا چکے اور دنیا میں تم کو بہادر

---

[1] صحیح مسلم وصحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ،

[2] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار، وجامع ترمذی،

کہا جا چکا" غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا و نمایش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے، کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے،

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ "بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے[1]" کیونکہ اس سے دشمنوں پر رعب و داب قائم ہوتا ہے، اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے، ایک صحابیؓ نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ میں کہا "لو میں ابن اکوع ہوں" حافظ ابن حجر اس فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

"یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ حالت کا اقتضا یہی تھا، اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے جو لڑائی میں جائز ہے اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں[2]۔"

غزوۂ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا، تو آپ نے خود عزم و ثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا

انا النبی لا کذب انا ابن   میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۲۲، شرح حدیث مذکور [2] ابو داؤد کتاب الجہاد، باب فی الخیلاء فی الحرب

[3] فتح الباری جلد ۶ ص ۱۱۴

عبد المطلب   عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں، اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا۔ چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی۔[۱]

صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوتا تھا،[۲] وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت بہادر تھے۔ ایک بار اہل مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا، تو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا، وہ خود سرور کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ تھے، آپ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے، اور واپس ہو کر فرمایا "خوف کی کوئی بات نہیں"۔[۳] ایک موقع پر جب بدویوں نے آپ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپ نے فرمایا کہ "تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے"۔[۴] بزدلی اسلام میں ایسا سخت اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے اُن میں بزدلی بھی ہے، چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیچارگی (عجز)، کاہلی (کسل)، بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے، دوسری روایت میں ہے کہ آپ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے۔[۵] ایک روایت

---

[۱] صحیح بخاری غزوۂ حنین وکتاب الجہاد باب بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۲] صحیح مسلم باب غزوۂ حنین [۳] صحیح بخاری کتاب الجہاد کتاب الکنائی وتعلیق السیف بالعنق [۴] بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعۃ فی الحرب والجبن [۵] بخاری کتاب الجہاد باب ما یتعوذ من الجبن۔

میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بد اخلاقی گھبرادینے والا بخل اور دل ہلادینے والی بزدلی ہے،[1]

حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی صحابی نے ایک خط لکھ بھیجا تھا اسکا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو"[2] اسی خط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے:

وَاعلموا ان الجنۃ تحت	یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی
ظلال السیوف	چھاؤں میں ہے

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجراۃ والجبن [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال [3] ایضاً باب الجنۃ تحت بارقۃ السیوف و باب ماکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا لم یقاتل اول النہار، اخر القتال، ۱۲،

استقامت

"استقامت" کے لفظی معنی "سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے" کے ہیں، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے، مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے، اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا چلا جائے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے کہ

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو اس کی
فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ	طرف سیدھے رہو اور اس سے
(حٰمٓ السجدہ-۱)	گناہ بخشواؤ،

یعنی ہماری عبادتیں اُسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو، اس سے کسی حال میں ادھر اودھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو،

ایک اور آیت میں بارگاہ الٰہی سے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو

حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ راہ سے بہکو، نہ حکم ماننے سے سرکشی ہو،

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ	تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا
مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا	تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے
تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ	ساتھ، اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ)
(ھود - ۱۰)	تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

عرب کا گرم ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بنگیا ہے، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول حق علیہ السلام کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے، اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے، اس موقع پر رسول اسلام علیہ السلام اور آپکے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید پر تاکید ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے، اسی دین حق کی طرف سب کو بلاتے رہو، اور ثابت قدمی دکھاؤ، اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو،

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ	پس اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ
كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ	تجھے فرمادیا، اور انکی خواہشوں کے
أَهْوَاءَهُمْ (شوری - ۲)	پیچھے نہ چل۔

ایسے ثابت قدموں کو جنھوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے، یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ کامیابی تمھارے ہی لیے ہے، وہ دن آئے گا جب نہ تمھیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ	بے شک جنھوں نے کہا، ہمارا پروردگار
ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ	اللہ ہے، پھر وہ (اس پر) جمے
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	رہے، تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ
(احقاف - ۲)	غم کھائیں گے۔

اُس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے، ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا، وہاں تسکین و تسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں انکی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ	بے شک جنھوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار
ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ	اللہ ہے، پھر جمے رہے، ان پر فرشتے
الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا	اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ، اور
وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ	اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم
تُوْعَدُوْنَ (حم السجدہ ۴)	سے وعدہ تھا،

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھیے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کوئی ایسی بات بتایئے کہ میں اس سے چمٹ جاؤں، ارشاد ہوا "کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ"[1] صحابہ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کیے، ساڑھے تیرہ سو برس

---

[1] ترمذی باب ما جاء فی حفظ اللسان

گذر گئے مگران پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت اور آفریں کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے غزوہ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے فرمایا:

إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ	جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے
أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ	اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں،
الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ	اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل
الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا	گلے کو آنے لگے، اور تم اللہ سے
هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَ	طرح طرح کے گمان کرتے تھے،
زُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا	وہاں ایمان والے جانچے گئے اور
(احزاب - ۲)	خوب جھڑ جھڑائے گئے۔

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی اسکی تفصیل ہی، اس کے بعد ہے:

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ	اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان
قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ	متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے
وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ	جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا، اللہ اور اسکے
وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ	رسول نے، اور اللہ اور اسکے رسول
إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا	نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین
(احزاب - ۳)	اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات قدم کا وعدہ کیا تھا اور اس کو پورا کر دکھایا، ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے،

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ	جنھوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ	اس کو سچ کر دکھایا، توان میں کوئی
يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا	تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں
	وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انھوں نے
(احزاب - ۳)	ذرا بھی نہیں بدلا۔

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں، اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انھوں نے اپنے دین وایمان کو بدلا اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے، اس کو توڑا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا، اور اس میں مردانِ خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا، اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی، فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا	کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے
الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ	اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال

خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ	نہیں آئے، ان کو سختی اور تکلیف
الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا	پہنچتی رہی، اور جھڑ جھڑائے گئے،
حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ	یہانتک کہ رسول اور جو اس کے
اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ط	ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ
اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ط	کی مدد کب آئے گی، سن رکھو اللہ
(بقرہ - ۲۶)	کی مدد نزدیک ہے۔

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا، اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیے ہیں، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا، اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی،

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا	اے ہمارے پروردگار ہم میں ڈالدے
وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا	پوری مضبوطی اور جمادے ہمارے
عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ہ	پاؤں اور اس کافر قوم کے مقابلہ
(بقرہ - ۳۲)	میں ہماری مدد کر۔

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے، احادیث وسیر[1] میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے، یہودیوں نے انکو طرح طرح کی تکلیفیں

[1] صحیح مسلم وسیرت ابن ہشام قصہ اصحاب الاخدود،

دیں اور آخران کو گڈھا کھود کر آگ میں جھونک دیا مگر وہ دین حق سے برگشتہ نہ ہوئے۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ	مارے جائیو کھائیاں کھودنے والے،
النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ . اِذْ هُمْ	آگ بھری ایندھن سے، جب وہ اس
عَلَيْهَا قُعُوْدٌ . وَّهُمْ عَلٰى مَا	(گڈھے کے منہ) پر بیٹھے تھے، اور جو کچھ
يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ	وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے،
وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ	دیکھ رہے تھے اور وہ ان سے بدلہ نہیں
يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ	لیتے تھے مگر اسی کا کہ زبردست خوبیوں
(بروج - ۱)	والے خدا پر ایمان لے آئے تھے۔

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا، وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے، خباب بن ارت صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا، اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجئے، چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بیتابی کا اظہار تھا، اس لیے آپ نے فرمایا کہ "تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا، اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دین حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا، اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا۔"[۱]

[۱] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام

رسولِ اسلام علیہ السلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہیں ملاں ہی خبابؓ بن ارت کا جو اس روایت کے راوی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دیجاتی تھیں، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا اور ایک شخص اُن کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہوگئے،[1] حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو تائے ہوئے سونے کی طرح سنگدل قریش کے ظلم وستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے میں رسّی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اُس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا، حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں، مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فقرہ جس کو آپ نے اپنے چچا ابو طالب کے جواب میں کہا تھا، اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے، فرمایا، چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دیدیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا،

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو اگر یہ رسول اس راہ میں

---

[1] ابن سعد جلد ۳ تذکرۂ خبابؓ۔

مرجائے یا مارا جائے تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو، الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہیں، اس کا ساتھ تم اس لئے دیتے ہو کہ وہ حق ہے،

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ	اور محمد تو ایک رسول ہے، اس سے
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ	پہلے بہت سے رسول ہو چکے، پھر کیا
اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	اگر وہ مرگیا یا مارا گیا تو تم الٹے
عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ	پاؤں پھر جاؤ گے اور جو الٹے
عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ	پاؤں پھرے گا، وہ اللہ کا کچھ
شَيْئًا ۚ (آل عمران-۱۵)	نہیں بگاڑے گا۔

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر وثبات اور استقامت کی تعلیم دیجاتی ہے،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ	اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ
رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا	ہو کر بہت سے خدا والے لوگ
لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ میں
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا	کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا	اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے
كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا	اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ

(آل عمران ۔ ۱۵۰)

کرتا ہے، اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثباتِ قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیے، اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے جس کا نام مداومت ہے یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے، اُس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اُس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان کے سب اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا:۔

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ٥

(معارج ۔ ۱)

لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)

اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے، اور اس کی مشق مداومتِ عمل سے

ہوتی ہے، اسی لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا، فرمایا "وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے"[1]، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو"[2]

---

[1] و [2] صحیح بخاری باب القصد و مداومۃ العمل۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح میدانِ جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں، بعینہ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے اُسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابلِ ستائش سمجھا جاتا ہے جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو، اور اسلام نے اسی قابلِ ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ	پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر
عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ	سنا دو اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کرو
الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ	ہم تم کو تمہاری ہنسی اڑانے والوں

مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ   کے مقابلہ میں جو خدا کے ساتھ دوسرے

(الحجر-۶)   دوسرے معبود قرار دیتے ہیں کافی ہیں۔

یعنی اب مخفی طور پر دعوتِ توحید کا زمانہ گذر گیا، اور علانیہ اسکی دعوت دینے کا وقت آگیا، اس لئے کھلم کھلا خدا کے اس حکم کو بیان کرو، اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو انکے تمسخر و استہزا کی مطلق پروا نہ کرو، بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروا نہ کرو، سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے، وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے، اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے

وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ   اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی

(مائدہ-۸)   ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پروا نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان ومال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے اور فرمایا "کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہیے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو"۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے، صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں

ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے، ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہئے تھا۔

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے، اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا

افضل الجهاد کلمة عدل عند سلطان جائر

بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔

دوسری روایت میں "کلمة حق" کا لفظ ہے۔

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیے گئے ہیں، اُن میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے، چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا، حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا، حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ "تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹادے ورنہ زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے، لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے[1]"۔

[1] سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں یہ تمام حدیثیں مذکور ہیں، ۱۲

صحابہؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا مرتبہ حق گوئی میں بدرجہ کمال تھا، یہ وہی تھے جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جاکر توحید کا نعرہ بلند کیا اور اُس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بیدم نہ ہوگئے لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترا، اور دوسرے دن پھر جاکر اعلان حق کیا اور وہی سزا پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مدح میں فرمایا کہ "آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں"۔ؔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی، اس پر انھوں نے بے محابا دارو گیر کی اور اس میں امیر معاویہ کی پروا انھوں نے ذرہ بھی نہیں کی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا "ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے، جو تم کو معلوم ہے"۔ یہ سن کر حضرت ابو سعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آگئے۔ؔ

ؔ جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذرؓ ؔ ترغیب وترہیب منذری ج ۲ باب الترہیب من الغضب بحوالہ ترمذی۔

استغناء

استغناء، کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف خداوند تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔

وَمَنْ کَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ	اور جو (مقدور رکھتے ہوئے نعمت کی
عَنِ الْعٰلَمِينَ	ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے)
(آل عمران۔۱۰)	تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔

اور اس بے نیازی میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (محمد)	اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اُس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو، اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے، اسلام کے آئینِ اخلاق میں استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے،

اوّل یہ کہ جو کچھ ملتا ہے، اُس کا دینے والا در حقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔ اسلیے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے۔ قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے ہیں، اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ (فاتحہ)	(اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں،

خدا نے جا بجا اپنے بندہ کو اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر اُن کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے۔ فرمایا:

وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (آل عمران - ۱۸)	اور کیسا اچھا کارساز،
وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا (اسرائیل - ۷)	اور تیرا رب کارساز بس ہے،
أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا (" - ۱)	میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ،
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (نساء - ۱۱)	اور اللہ کارساز بس ہے۔

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ (زمر ۴) کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں، اس لیے کسی شاہ، امیر، اور دولتمند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغناء کی بنیاد ہے، وہ قناعت ہے، یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے اس پر طمانیت حاصل کیجائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ	اور جن چیزیں میں اللہ نے ایک کو دوسرے

بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط (نساء - ۵) | پر بڑائی دی، اس کی ہوس مت کرو،

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا | اور اپنی آنکھیں نہ پسار اسکی طرف جو

مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ | ہم نے ان میں سے طرح طرح کے

(طٰہٰ - ۸) | لوگوں کو سامان دیا ہے،

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال و دولت سے اُن کی نیت نہیں بھرتی، اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں، اس لیے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولتمند نہیں ہوتا، تاہم خدا نے جو کچھ اس کو دیا ہے، اس پر قانع رہتا ہے، اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا، اس لیے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے، اس بنا پر استغنا، و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے، اور اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لیس الغنی عن کثرۃ العروض | دولت مندی مال و اسباب کی کثرت

ولکن الغنی غنی النفس | کا نام نہیں ہے، بلکہ اصلی دولتمندی

(بخاری، رقاق، باب الغنی غنی النفس) | دل کی بے نیازی ہے۔

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہو "تونگری بدل است نہ بمال" ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا، حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو ذر! تمھارے خیال میں مال کی کثرت

کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا ہاں" فرمایا تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" فرمایا "بے نیازی دل کی بے نیازی ہے، اور محتاجی دل کی محتاجی ہے۔[1] اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی یعنی خدا انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے، یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہی تعلیم دی، اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے، اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے۔[2] ایک بار چند انصاریوں نے آپ سے مال کا سوال کیا اور آپ نے اُن کا سوال پورا کیا، لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا اور آپ نے پھر ان کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا، جو شخص خودداری چاہتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے، اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔[3] اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپ سے بار بار مال کا سوال کیا، آپ نے ہر بار اُن کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے، خدا اس میں برکت دیتا ہے، اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا، اُن پر

---

[1] فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للہیثمی قلمی نسخہ دارالمصنفین باب الغنی غنی النفس [2] فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۴ [3] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب فی الاستعفاف۔

اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہیں قبول کیا۔[1]

فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی، اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے، اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے،[2] حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔[3]

---

[1] ترمذی کتاب الزہد [2] زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القناعۃ [3] مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۵۲ کتاب الرقاق۔

رذائل

رذائل کے معنی رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاقِ ذمیمہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، جن کے کرنے والے اُس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور اُن کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی وبربادی کا سبب بنجاتے ہیں، یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے،

رذائل کے قرآنی نام اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً اکثر ان کو مُنکَر (نا آشنا سا) اور فحشآء (بے حیائی) اور کبھی فاحشۃ (فحش) سَیِّئَۃٌ (برا) سُوْٓء (برائی) مکرُوْہ (ناپسندیدہ) خطاء (ناصواب یا بھول) اثمٌ (گناہ) عُدوان (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے۔ ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے

متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں، فرمایا،

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ	اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت
اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ	مار ڈالو، ہم ہیں ان کو اور تم کو روزی
اِيَّاكُمْ ط اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ	پہنچاتے، بے شبہ ان کا مار ڈالنا بڑی
خِطْاً كَبِيْرًا ، وَلَا تَقْرَبُوا	چوک ہے، اور زنا کے پاس مت جاؤ،
الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً	بے شبہ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے..
وَسَآءَ سَبِيْلًا	....
وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا	اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین کو
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ	پھاڑ ڈالے گا، اور نہ لمبائی میں پہاڑ
وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا كُلُّ	کو پہنچ جائے گا، ان میں سے جو بری
ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ	بات ہے وہ تیرے پروردگار کے نزدیک
مَكْرُوْهًا (بنی اسرائیل - ۴)	ناپسندیدہ ہے.

رذائل کے لیے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ مُنْكَر ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں جن برائیوں کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے، ان کو ایک ہی لفظ منکر سے ادا کیا گیا ہے.

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ	وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے

فَعَلُوْهُ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ — جو کرتے تھے، روکتے نہ تھے، کیا برا کام

(مائدہ - ۱۱) — ہے جو وہ کرتے تھے۔

ایک بدکار قوم کی برائیاں گنائی جا رہی ہیں، اس سلسلہ میں ہے:

وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ — اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب

(عنکبوت - ۳) — ہوتے ہو،

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے:

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ ۱۴) — اور منکر سے منع کرنے والے،

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۲ و توبہ ۹) — اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

اور کہیں فحشاء اور منکر کا لفظ ساتھ آیا ہے،

فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (نور ۳) — وہ فحشا، اور منکر کرنے کو کہتا ہے

نماز کی خوبی یہ ہے کہ

تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت ۵) — وہ فحشا اور منکر سے باز رکھتی ہے۔

فحشاء، منکر اور بغی

کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں، فحشا، منکر اور بغی،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ — (مسلمانو!) اللہ انصاف اور احسان

الْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي — کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا

الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ — حکم دیتا ہے اور فحشا، اور منکر اور بغی سے

وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ — منع فرماتا ہے تم لوگوں کو نصیحت کرتا ہے،

تَذَكَّرُوْنَ ۝ (نحل - ۱۳) تاکہ تم خیال رکھو۔

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم وحیا سے اسلام لایا تھا، اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑ لی،[۱]

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر وشر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے،[۲]

قتادہ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جن اخلاق حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ پسند کیے جاتے تھے، ان میں کوئی خلق ایسا نہیں ہے جس کا خدا نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہو اور کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں ہے جس کی اس آیت میں ممانعت نہ کی ہو،[۳]

اس آیت میں منہیات کے سلسلے میں تین لفظ آئے ہیں، فَحْشَآءِ اور مُنْكَرِ اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشا کے معنی ان میں پہلا لفظ فَحْشَآءِ ہے، جس کی دوسری صورت فاحشۃ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں،[۴] اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشاء کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود الٰہی سے تعدی اور تجاوز

---

[۱] مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ [۲] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۵۶ و ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور، [۳] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [۴] الصحاح للجوہری لفظ "فحش" و لسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش"

کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثال سے یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر فرمادیں، اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے، وہ تعدیِ حدود اور فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا،

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ	اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہبانی
حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ	کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں پر یا
اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ	اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر انھیں ملامت
غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰی	نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے
وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ	سوا ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے
الْعٰدُوْنَ (مومنون-۱)	والے ہیں۔

اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہو گئے ہیں، قرآن نے کہا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّہٗ کَانَ	اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ، کیونکہ یہ
فَاحِشَۃً وَسَآءَ سَبِیْلًا	"فاحشہ" (یعنی قبیح بات) اور بری
(اسرائیل-۴)	راہ ہے۔

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے،

منکر کے معنی دوسرا لفظ مُنکَر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ

جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لیے اس کو مَعْرُوف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے، اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ مُنْکَرْ (ناشناسا) ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے جو کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں، قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (حجر و ذاریات) یعنی لوگ اَن جانے اور اَن پہچانے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب اُن کے بھائی آئے تو انھوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ اُن کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (یوسف - ۷) یعنی "یوسف نے تو ان کو پہچان لیا مگر وہ ان کو پہچان نہ سکے"۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے، اور اس کے طور و انداز سے بداہتہً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی مُنْکَرْ ہے، فرمایا:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا	اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی
بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِىْ وُجُوْهِ	ہوئی آیتیں سنائی جائیں تو کافروں
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ط	کے چہروں میں تو منکر (بگڑی ہوئی
يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ	شکل) پہچانے گا، نزدیک ہوتے ہیں
يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ط	کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے
(حج - ۹)	ہیں، حملہ کر بیٹھیں،

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے، اس کو مُنْکَرْ

کہا گیا ہے، ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں جن کو ہر شخص فطرۃً اور بداہتہً ناپسند کرتا ہے، اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی | تیسرا لفظ بغی ہے، جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں،

خَصْمَانِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ (ص - ۲) — ہم دو جھگڑنے والے ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں،

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ، (شوریٰ - ۳) — اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔

اسی سورہ میں ہے:-

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (شوریٰ - ۴) — راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں،

اخلاق ذمیمہ برے کیوں ہیں | اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحشاء، منکر اور بغی

ہیں منحصر ہیں، صفات ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں، اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں، اور ان کے جائز کر دینے سے دوسروں کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے،

سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ	اے پیغمبر! کہدے کہ میرے پروردگار
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ	نے برائی کے سارے کاموں (فواحش)
الْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ط	کو جو کھلے ہوں یا چھپے، اور گناہ کو اور
(اعراف - ۴)	ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے، ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی! اُن اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے، اگر تحلیل کیجائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں، اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں، اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق بے امان اٹھ جائے، اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔[1]

[1] منطقی اصطلاح میں فحشاء۔ منکر اور بغی میں مانعۃ الخلو ہے، یعنی کسی بد اخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے مگر کوئی بد اخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی یعنی ہر بد اخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

رذائل کی ترتیب ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دیجاسکتی ہے، ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے، اوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کردیا گیا ہے، سب سے پہلے فحشآء پھر منکر پھر بغی۔

فَحْشَآء میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگے رہنا، بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ، منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگ دلی، اولاد کی نالائقی، اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھالیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ،

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی، دوسرے نظریہ کے رد سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہیں جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وہ برائیاں ہیں جو خدا کی محبت سے محروم کردیتی ہیں، اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں،

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے، یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے. کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں، اور جھوٹ ٹھیک اس کے ضد ہے. اس لیے یہ برائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہیں جانتا. کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے، اب اگر وہ اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا، بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے، تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے. کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے.

اسی لیے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبروں کے لیے یہ صفت

کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ ۔۔۔ اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کر

كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا (مریم - ۴) ۔۔۔ وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا،

اسی لیے جو کاذب ہو وہ نبی نہیں ہو سکتا، کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا اور اُس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا، فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے صدقِ نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی ہو نہیں سکتا،

إِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۔۔۔ اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی

وَإِن يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم ۔۔۔ پر پڑے گا اور اگر سچا ہوگا تو تم پر پڑیگا

بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ ۔۔۔ کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے،

اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ ۔۔۔ بے شک اللہ راہ نہیں دکھاتا

كَذَّابٌ (مومن - ۴) ۔۔۔ جو بے باک جھوٹا ہو،

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گذرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے، انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں، اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہیں، روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے

کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا، ابو سفیان نے جواب دیا نہیں، قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر جھوٹ باندھے گا؟ یہ نہیں ہو سکتا،[1]

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے:

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ	شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر،
يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ	لا ڈالتے ہیں سنی بات، اور بہت
كٰذِبُوْنَ (شعراء - ۱۱)	ان میں جھوٹے ہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے، ارشاد ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ	بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا
كٰذِبٌ كَفَّارٌ (زمر - ۱)	جو جھوٹا ہے، احسان نہیں مانتا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے، اور گناہ دوزخ میں، اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے"[2] حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رض سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے، تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی [2] صحیح بخاری کتاب الادب قولہ تعالیٰ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ، و جامع ترمذی (باقی ص ۶۰۰ پر)

نیکی کا کام کرتا ہے، وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے، اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا، اُس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ دوزخ میں لیجانے والا کام کیا ہے، فرمایا جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا، اور جو کفر کریگا دوزخ میں جائیگا۔" (مسند احمد اول ص ۱۷۶، مصر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے، جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں اور جس کے لیے نجات کا ہر دروازہ بند ہے،

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے، مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے، جس کا منہ جھوٹ کی بادسموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ "لعنت" ہے، لعنت کے معنی "اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی" کے ہیں، قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بنایا گیا ہے، اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا، جھوٹ بولنے، اور جھوٹے الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے، مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدا تعالیٰ سے

(بقیہ حاشیہ ص ۵۹۹) ترمذی باب ما جاء فی الصدق والکذب وابوداود، کتاب الادب باب تشدید فی الکذب

گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو، اس پر خدا کی لعنت ہو،

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ	پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی
عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (اٰل عمران-۶)	لعنت بھیجیں،

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا،

اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ	اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ
مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (نور-۱)	جھوٹوں میں سے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے، وہ کافروں اور منافقوں کی طرح بددعا کا مستحق ہوتا ہے،

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر انجان بنجائے، حق کا علم رکھ کر بھی اُس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا	بے شک جو چھپاتے ہیں، جو اتارے
مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ	ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان، اس
بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ	کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں
اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ	کے لیے کھول کر کہدیا ہے، ان پر اللہ لعنت
اللّٰعِنُوْنَ (بقرہ-۱۹)	بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں،

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے، کیونکہ اس خاموشی اور اخفاء سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لیے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں، اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں،

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لیے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا، چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا:

وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (منافقین - ۱)

اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے، فرمایا کہ منافق کی پہچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے، اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے[1] لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں، لیکن حقیقت میں ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا، تو جھوٹ ہے ہی، مگر وعدہ کرکے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے، اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے، کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معنیً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔

جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب قول تعالیٰ وکونوا مع الصادقین وما ینہیٰ عن الکذب،

ری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے

اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (شعراء-١١) — جھوٹ بولنے والا گنہگار،

كٰذِبٌ كَفَّارٌ (زمر-١) — جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا،

مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (مومن-۴) — بے باک جھوٹا،

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپا لوں گا، اس لیے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جو جھوٹا ہوگا، وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہ مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس کی بات پر یقین کاہے کو آنے لگا، اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں، یا جو اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو، لیکن یہ کذب قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے، کذب عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے۔

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ — اس لیے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا

وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ — اس کے خلاف کیا، اور اس لیے کہ

(توبہ-١٠) — جھوٹ بولتے تھے،

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے، اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے،

وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا	اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور
لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ	ہوتا تو ہم تمھارے ساتھ لڑائی میں
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ	چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں
	ڈالتے ہیں، اور اللہ کو معلوم ہے
(توبہ - ۶)	کہ وہ جھوٹے ہیں.

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا، اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے، فرمایا:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِينَ	تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کے
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ	سبب سے اجر دے، اور منافقوں کو
الْمُنٰفِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ	سزا دے. اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو،
يَتُوبَ عَلَيْهِمْ (احزاب ۳)	(یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے. فرمایا:

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (علق - ۱)	جھوٹی خطا کار پیشانی،

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہیے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنگ کا ٹیکا ہے جو مٹ

نہیں سکتا،

اسی طرح ریاکاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے،

قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ — انھوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی
هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ — ہوگی تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں،
مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ — وہ اس وقت ایمان سے زیادہ
بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ — کفر سے قریب ہیں، وہ منہ سے وہ
قُلُوْبِهِمْ (آل عمران - ۱۷) — کہتے ہیں، جو ان کے دل میں نہیں،

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو آکر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ — وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ
مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ (نساء - ۹) — جانتا ہے،

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے، یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے، جھوٹا ہے، ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے، کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا اور واقعہ یہ نہ ہو، صرف اس کو جلانا مدنظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے، فرمایا "جو جتنا نہیں دیا گیا، اتنے کا دکھاوا

کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے[1]" حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا، اور جس نے جو نہیں دیا اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا، اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولت مند نہیں وہ دولت مندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں، اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا، درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے، غالباً اسی لیے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی زور فرمایا ہے[2]۔

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے، اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے، اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے، ایک کمسن صحابی عبد اللہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے، تو ماں نے میرے بلانے کے لیے کہا کہ "یہاں آؤ تجھے کچھ دوں گی" حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر۔

نے فرمایا تم کہتی ہو، مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو۔ ان نے کہا اس کو کھجور دے دوں گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا"۔[1]

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لیے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویہ سے بچہ کی تعلیم و تربیت پر برا اثر پڑے گا، وہ بچپن میں جو کچھ دیکھے اور سنے گا اسی سانچے میں ڈھلے گا، اسی لیے لوگوں کو چاہیے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لیے یا کسی اور چیز کیلئے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہدیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں، حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے، تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہدے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی لکھا جاتا ہے۔[2]

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لیے بولا جاتا ہے، اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ بعض موقعوں پر ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے، تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب [2] مسند احمد وطبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی ص ۱۰۰ ، ۱۸۴ باب فی ذم الکذب)

نے فرمایا ہے کہ "جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے، اس پر افسوس، اس پر افسوس" [1] کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے، اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے، اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے،

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں، ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے، اس لیے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے، لیکن وہ شخص اس کے علم ویقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب ونقصان میں مبتلا کر دیتا ہے، اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درانحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو" [2]

اس میں بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے، اور اس کو زور اور افک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے،

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب [2] ادب المفرد باب اذا کذب الرجل وہو لک مصدق،

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (حج۔۴)

بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔

زُور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں، لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے کہا ہاں یا رسول اللہ، فرمایا کہ شرک اور باپ ماں کی نافرمانی۔" راوی کا بیان ہے کہ آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃً اٹھ بیٹھے، اور کہا کہ جھوٹی شہادت" یا جھوٹی بات" اور برابر یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہو جاتے،[1]

اس آیت پاک اور اسکی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی، وہ یہی جھوٹ ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا،

اِفک اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا، مشرک خدا پر جھوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے افک کہا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے، منافقین نے حضرت عائشہ پر جو اتہام لگایا تھا، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ "افک" سے تعبیر کیا ہے (نور۔۱) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "افک" بڑے خبث طینت کا کام ہے، فرمایا

[1] ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی حقوق الوالدین،

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ، (الشعراء-۱۱) — اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر،

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ایک انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے ۔ ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے ، اور سوسائٹی میں اس کی بات کی قدر نہیں ہوتی ۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع (مقدمہ صحیح مسلم) — آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے ۔

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں ، اللہ تعالیٰ نے سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے ، یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا :-

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ (مائدہ-۶) — جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں ۔

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے، ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے، اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ لوگ اُن کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے، اس لیے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت نفس قسم کھانا ہی برا ہے۔ پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے اسی لیے قرآن پاک میں اس قسم کے قسم کھانے اور قسم کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے، اسی لیے کسی آیندہ بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ گنہگار ہوتا ہے اور اس پر کفارہ

لازم آتا ہے، کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے، یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا کپڑے پہنائے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے، اور اس کی بھی اجازت دیگئی ہے کہ کسی کو قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کردے[1]،

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ	اللہ تم کو تمھاری بے فائدہ قسموں پر نہیں
اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ	پکڑتا، لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو
بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ	تم نے گرہ باندھا، تو اس قسم کے توڑنے
اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ	کا کفارہ دس محتاجوں کو کھلانا بیچ
اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ	کا کھانا جو تم اپنے گھروالوں کو دیتے
اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ	ہو، یا ان کو کپڑا دینا، یا ایک غلام
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ	آزاد کرنا، تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین
اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ	دنوں کا روزہ رکھنا، یہ ہے تمھاری
اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ	قسموں کا اتار، جب تم قسم کھا بیٹھو
(مائدہ-۱۲)	اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو،

قسموں کا نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلاف شرع، یا غیر مناسب نہ ہو، تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کیجائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے، اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے، یہ کفارہ اسی لیے

---

[1] ابوداؤد کتاب ایمان والنذور

مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے،

کسی خلافِ شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے، یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہو بعد کو غیر انسب معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، خدا نے فرمایا:

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ (تحریم۔ ۱) — خدا نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں،

گذشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے، اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے، اسی لیے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے، حد درجہ بے اعتبار اور ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرانِ پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (قلم۔ ۱) — اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہا نہ مان۔

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس کا اعتبار کریں لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے،

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، اسی لیے یہ نفاق کی

بڑی نشانی ہے، اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب اُن پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ منشا نہ تھا، ہماری نیت نیک تھی، خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمھارے دل کی بات خوب معلوم ہے۔

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ	پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوت
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ	سے کوئی تکلیف پہنچے، پھر تیرے پاس
يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ	اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری
اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝ اُولٰٓئِكَ	غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی، یہ وہ
الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ	ہیں، جن کے دلوں کا حال اللہ
(نساء - ۹)	کو معلوم ہے،

یعنی اللہ جانتا ہے کہ اُن کے دلوں میں کچھ ہے، اور زبان پر کچھ ہے، ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں، خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو تو ان کو چاہیے کہ سچائی اختیار کر کے خدا اور رسول کو خوش کریں،

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ	تمھارے (مسلمانوں کے) آگے خدا کی
وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ	قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ وہ تم کو راضی کرلیں
يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝	اور اللہ اور رسول کو راضی کرنا زیادہ
(توبہ - ۸)	ضروری ہے، اگر وہ ایمان دار ہیں،

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں،

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ، (توبہ - ۱۰)	خدا کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا، حالانکہ انھوں نے بیشک کفر کی بات کہی،

ایک موقع پر منافقوں نے نامعقول کام کیا، خدا نے فرمایا کہ جب تم جاکر ان سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائیں گے، سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ (توبہ - ۱۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (توبہ - ۱۲)	تمھارے آگے قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔

اس لیے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں وہ فاسق اور نافرمان ہیں،

اسی واقعہ پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی، خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو وہ جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے، کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا:

وَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی	اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی
وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ	ہی چاہی تھی، اور اللہ گواہی دیتا
(توبہ - ۱۳)	ہے کہ وہ جھوٹے ہیں،

اہلِ نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے،

وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَھُمْ	اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی
یَعْلَمُوْنَ (مجادلہ - ۳)	باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں،
اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً	انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال
(مجادلہ ۳ و منافقون - ۱)	بنایا ہے،

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ، اور اس کو اپنے بچاؤ کے لیے ڈھال بنایا کرتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے:-

وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ	اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت
تَوْکِیْدِھَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ	ڈالو، اور تم نے اپنے پر خدا کو ضامن بنایا
عَلَیْکُمْ کَفِیْلًا اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ	ہے، بے شک اللہ تمھارے کاموں کو
مَا تَفْعَلُوْنَ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ	جانتا ہے، اور اس عورت کے جیسے نہ
نَقَضَتْ غَزْلَھَا مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ	بنو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کیے
اَنْکَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ	پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی، تم اپنی قسموں
دَخَلًا بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ	کو آپس میں پیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ

هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ط — اور ایک فریق دوسرے فریق سے

(نحل - ۱۳) — بڑھ چڑھ کر ہو

خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اُس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی، اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا، اس لیے قسم کھا کر توڑا نہ کرو، اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو، پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بے وقوف عورت کا تھا جو سوت کات کات کر کھول دیتی یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی،

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لیکر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بدعہدی کرتا ہے، اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے،

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے، اور یہ ایک کے بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے، یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ	بے شک جو لوگ خدا کے قرار اور اپنی
وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ	قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے
لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ	ہیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ	نہ اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ
اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ	ان کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لیے
(اٰل عمران - ۸)	دردناک عذاب ہے،

شانِ نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے، مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہر حال عام ہے، ایک دفعہ حضرت عبداللہ صحابیؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہیگا تو جب وہ خدا کے پاس جائیگا تو خدا اس پر غضب ناک ہوگا۔" اشعث بن قیس صحابی نے کہا "خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے، میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمھارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! وہ تو اب قسم کھا جائیگا، اور میری چیز لے لیگا، اس وقت یہ آیت اتری۔"[1]

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ نے تین دفعہ فرمایا "تین آدمی ہیں جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا،

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور وابن جریر۔

اور ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔" صحابی کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ لوگ جو ناکام ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے، وہ کون ہیں، یا رسول اللہ! فرمایا جو اپنا لباس گھٹنوں کے نیچے تک لٹکاتا ہے (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور احسان جتاتا ہے۔ اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے (مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ) بہرحال جیسا کہ معلوم ہے کہ شانِ نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے۔ اس لیے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا۔" صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو۔ فرمایا درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو۔[1] حضرت انسؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بڑے بڑے گناہ یہ ہیں، خدا کا شریک ٹھہرانا۔ ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا۔[2]" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لیکر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا۔[3]" چہرہ کی خصوصیت شاید اسلیے ہو کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا، اور بری ڈھیٹھائی دکھائی جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین [2] سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر۔

[3] سنن ابی داؤد کتاب الایمان۔

مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اس لیے خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے، فرمایا "جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے۔"[1] روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اسکی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے، چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے، حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے، پھر بے برکتی ہو جاتی ہے، کیسے بلیغ فقرے ہیں، فانہ ینفق ثم یمحق (مسلم ونسائی و ابن ماجہ)

جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بیباکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے، قرآن پاک کی آیت اوپر گذر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت وخواری کا سبب ہے، وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (قلم) حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسمیں کھانا، قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری موجب ہے۔"[2]

---

[1] صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی ونسائی، منذری باب ترغیب التجار فی الصدق [2] ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری ۲ باب ترغیب التجار فی الصدق۔

وعدہ خلافی

وعدہ کرکے اُس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے، اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے، کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں، جب کوئی شخص کوئی وعدہ کرلیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے۔ فرمایا،

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل) بیشک وعدہ کی بازپرس ہوگی،

اور جس کی بازپرس خدا فرمائے، اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی،

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہوگیا، فرمایا

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا

پس اس کا اثر ان کے دل میں خدا نے نفاق رکھا، اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے، اسلیے کہ انھوں نے

يَكْذِبُونَ ٥ — خدا سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور

(توبہ - ۱۰) — اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

صحیحین میں ہے کہ "منافق کی نشانی تین ہیں، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانتدار بنایا جائے تو خیانت کرے۔" (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) "اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔" صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے، جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانتدار بنایا جائے، خیانت کرے، جب بولے، جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے خلاف کرے، جب جھگڑے گالی بکے۔[1]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بولو سچ بولو، اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو، اور جب امین ہو تو خیانت نہ کرو۔[2]

---

[1] ترغیب وترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق [2] احمد، حاکم، ابویعلی، بیہقی، منذری باب انجاز الوعد،

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو، اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو، اور وہ اس میں بیجا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو، یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کرکے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے، اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو، اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا، علیٰ ہذا عام مسلمانوں، ائمۂ وقت اور اپنے متفقہ قومی وملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے۔

اسلام کی اخلاقی شریعت میں ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں، فرمایا:-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا   اے ایمان والو! اللہ اور رسول

اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ — خیانت نہ کرو، اور نہ آپس کی امانتوں

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انفال - ۳) — میں جان کر بد دیانتی کرو،

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہو کہ اقرار کرکے پورا نہ کیا جائے، ایمانداری سے اُن کے حکموں کی تعمیل نہ کیجائے، دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے، اور اللہ و رسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے، یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں، اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہو کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو، اس میں وہ ناجائز تصرف کرے، اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے،

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آچکی ہے کہ "منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کیجائے تو وہ اس میں خیانت کرے[1]"۔ ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ خدا کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے، لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا، اگرچہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو، اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہے گا، خداوندا اب کیسے لاؤں دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا کہ اس کو دوزخ کے طبقۂ ہاویہ میں لے جاؤ، وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئیگی، تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا اور اس کے پیچھے گرے گا، یہانتک کہ اُس کو پکڑ لے گا، اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا، جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اُس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا، پھر

---

[1] صحیحین وغیرہ ۱۲

انھوں نے فرمایا نماز امانت ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے، اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا، اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے، راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براءؓ بن عازب صحابی کو سنائی، انھوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا (نساء) یعنی "بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے، خیانت کریں گے، امانت داری نہیں کریں گے، اور نذر مانیں گے تو پوری نہ کریں گے۔"[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن بری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک خیانت بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت برا اندرونی ساتھی ہے۔[3]

خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا، چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے، اگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی، اور ہمیشہ ان کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا،

---

[1] مسند احمد، بیہقی، منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم منذری باب مذکور

[3] ابوداؤد و نسائی، ابن ماجہ منذری باب مذکور،

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ	اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی
مِّنْهُمْ. (مائدہ - ۳)	ایک خیانت کی.

یعنی ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی.

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے کیا،

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ	تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے
بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ	چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی
كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ	اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں
(یوسف - ۷)	کے فریب کو نہیں چلاتا.

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بیوفائی کی ان کی بے وفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں، اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، خدا نے فرمایا،

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ	خدا نے کافروں کے لیے نوحؑ کی بیوی
كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ	اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی
لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ	یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک
مِنْ عِبَادِنَا صٰلِحَيْنِ فَخَانَتَا	بندوں کے گھر میں تھیں، تو

ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی	هُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللهِ
تو یہ دونوں (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں	شَيْئًا ،
کو خدا سے ذرا نہ بچا سکے۔	(تحریم - ۲)

یہ دل کی خیانت تھی،

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ چشم و ابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہر چھپی چوری کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے، تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو، اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا

اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری	يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا
کو اور جو چھپا ہے سینوں میں،	تُخْفِي الصُّدُورُ ۞ (مومن ۲)

پھر اس سے چھپ کر کیوں کر کوئی کام کر سکتا ہے،

غداری اور دغابازی

غداری اور دغابازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دیکر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پاکر اس کے خلاف کیا جائے، قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے، عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے، کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کرکے بدل جاتے تھے، اور بار بار بدعہدی کرتے تھے، ان کے ذکر میں خدا فرماتا ہے۔

الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ	جن سے تو نے معاہدہ کیا، پھر وہ اپنا
ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي	عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ
كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ	(خدا کا لحاظ) نہیں رکھتے، سو اگر
فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ	ان کو تو کبھی لڑائی میں پا دے تو
بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ	ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے
يَذَّكَّرُونَ ۝ وَإِمَّا تَخَافَنَّ	دیکھ کر بھاگیں، شاید وہ عبرت پکڑیں

مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (انفال - ۷)

اگر تجھکو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے، اللہ کو دغاباز خوش نہیں آتے،

اس آیت میں گو ان کافروں کا ذکر ہے، جو ہر دفعہ عہد کرکے بدعہدی اور دغابازی کرتے تھے، مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری، دغابازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کردیتی ہے اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے، بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لیکر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے وہیں یہ بھی کہدیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا، پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا، فرمایا،

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (انفال - ۱۰)

اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے خدا سے بھی خیانت (دغا) کرچکے ہیں، تو خدا نے ان پر قابو دیدیا اور اللہ جاننے اور حکمت والا ہے،

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو خدا ان کا حال جانتا ہے، اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے، اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے، اس نے ان کے چھوڑ دینے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے،

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا" یعنی

صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر

اس سے اسکی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ "بدعہدی نہ کرنا"[1] یعنی دشمنوں سے معاہدہ کرکے پھر غداری نہ کی جائے، ظالم بادشاہوں، حاکموں، افسروں، سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان کا وعدہ کرکے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں، اور جب وہ ان کے قابو میں آجاتا ہے تو اس کو سزا دیتے یا مروا دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا اور پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں، اگرچہ مقتول کافر[2] ہی کیوں نہ ہو۔"

خدا فرماتا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ (مائدہ-۱)	اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول وقرار) کو پورا کرو،

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں، وعدے اور معاہدے داخل ہیں، جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے، یہانتک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں، اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے، ایک دفعہ امیر معاویہ نے رومیوں سے مدتِ متعینہ کیلئے کوئی معاہدہ کیا، اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا، تو امیر موصوف اپنی فوجیں لیکر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کردیں، یہ دیکھ کر عمرو بن عنبسہ نامی ایک صحابی سوار ہوکر نکلے اور چلائے

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر [2] سنن ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد،

اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہیں، امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اسکی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو، پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے"۔ یہ سن کر امیر معاویہ واپس چلے آئے۔[1] غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا، اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا،

---

[1] سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد،

بُہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے، یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے، بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لیے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو، قرآن نے اس کا نام افک رکھا ہے، یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں، اور اسی لیے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طعمہ نام مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی کے گھر میں چوری کی، مسلمانوں کو اس پر شبہہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا، وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا، یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، اس منافق کے گھر والوں نے

اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحیِ الٰہی نے دفعۃً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا۔[1] دوسری روایت یہ کیجاتی ہو کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی، اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا۔ اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی، لوگوں نے اس کو پکڑا، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، آپ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا، اس وقت یہ وحی آئی،[2] بہر حال واقعہ جو کچھ ہو، امرِ مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گنہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ	ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!) یہ
بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ	سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں
بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن	کے درمیان اس کے ذریعہ جو خدا
لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ	نے تجھکو سوجھایا، انصاف کر اور
إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝	خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑ
وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ	اور اللہ سے قصور معاف کرا، بیشک
يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ	اللہ بخشنے والا رحم والا ہے، اور انکی
لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝	طرف سے نہ جھگڑ، جو اپنے جی میں دغا
يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ	رکھتے ہیں، بیشک اللہ خیانت کار

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ نسا، [2] تفسیر طبری سورۂ نسا آیت إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ،

مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ	گنہگار کو دوست نہیں رکھتا، وہ لوگوں سے
مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ	چھپنا چاہتے ہیں اور خدا سے نہیں چھپنا
وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ	چاہتے اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے جب رات
مُحِيْطًا	کو وہ سازش کرتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں اور
(نسآء - ۱۶)	اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔

آگے چل کر ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا	اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے، پھر وہ اسکی
ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ	تہمت کسی بے گناہ پر دھرے، اس نے
بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (نساء - ۱۶)	طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر لادا)

ان آیتوں میں خیانت کا راز، تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے، سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے، پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے، پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گنہگار ہیں، اور خدا کی محبت سے محروم ہیں، یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لیے اپنا گناہ دوسروں کے سر ڈالتے ہیں، اور خدا سے نہیں شرماتے، جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے، اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے، اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور

گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا،

پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی، یا مجہول بچہ کو اپنا کہکر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی خدا نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آیندہ اس جرم سے باز رہے گی،

وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ	اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی، اپنے
بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ ۝ (ممتحنہ-۳)	ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے، پھر جن کے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے، خدا نے فرمایا

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ	اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں
وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا	کو بن کیے (تہمت لگاکر) تکلیف پہنچاتے
فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا	ہیں، انھوں نے بہتان اور کھلا گناہ
مُّبِينًا ۝ (احزاب-۷)	(اپنے سر) لادا،

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چونکہ ان کی عزت پر حرف رکھنا ہے، اس لیے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے اس کو کوڑے مارے جائیں۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ	اور جو لوگ شریف بی بیوں کو عیب

ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ — لگاتے ہیں، پھر نہ لائے چار گواہ
فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً — تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور
وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا — ان کی گواہی کبھی نہ مانو، اور وہ
وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ إِلَّا — فاسق ہیں، مگر جنھوں نے توبہ
الَّذِينَ تَابُوا (نور-۱) — کی۔

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا اور اسکی گواہی ہمیشہ کے لیے بے اعتبار ہوگئی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا حالانکہ وہ بے گناہ ہو یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا[1]، یہ گویا قذف یعنی تہمتِ بیجا کی مثالی سزا ہوگی، ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا کہ "جس میں جو برائی نہیں، اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے[2]" یعنی اس سے بچنا چاہیے۔

---

[1] و [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب۔

چغلخوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسوخ جتائے، اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جنکی بات نہیں ماننی چاہیے یہ لفظ کہے ہیں،

مَشَّآءٍ بِنَمِيمٍ (قلم - ۱) — جو چغلی کھاتا پھرتا ہے،

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں، تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو، فرمایا،

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوٓا اَنْ تُصِيبُوا — اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے، تو تحقیق کر لو،

قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلٰی	کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو
مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (حجرات - ۱)	پھر اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا ہے، اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں بالخصوص عزیز و اقارب اور دوست و احباب میں نااتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے، اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں، پھر خود ہی فرمایا،

المشاؤن بالنميمة المفسدون	جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں، اور
بين الاحبة (مسند احمد جلد ۶	دوستوں کے آپس کے تعلقات
ص ۴۵۹ عن اسماء بنت يزيد)	خراب کرتے ہیں،

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبرستان کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا، [۱]

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الا انبئكم ما العضه هي	کیا میں تم بتاؤں کہ عضہ کیا ہے، وہ
النميمة القالة بين الناس [۲]	چغلخوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کیجاتی ہے،

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الطہارۃ باب من الکبائر ان لا یستتر عن بولہ و صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب الدلیل علی نجاستہ البول [۲] مسلم کتاب البر والصلہ باب تحریم النمیمۃ

لغت میں عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں، اس لیے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لیے جائیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علٰحدگی کرانا چغلخوری کی حقیقت میں داخل ہے، لیکن اگر سحر کے معنی لیے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغلخوری میں مشابہت و مناسبت ہے، کیونکہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بی بی میں علٰحدگی کرائی جاتی ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے،

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ	اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے
بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ	ایسی باتیں سیکھتے ہیں، جن کی وجہ سے
(بقرہ - ۱۲)	میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں،

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں، جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے، لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ مقصد چغلخوری سے حاصل کیا جاتا تھا، عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا،" اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو یہ ہدایت کی تھی،

لا یبلغنی احد من اصحابی	میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی
عن احد شیئاً فانی احب ان	بات نہ پہنچائے، کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں
اخرج الیکم وانا سلیم الصدر[1]	کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث،

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر وہ ہوتی ہیں جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں، بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے، جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے بعض حالتوں میں جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناگوار گذرتی ہے بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں، غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے، اور جو لوگ اس بد اخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں، تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں، اسی بنا پر اہل عرب چغلخوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں، یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں اور ایندھن کے لیے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پھیلاتے ہیں، اور آتش فتنہ و فساد کے لیے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں،

قرآن مجید نے ابو لہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق حَمَّالَةَ الْحَطَب یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔

ان میں بعض لوگ استراق سمع کرتے ہیں، یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں، اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتات کہتے ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لا یدخل الجنۃ قتات[1] جنت میں چغلخور داخل نہ ہوگا،

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات۔

ہیں، تاکہ ان کا اثر بڑھ جائے، اسی لئے عربی زبان میں چغلخوری کو "وشایہ" کہتے ہیں جس کے معنی نقش و نگار کے ہیں، اور ادھر کی اودھر لگانے کے لئے چغلخوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے، اسی مناسبت سے چغلخوری کو "سعایہ" بھی کہتے ہیں جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں،

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے لیکن وہ صرف زبان تک محدود نہیں ہے، بلکہ تحریر و کتابت اور رمز و اشارت سے بھی چغلخوری کی جاسکتی ہے، اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں، بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں شخص یہ کہتا تھا، بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "فلاں شخص یہ کام کرتا تھا"

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے،

اس بنا پر چغلخوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے، ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک مالایعنی کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے، اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے،

چغلخوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، اور قتل و خونریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے، اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب و فریب، نفاق غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں، اس لئے وہ ان نتائج اور ان عناصر

کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزء ہو گئی ہے اگر امرائے کے درباروں میں تملق و خوشامد کے لئے چغلخوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریح خاطر اور لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے، اس لئے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے، اور اس کو لوگ گناہ کبیرہ نہیں سمجھتے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر اُن کی قبروں پر عذاب ہو رہا تھا، فرمایا اُن پر عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا، حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں، اُن میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا۔[1]

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں، یہانتک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپؐ نے یہ فرمادیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں، پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اُس کو منسوخ کر دیا، اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے، محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں، حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بد اخلاقیاں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں، بلکہ کبائر و موبقات

---

[1] بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر،

میں داخل ہیں،

قرآنِ مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ افکِ عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے،

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ	جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی
تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا	نقل در نقل کرنے، اور اپنے منھ
لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ	سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق
تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ	خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی ہلکی
عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ	(سی) بات سمجھا، حالانکہ وہ اللہ کے
(نور-۲)	نزدیک بڑی (سخت بات) ہے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں،

کشفِ عورت اور کشفِ عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے، یہ بد اخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل اور ناقابلِ اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے، بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغلخوری سے کام لیتے ہیں، اس لئے اُن کے شر سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اُن کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے، اور اُن کا کہنا نہ مانا جائے، اور قرآنِ مجید نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ
هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَنَّاعٍ
لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيمٍ ہ

(قلم-۱)

اور تو ایسے کا کہا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، لوگوں پر آوازے کسا کرتا ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے، اچھے کاموں سے (لوگوں) کو روکتا رہتا ہے حد سے آگے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے،

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے، اور انکے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں، اس بنا پر جن بد اخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے، اور اُن کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے انکی ممانعت کی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کردیا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ
قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا
خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ
نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا
مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ
الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ

مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں عجب
نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا
کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں، اور
نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں عجب نہیں
کہ (جن پر وہ ہنستی ہیں) وہ ان سے
بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے
کو طعنے نہ دو، اور نہ ایک دوسرے کو

وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ
اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا
تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ
بَعْضًا ۝ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ
يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا
فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝

(حجرات - ۲)

نام دھرو، ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی
کا نام ہی بُرا ہے، اور جو (ان حرکات
سے) باز نہ آئیں تو وہی (خدا کے نزدیک)
ظالم ہیں، مسلمانو (لوگوں کی نسبت)
بہت شک کرنے سے بچے رہو کیونکہ
بعض شک داخلِ گناہ ہیں اور ایک
دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو، اور
تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے بُرا
نہ کہے، بھلا تم میں سے کوئی (اس بات
کو) گوارہ کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے
بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے

۱- [illegible]

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کو اپنے قول وعمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہئے، لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طرح سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز واشارت، تحریر وکتابت اور محاکات ونقالی ہر طرح سے دوسروں کے عیوب بیان کئے جا سکتے ہیں، اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جا سکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہایت

پُرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے، اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے، جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں،

۱۔ انسان کا گوشت محض اُس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جو چیز اُس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے، وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہی،

(۲) لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدتِ غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں، اگرچہ یہ بھی ایک بُرا فعل ہے، تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص رو در روکسی کو بُرا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اُس کی بُرائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے، اور بعینہٖ ایسا ہی جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے،

۳۔ لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے اس لئے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت و سنگدلی اور بغض و عداوت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ اس لطف و محبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے،

۴۔ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی انسان کے بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے، تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند

نہ کریگا، اس لئے غیبت اُس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی جب تک کوئی شرعی معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کردے، اور اس حالت میں بھی جہانتک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے اور صرف رمز واشارہ سے کام لینا چاہئے، اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی بُرائی بیان کی ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ شبِ معراج میں میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے، اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے، اور اُن کی عزت وآبرو لیتے تھے[1]،

اعمال اور اعمال کی جزاء وسزا میں مناسبت ہوتی ہے، یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے یعنی ان کی غیبت کرتے تھے، اس لئے عالم برزخ میں اُن کی سزا یہ مقرر ہوئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں،

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ اُن لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں[2]،

اس حدیث میں بھی اعمال اور جزاء وسزا کی مناسبت ظاہر ہے، مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے، اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے، اسلئے یہ بدبو اسی مردارخواری کا نتیجہ تھی،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ [2] ادب المفرد باب الغیبۃ،

اس حدیث میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے، کہ دوسرے کے عیوب کی تشہیر و تفضیح کی جائے، اس لیے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں، اسی طرح اُن کے اس عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے، اسی نکتہ کو آپ نے دوسری حدیث میں بلا تشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا، اور فرمایا "اے لوگو جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جا گزیں نہیں ہوا ہے، نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو، کیونکہ جو شخص ان کے عیبوں کی تلاش میں رہیگا، خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کریگا، اور خدا جس کے عیب کی تلاش کریگا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کر دیگا۔[1]

لغت کے رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اُس کی بُرائی کے بیان کو کہتے ہیں مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لئے کوئی ضروری قید نہیں، اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی بُرائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں، آپ نے فرمایا "تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے"، کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں تو فرمایا اگر وہ عیب اس میں

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ،

موجود ہو تو تم نے اس کی غیبت کی، اور اگر نہیں ہو تو تم نے اس پر بہتان لگایا[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی بُرائیاں بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں، بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اسکی بُرائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی، لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہلِ لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے، جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے، باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے، بلکہ سبّ وشتم میں داخل ہے،

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہی، بلکہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کے ذریعہ سے بھی غیبت کی جاسکتی ہے، کسی شخص کی نقل کرنا مثلاً ایک شخص لنگڑا ہے تو اُس کے اس عیب کے نمایاں کرنے کے لئے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے، ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا[۲]،

اسی طرح چشم وابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے، اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی بُرائی بیان کی ہے،

هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ (قلم-۱)

(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہو (اِدھر کی اُدھر، اِدھر کی اُدھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے،

---

[۱] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ،

وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ، (همزہ) | ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور اُن پر) آوازے کستا ہو اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے ،

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ، اُن کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی ، بلکہ اس کے لئے اہلِ لغت کی تصریحات پیشِ نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں ،

(۱) ھمز ، سامنے اور لمز پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا ،

(۲) ھمز ، خاص طور پر لوگوں کے نسب کی بُرائی بیان کرنا ،

(۳) ھمز ، ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے غیبت کرنا ،

(۴) ھمز ، زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا ،

(۵) ھمز ، بُرے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا ،

(۶) لمز ، آنکھ ، ہاتھ ، سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی بُرائی بیان کرنا ،

اس تشریح سے معلوم ہو گا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے ،

کسی کی بُرائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے ، لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی بُرائی بیان کی جائے تاکہ ان کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو ، اگر بُروں کی بُرائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے ، تو اُن کی بُرائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی ، اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا ، قرآن پاک میں کافروں ،

مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغۂ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جھوٹ بولتے ہیں، یا کفر کرتے ہیں، اُن کا حال یہ ہے، اس طریقۂ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بُروں کی بُرائی کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لئے گئے ہیں، وہ اس لئے کہ اُن کے یہ بُرائیاں عالم آشکارا تھیں،

لیکن معاملات میں ایسے موقع بھی آتے ہیں، جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے قرآن پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی لیکن
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ	جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سنتا، اور
كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ؕ (نساء ۲۱)	جانتا ہے،

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی بُرائی کو پکار کر کہتا پھرے لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے، اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے بُرے اعمال کی سزا دیگا،

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بازیابی

کی اجازت طلب کی، آپ نے اُنکو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے، لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی[۱]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لئے اس کے احوالِ واقعی کا اظہار جائز ہے، غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے، یا کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے،

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی میں فریاد کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، لصاحب الحق مقالاً،

(۲) مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت از بام کی ہیں)

(۳) فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت ابو سفیانؓ کے بخل کی شکایت کی (اور آپ نے سُن کر اس کا مناسب جواب دیا)

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی غرض سے ایک شخص کو "بئس ابن العشیرۃ" قبیلہ کا برا آدمی کہا تھا،

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب ما یجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب،

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو، مگر غایتِ شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑھ نہ ہو، مثلاً اعمش یا اعرج کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہو اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک صحابی کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا،

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائیاں کرنا تاکہ اس کو تنبہ اور دوسروں کو عبرت ہو، مثلاً مخنث کو مخنث کہنا،

دورخا پن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخا پن نہیں پایا جانا چاہیے، یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیے، بلکہ یہ بد اخلاقی چغلخوری سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ چغلخور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخا آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے،

دورخے پن کے لئے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دورخا کہلائے گا، نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے، اسی لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے، ایک بار حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ہم لوگ امراء اور حکام کے پاس جاتے ہیں، تو کچھ کہتے

ہیں، اور جب اُن کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں" بولے ہم لوگ عہدِ رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے[1] اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے،

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ
(بقرۃ - ۲)

اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لاچکے ہیں، اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں،

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو اردو میں دورخا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں، اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لئے وعید شدید آئی ہے، مثلاً فرمایا، "قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے بُرا دورخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اُس کا رُخ اور ہوتا ہے، اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور"[2]

ایک اور حدیث میں فرمایا۔

"دنیا میں جس کے دو رُخ ہوں گے قیامت کے دن اُس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی"[3] یہ گویا اس کی اس عادتِ ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگوں سے دو رنگ کی باتیں کیا کرتا تھا،

۱؎ صحیح بخاری باب ماقیل فی ذی الوجہین ۲؎ بخاری کتاب الادب باب ماقیل فی ذی الوجہین وصحیح مسلم ومالک ۳؎ ابوداؤد کتاب الادب باب فی ذی الوجہین،

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام میں بدنیتی ہی بدنیتی معلوم ہوتی ہے، اور کسی کے کام میں اس کو حسنِ نیت نظر نہیں آتا، دوسرے کی طرف ان ہونی بات منسوب کرنے لگتا ہے، دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اس سے کترانے لگتا ہے، اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے،

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (حجرات ۲)	اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض و حسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس و تلاش کی بھی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں، فرمایا،

"تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بیجا ہوس کرو اور نہ آپس میں حسد رکھو، اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منھ پھیرو، اور اے اللہ کے بندو، جیسا اللہ نے فرمایا ہے، آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ"[1]

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت میں ہو، جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے، اس کی مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے، ایک دفعہ آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواجِ مطہرات رض میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں، آپ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آپڑے، وہ آپ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے، آپ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔[2]

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد و ترمذی و مالک باب تحریم الظن [2] صحیح مسلم باب انہ یستحب لمن رؤی خالیا بامرءۃ یقول ھذہ فلانۃ۔

مدّاحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد اخلاق کی پستی، دنارت اور ذلّت کی علامت ہے، اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے، اور یہ اُس کے لئے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے، خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں، یہ جھوٹ ہے، دوسرا یہ کہ وہ منھ سے جو تعریفیں کرتا ہے، اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا، یہ نفاق ہے، تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لئے اربابِ قدر وجاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے اُن کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے جس سے اُسکی دنارت اور ذلّت ظاہر ہوتی ہے، بیجا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی، تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے، اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے، اور پے درپے تعریفیں سُن کر اُس کو یقین آجاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے، اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے،

بادشاہوں، امیروں، دولتمندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور جس طرح وہ بر خود غلط ہو جاتے ہیں، اسکی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے،

قرآنِ پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے[1]، اور اُن کے انجام کی یہ خبر اُن کو دی ہے،

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ	جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہیں، اور
بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا	جو اُنھوں نے نہیں کیا، اس پر تعریف
بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ	کئے جانے کو پسند کرتے ہیں، تو ان کو
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ	یہ سمجھنا پھر یہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝	جائیں گے، اور ان کے لئے دردناک
(اٰلِ عمران - ۹)	سزا ہے،

ان آیتوں کا شانِ نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے[2]، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کئے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کئے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے مگر یہ کہ مغفرتِ الٰہی دستگیری فرمائے، اور قرآنِ پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں، ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں، وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں، اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں، جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آلِ عمران [2] فتح القدیر شوکانی،

معلوم ہوتی ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سُنا تو فرمایا تم نے اُس کو برباد کر دیا[1]، ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا، تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو، تو یوں کہو کہ میں گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہو اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے[2]،

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی، تو وہ اُس کو سُن کر مغرور ہو جائے گا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا، اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لئے بھی حکم نہیں لگانا چاہئے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم،

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کیجاتی ہیں، اُن کو سُن کر اُن کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں، اور اُن کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے،

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر اُن کی تعریفیں کیں تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی، اور فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مداحی کرنے والوں سے ملو تو اُن کے منہ میں خاک جھونک دو[3]"،

---

[1] صحیح بخاری باب کراہیۃ التمادح [2] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد باب مذکور،

[3] صحیح مسلم و ابوداؤد باب کراہیۃ التمادح،

ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپؐ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں، آپؐ نے فرمایا:۔

"اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو۔"[1]

---

[1] باب یحثی فی وجوہ المداحین،

بخل

بخل بھی اسا سی بد اخلاقیوں میں سے ہے یعنی ایسی بد اخلاقی جو بہت سی بد اخلاقیوں کی جڑ ہے، خیانت، بد دیانتی، بے مروتی بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دنارت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں، اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلھاڑی ماری، اور بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا، محتاجوں کو دینا، یتیموں کی خبر گیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبریل کی آمد کا حال سنایا، تو حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو آپؐ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بنا پر دلایا وہ یہ ہیں:-

"یا رسول اللہ! آپؐ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں، مہمانوں کو کھلاتے ہیں، اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں"

صحیح بخاری، باب بدء الوحی)

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی "بخیل" نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کے خصوصیات قرار نہ پاتے، بخالت اُن بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزاء و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا، وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا، سورہ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے، اس میں دوزخیوں کے سوال و جواب کا ایک مکالمہ ہے، اُن سے جب پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے، تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دین حق پر اعتراض کیا کرتے تھے، اور یہ سب اس لئے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزاء و سزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے،

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ	"تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے
نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ	ہم نمازیوں میں سے نہ تھے، اور مسکین کو
نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا	کھلاتے نہ تھے، اور بحث کرنے والوں
نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا	کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے
نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ (مدثر-۲)	اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے"

اس سے ظاہر ہو گا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے، اور وہ عمل کی جزاء و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا، جو مذہبی جزاء و سزا کا قائل نہیں، وہ اخلاص سے دوسروں

کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کرسکتا، یہی نکتہ سورۂ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے، دہرایا گیا ہے، فرمایا:-

اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ	کیا تو نے اُس شخص کو دیکھا جو جزا کے
فَذٰلِكَ الَّذِیْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ	دن کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ	بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے، اور فقیر
(ماعون)	کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے،

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں کیونکہ یہ فیاضی اُس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہو سکتی، جو مقبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا میں پانے کا متوقع رہتا ہے، اور جہاں کہیں اُس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی، وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اُس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے، اور وہ کبھی ضائع نہیں جا سکتی،

ایک اور مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کی روزی زیادہ نہیں، اور اس لئے اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، خدا فرماتا ہے:-

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ	یہ خیال صحیح نہیں، بلکہ بات یہ ہے

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ	کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہیں کرتے،
وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا	اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے
وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّاؕ	کو رغبت نہیں دلاتے، اور مردہ کے
	متروکہ مال کو کھا جاتے ہو، اور مال
(الفجر)	و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو،

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں مگر یہ سب کی سب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں، سورہ ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو دولت کی تھیلیوں کو گویا اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے اور سمجھتا ہے، کہ اُن کے بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا، اور یہ چیز اُس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی، حالانکہ یہ کتنا خیالِ خام ہے، فرمایا،

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ	جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گنا کیا اسکو
يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ	سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ
كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ	زندہ رکھے گا، ہرگز یوں نہیں، وہ
(ھمزہ)	بالضرور دوزخ میں ڈالا جائیگا،

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور ادر کارِ خیر میں خرچ نہ کرنیوالے کو اُس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے، جو کھال تک کھینچ لے۔

كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى	ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے کھینچ لینے
تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى	والی کھال، پکارے گی اُس کو

وَجَمَعَ فَاَوْعٰی ؁ (معارج - ۱)

جس نے (حق) سے پیٹھ دی، اور پھر گیا اور اکٹھا کیا، اور سینتا،

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے، سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی کپڑا، اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں، اس لئے اُن کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں، اُن کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں، جن کو خدا نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ اپنے لئے درہم و دینار نہیں جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ
اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ
جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ
وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ
هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ
فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ؁
(توبہ - ۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ
کر رکھتے ہیں، اور خدا کی راہ میں خرچ
نہیں کرتے، تو اُن کو دردناک سزا
کی خوشخبری سنا دے، جس دن اس کو
دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائیگا،
پھر اس سے ان کی پیشانیاں کروٹیں
اور پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور کہا
جائیگا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے
لئے گاڑ کر رکھا تھا تو جس کو گاڑ کر

یہ بخیل کی اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے، اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہیے، اس کو ایک جگہ روک کے رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لئے مضر ہے جس کے رُکن وہ خود ہیں،

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ	اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی
بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	مہربانی سے اُن کو دیا ہے، روکے رکھتے
هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ	ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ
لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا	سمجھیں، بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر
بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ،	ہے، جس کا مال کا وہ بخل کرتے ہیں
	اس کا طوق بنا کر اُن کے گلے میں
(آل عمران - ۸)	قیامت کے دن پہنایا جائیگا،

یعنی جس دولت کو اُنھوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا کر رکھا تھا وہ قیامت کے عالمِ مثال میں واقعی اُن کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا، حدیث میں ہو کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔[۱]

جو بخیل ہوتا ہے اُس کو خلقِ خدا اور خدا کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی، اسکی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے، اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہو، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے،

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ،

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۝ (حدید - ۳)

اور اللہ کسی اترانے والے شیخی مار سے محبت نہیں کرتا، جو آپ بخل کرتے ہیں، اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں،

اور جس سے خدا محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے، اسی لئے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز واقربا بھی محبت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے، اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ اُن کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل خوار ہوتے ہیں،

قرآنِ پاک میں بخل کی سب سے بڑی تمثال کا نام قارون بتایا گیا ہے، جس کا قصہ سورۂ قصص میں ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی خدا جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہوگی) خزانے تو الگ رہے خزانوں کی کنجیوں کے گچھوں کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اُٹھا سکتے تھے، تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا کہ اس نے اپنے فضل کرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے، اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولتمند گذر چکے ہیں ان کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے چنانچہ اس کی

قارون اور اُس کی دولت کا بھی انجام یہ ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی، خدا نے فرمایا،

اَوَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ	کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اُس سے پہلے
اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ	قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقتور
مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ	اور اس سے زیادہ دولت مند کو
اَكْثَرُ جَمْعًا ۭ (قصص - ۸)	تباہ کرچکا ہے،

زمانہ محمدیؐ کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی، اور صاف کہدیا گیا،

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ	ابولہب کو اُس کا مال اور جو کچھ اسنے
(ابی لہب)	کمایا، کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا،

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اُس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہوسکتا جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہوجاتا ہے، اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے،

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تُدْعَوْنَ	ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے
لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ	کو بلایا جارہا ہے، تو تم میں کوئی بخل
مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا	کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہو تو وہ
يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ	اپنے ہی سے بخل کرتا ہے، اور اللہ

وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ | بے نیاز ہے، اور تم ہی محتاج ہو،

یعنی اُس کے بخل کے بُرے نتیجے اُسی کے کو بھگتنے پڑیں گے،

بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اُس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے، نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت، نہ آبرو، ہر شخص اُس کو ذلیل و خوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقرا اس کے لئے بد دعا کرتے ہیں، یہانتک کہ بیوی بچے جن کیلئے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے، ہر ایک اُس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اُس پر قبضہ کرلے، چور اس کے درپے رہتے ہیں، ڈاکو اُس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہیں، مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے، اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا، لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور اُدھر اس کے وارثوں نے الّلے تلّلے اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لئے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے، وہ اس مالِ مفت کو دم کی دم میں اڑا دیتی ہے، اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلس و قلاش ہو جاتی ہے،

خدا اپنے رسول کی زبانی فرماتا ہے،

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ	اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا اور
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ	(خدا کی یا نیکی کی باتوں کی) پروا

لِلْعُسْرٰی ۝ وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ۝

نہ کی، اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کے سخت کام کیلئے آسان بنا دینگے اور جب وہ گریگا تو اُس کا مال اس کے کام نہ آیگا،

(لیل)

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لئے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے، وہ بُری عادت خصلت اور بُرے کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے، اور اُن کو صرف اس لئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے، بڑی آسانی سے کر گذرتا ہے، بھوکا وہ رہتا ہے ننگا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے، راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا عزیز و اقارب، دوست و احباب سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، وہ سب سے نالاں اور اُس سے سب نالاں رہتے ہیں، پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڈھے میں گرتا ہے، یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئیگا تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیْبٍ

اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے، (خدا کی راہ میں) خرچ کر دو (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے)

وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ط

تو کہے کہ میرے پروردگار تونے مجھے
تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی کہ
کہ میں خیر خیرات کرتا، اور نیکوکاروں
میں سے ہوجاتا،

(منافقون - ۲)

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا، اس کیلئے سامان پہلے سے چاہئے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی دعائیں کرتے ہیں، خوب خوب وعدہ کرتے ہیں کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے وہ کریں گے، مگر جب اللہ تعالیٰ اُن کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں، اور نیکی کے ہر راستہ سے منھ موڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ
اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّ
قَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ
فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا
بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ

(توبہ - ۱۰)

اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے
خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے ہم کو
اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات
کریں گے، اور نیکوکاروں میں سے
ہوں گے، پھر جب خدا نے ان کو اپنے
فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے

خدا فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ — تو اللہ نے اُن کے دلوں میں اس کا

(توبہ ۹ - ۱۰) — نتیجہ نفاق رکھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے، شاید اسی لئے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں، بخل اور بد خلقی"[1] رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جن برائیوں سے بچنے کی خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک بخل بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ "خداوندا میں بخل، کسلمندی، کبر سنی، قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں"[2]،

اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و مبرات کی ترغیبات شریعتِ محمدیؐ میں اسی لئے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک و صاف رہیں،

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ خدا کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے، وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں، اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں، جس کو علم ملا ہے اُس کو چاہیئے کہ اپنے علم کو پھیلائے، اور دوسروں کو بتائے، جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے،

[1] جامع ترمذی [2] صحیح مسلم،

اسی لئے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ	اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم
شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ	ہوگا جو خدا کی شہادت کو جو اس کے
(بقرہ - ۱۶)	پاس ہے چھپائے،

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ "اللہ اور رسول کے بعد سب بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا، اور اس کو پھیلایا[1]" اس لئے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا،

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے اللہ کے حق اور بندے کے حق، اللہ کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندون کے حقوق کا مجمل مجموعہ زکوٰۃ یعنی مستحق لوگون کے ساتھ بخشش ہے، دیکھیے کہ ذیل کی آیتون میں ان ہی دونون کی عدم بجاآوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے،

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ، قَالُوْا	کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی کہین گے
لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ، (مدثر - ۲)	کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے، اور نہ
وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ	محتاجون کو کھلاتے تھے،

پہلا گناہ حقوقِ الٰہی کی بجاآوری سے انحراف، اور دوسرا بندون کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورہ ماعون کے آخر میں ہے،

---

[1] مشکوۃ کتاب العلم،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	پھر خرابی ہے اُن نمازیوں کی جو اپنی
عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ	نماز سے بے پرواہ رہتے ہیں، وہ جو دکھاوا
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَ	کرتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو
يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ، (ماعون-۱)	مانگے نہیں دیتے،

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں، اور صرف دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں، یہ حقوق الٰہی سے تغافل ہے، اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدمِ تعمیل کا سبب بنتا ہے، اور اس لئے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے،

حرص وطمع

حرص وطمع یالالچ وہ بُرائی ہے جس مین نفس کی دنارت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، خصوصًا وہ حرص وطمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو، عربی میں اس کو شُحّ کہتے ہیں، جس کی بُرائی قرآن میں کئی موقعوں پر آئی ہے، خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے، گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا، اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں، شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اس لئے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے، اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں، یا ایک شخص کے کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے، اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے، اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان و ایثار کا سلوک ہو، اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا، عشرتکدہ بنجائے گا، میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ	اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری
وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ	ہے، اور اگر تم احسان کرو، اور تقویٰ
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝	اختیار کرو، تو اللہ کو تمہارے کاموں
(نساء ۶ - ۱۹)	کی ساری خبر ہے

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں، اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں، تو اللہ تعالیٰ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے، سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دیگا۔

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے، جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا، وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی، فرمایا،

وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ	اور خرچ کرو، اپنے لئے بھلائی کرو،
وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا گیا
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (تغابن ۲)	وہی کامیاب ہیں۔

ایک اور موقع پر یہ ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ (حشر ۱)	اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں
كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ	اگرچہ خود ان کو ضرورت ہو، اور جو اپنے
يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	جی کو لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں

اسی کا نام ایثار ہے، یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے، اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا، جب تک حرص و طمع کا خاتمہ نہ ہو، اسی لئے خدا نے فرمایا جو حرص و آز سے پاک ہوں گے، وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا، بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے، اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے، کیونکہ اس میں دو بد اخلاقیاں شامل ہیں، ایک بخل اور دوسری حسد، فرمایا،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ	اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے
بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ	ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے،
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ	مردوں کے لئے اُن کی کمائی ہے، اور
لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ	عورتوں کے لئے اُن کی اور اللہ
وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ	سے مانگو، اس کے فضل میں سے حصہ'
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (نساء ۵)	بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے،

مطلب یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی، کاش خود اسے ملتی، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لئے ہاتھ پھیلانا چاہیے اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا، اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی، ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا، اسی لئے فرمایا،

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ	اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات
الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ	آیتیں، اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے
لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا	تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پسار
مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ	جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو
(حجر-۶)	فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی، اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟

یہی حرص وطمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسری کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ "حرص وطمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا، اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انھوں نے خون بہایا۔ اور حرام کو حلال سمجھا"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے، فرمایا "حرص سے بچو، کیونکہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انھوں نے (بے گناہوں کا) خون بہایا، اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ انھوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اور اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا"[2]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا "حرص سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں، اسی نے انکو کہا تو انھوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا[3]، اسی نے کہا تو انھوں نے بخل کیا، اسی نے ان کو فسق وفجور کے لئے کہا تو انھوں نے فسق وفجور کیا[3]" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص، اور گھبرا دینے والی نامردی ہے[4]

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم [2] صحیح ابن حبان ومستدرک حاکم [3] ابوداؤد وحاکم [4] صحیح ابن حبان وابوداؤد

حریص آدمی اس لیے غم میں گھلتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا، فلاں کے پاس یہ ہے میرے پاس نہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھنے والی فرمایا، نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے،[۱] سبب ظاہر ہے کہ ایمانِ کامل کا نتیجہ، صبر توکل اور قناعت ہے، اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری، اور ہوس ہے، ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ انسان بوڑھا ہوتا ہے، مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں جینے کی خواہش اور مال کی حرص[۲]، کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیے جائیں، وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے،[۳]

(بقیہ حاشیہ ص ۶۸۰) کتاب الجہاد باب الجرأۃ والجبن [۱] نسائی [۲] ترمذی [۳] ترمذی وصحیح ابن حبان وطبرانی وابو یعلی وبزار (منذری ج ۲ ص ۲۳۸)

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے، کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے، اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے، اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظامِ عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے، اسلام نے اس نظامِ عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کر دیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا
أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ
(نساء ٤ - ٥)

اے ایمان والو! آپس میں ایک
دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے
مت کھاؤ،

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں، اور جن کی جزئیات

کی کوئی حد نہیں ہے، چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے، یا زور ظلم سے لے یا غصب کرے، یا چوری کرے، یا اس میں خیانت کرے، رشوت لے، سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا، اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا، وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں"[۱] جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتادی۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ڈھیر پڑا دیکھا، آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے، آپ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، فرمایا تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں، جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں"[۲] یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہوا "جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا، وہ خدا سے ملیگا تو خدا اس پر غضبناک ہوگا"[۳] ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی تو آپ نے فرمایا "اگر اس نے قسم کھائی تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے تو خدا سے جب وہ ملیگا تو خدا اس سے منھ پھیرلے گا"[۴]

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غشنا فلیس منا۔ [۳]، [۴] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من اقتطع حق مسلم۔

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو "غصب" کہتے ہیں، غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے، جو غریب مچھوؤں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت خضرؑ نے فرمایا،

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ	وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی،
لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ	جو دریا میں محنت کرتے تھے، تو میں
فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ	نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کر دوں،
وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ	اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو
سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ہ (کہف - ۱۰)	ہر کشتی کو چھین لیتا تھا۔

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا، اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سعید بن زیدؓ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا طوقہ الله سبع ارضین[1] تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا"، یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے[2]۔

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے، جو مقدمہ بازی سے متعلق ہو، کتنے لوگ ہیں

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و غصب الارض، یہ عبارت کئی طرح سے ہو۔ فی سبع ارضین، من سبع ارضین، الی سبع ارضین [2] شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور،

جو وکیلوں کی قوتِ بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں، حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے، اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے، اور میں اس کے حق میں فیصلہ دیدیتا ہوں، اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلادی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے، کیونکہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے[1]"

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے، مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جاکر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرادیتے ہیں،

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ	اور آپس میں ایک دوسرے کا مال
بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى	ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ۔ اور نہ
الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ	پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ تاکہ
اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ	کھا جاؤ لوگوں کا کچھ مال گناہ سے
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ ۲۳)	اور تم جان رہے ہو۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح کمزور

[1] ابو داؤد کتاب الاقضیہ،

کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پا کر اُن کا مال خلافِ انصاف نہیں کھانا چاہیے جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے ،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ	بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا
الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ	جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے
فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ	ہیں اور اب وہ آگ میں
سَعِیْرًا ۰ (نساء - ۱)	بیٹھیں گے۔

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے، اسی لئے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے، یعنی ہات کاٹ ڈالنا،

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ	اور جو کوئی چور ہو، مرد ہو یا عورت
فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً	ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو، سزا ان
بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ	کی کمائی کی، تنبیہ اللہ کی طرف سے
وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (مائدہ)	اور اللہ ہے زور آور حکمت والا،

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے، اور اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے، تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا مرتکب فعل کے خبثِ باطن کو ظاہر کرتا ہے، پھر اس کے بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے، اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں، اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پا لیتا ہے، اس لئے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے، اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفاے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اسکے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی، سورہ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بی بیوں سے لیا جاتا تھا، ان میں کا ایک یہ بھی ہے کہ "وہ چوری نہ کریں گی"۔ فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خاتونیں اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ نے ان سے بھی اسکا عہد لیا، اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہند نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ میرے اور میرے بچوں کے لئے پورا خرچ نہیں دیتے مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں، فرمایا، تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو[۱] اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی، دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے، اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور حسبِ ضرورت ہم سے

---

[۱] صحیح بخاری کتاب النفقات،

پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہیں،

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ نے لیا ہے، حضرت عبادہ بن صامتؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کروگے، پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری خدا کے ذمہ ہے، اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا، اور اس کی سزا اس کو دیدی گئی، تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا، اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا، اور خدا نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ میں ہے، چاہے معاف کرے چاہے سزا دے[1]"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چور پر لعنت بھیجی، فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے، پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے،

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لئے کرتا ہے کہ وہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں رکھتا، یا کم از کم بہ فعل کے ارتکاب کے وقت اُس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے، تو خدا بھی ہم کو نہیں دیکھتا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا[2]"

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ "تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے مگر حق کے ساتھ[3]" یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو یا اس کا کوئی کام

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود [2] ایضاً [3] ایضاً

کر کے معاوضہ میں حاصل کرو، یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا	اے ایمان والو، تم آپس میں ایک
أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ	دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت
إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ	کھاؤ، لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس
تَرَاضٍ مِنْكُمْ، (نساء-۵)	کی خوشی سے،

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہر اُس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہو،

عرب میں قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگوں نے اُس کی سفارش کی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتے اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے، خدا کی قسم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا![1]

ایک صحابی ایک چادر سرہانے رکھکر سو رہے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا، وہ پکڑ کر آیا تو صحابی موصوف نے اکر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تین[2] درہم کی تھی، کیا تین درہم کے لئے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا،

[1] ابو داؤد کتاب الحدود،

مین نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی، اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپنے فرمایا مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیون نہین کرلیا[1]،

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپ کو جنّت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہوکر آپنے فرمایا کہ میں نے دوزخ مین اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرا لیتا تھا، اور اگر مالک ہشیار ہو جاتا تو کہدیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا، اور اگر وہ بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا، آپ نے فرمایا میں نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتین گھسیٹتا پھرتا تھا[2]،

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود [2] صحیح مسلم باب صلوٰۃ الکسوف،

ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہیں، اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے، اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اُس نے اُن نازک سے نازک ناجائز معاملہ کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہین سمجھا جاتا تشریح کی اور انکی برائیون کی تشہیر کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیمون سے اُن کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے، جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں، اور جس سے سب سے زیادہ غریبون کو نقصان پہنچتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو، وہ اس کو دے دی جائے یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے جسے خدا نے دنیا میں قائم کیا ہے، اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہئے جو شخص دوسرے کا جو حق ہے، اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے، وہ اس ترازو سے

کام نہین لیتا ہے، فرمایا۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ (رحمٰن)

اور آسمان کو اونچا کیا، اور ترازو رکھی کہ مت زیادتی کرو، ترازو میں، اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو، اور مت گھٹاؤ تول،

اس ترازو سے انسان کا ہر قول و فعل تلتا ہے، اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے،

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے، جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے، اور یہ بھی چوری ہی ہے، اسی لئے قرآنِ پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدین آئی ہیں، حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی، اسی لئے ان کی دعوت میں ناپ تول مین ایمان داری کی تاکید بار بار کی گئی ہے، حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ (شعراء)

اور پوا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹا کر دو لوگون کو ان کی چیزیں اور مت پھرو ملک میں فساد پھیلاتے،

یہی حضرت شعیبؑ مدین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گذر میں آباد تھے،

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ	اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو میں
إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ	تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں، اور
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُحِيطٍ ۝	ایک گھیر لینے والے دن کی آفت
وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ	کو تم پر ڈرتا ہوں، اور اے میرے لوگو!
بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ	ناپ اور تول کو انصاف سے پورا
أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي	کرو، اور لوگوں کی چیزیں ان کو
الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝	گھٹا کر مت دو، اور ملک میں فساد
(ھود - ۸)	پھیلاتے مت پھرو۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے، اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بنجاتا ہے، یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے، مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہی نصیحت پھر سورہ اعراف میں دہرائی گئی ہے۔

فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا	تو ناپ اور تول پوری کرو، اور مت

تبخسوا النّاس اَشیاءَ ھُم — گھٹادو، لوگوں کو ان کی چیزیں اور

وَلَا تُفسِدُوا فِی الاَرضِ — زمین میں اس کی اصلاح کے بعد

بَعدَ اِصلَاحِھَا ذٰلِکُم خَیرٌ — خرابی مت ڈالو، یہ تمہارے لئے

لَکُم اِن کُنتُم مُّومِنِینَ (اعراف ۱-۱۱) بھلا ہے اگر تم کو یقین ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی اسلام میں

جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے، اس کے بعد ہے،

وَاَوفُوا الکَیلَ وَالمِیزَانَ ہ (انعام ۱۹) اور ناپ اور تول کو پورا کرو۔

سورہ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے،

وَاَوفُوا الکَیلَ اِذَا کِلتُم — اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو، اور

وَزِنُوا بِالقِسطَاسِ المُستَقِیمِ — سیدھی ترازو سے تولو۔ یہ بہتر ہے اور

ذٰلِکَ خَیرٌ وَّاَحسَنُ تَاوِیلًا ہ (اسرائیل ۴) اس کا انجام اچھا ہے۔

آیت کا آخری ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے،

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بد اخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ اُن کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں، اور ایک دن آئے گا جب اُن کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا، سورہ مطففین میں جہاں اس بد اخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے،

اس بیماری کا یہ علاج بھی بتا یا گیا ہے، فرمایا،

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ
إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْ
فُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوْ
هُمْ يُخْسِرُونَ ه أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ
أَنَّهُمْ مَّبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ
يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِينَ (مطففین-۱)

خرابی ہے اُن گھٹا کر دینے والوں کی
جو اوروں سے جب ناپ کریں تو پورا
لیں، اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں
تو گھٹا دیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ
ایک بڑے بھاری دن کے لئے ان کو
اٹھایا جائے گا جس دن سب لوگ دنیا
کے مالک کے لئے کھڑے ہوں گے۔

چھپا کر لینا

جو سامان و اسباب کئی آدمیون مین ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علحدہ علحدہ نہ کیا گیا ہو، اس مین سے کوئی چیز دوسرے ساجھیون سے چھپا کر لے لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مالِ غنیمت مین جو بددیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہین، غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیون کا حصہ ہے، جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کر دے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے، اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے، اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بددیانتی اور چوری دونون ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز مین ہر ایک کا حصہ ہے، تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہیئے، لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہین ہوا ہے اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصہ ہے، اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لئے حلال نہین ہو سکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی

اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے، تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اکی تنہا ملکیت نہیں،
اسی لئے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو
چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ
چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے، اور یہ صریح بے ایمانی ہے،
قرآنِ پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیر عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ
بھی گنہگار ٹھہرے گا، اور چونکہ انبیاء علیہم السّلام بھی امیر ہوتے ہیں، اور وہ گناہوں سے
مبرا ہوتے ہیں، اس لئے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ اس کا
ارتکاب کریں گے، فرمایا،

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّغُلَّ — اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ
(آلِ عمران - ۱۷) — غنیمت میں سے چھپا کر لے لے،

پھر فرمایا،

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ — اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کرے گا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ — تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لیکر
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا — آئے گا، پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائیگا،
يُظْلَمُوْنَ ۝ (آلِ عمران - ۱۷) — اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا،

غزوۂ خیبر کے مالِ غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا خیبر سے
چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آکر ایسا لگا کہ اس کا کام

ہی تمام ہو گیا، مسلمانون نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے جس شملہ کو اس نے خیبر مین تقسیم سے پہلے لے لیا تھا، وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے، لوگون نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے آگ کا۔[۱]

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی، جب اسکا جنازہ تیار ہوا تو آپ سے عرض کیا گیا، آپنے فرمایا تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو، یہ سن کر لوگون کے چہرون کا رنگ بدل گیا، اور سمجھے کہ کوئی بات ہے، یہ دیکھ کر آپنے فرمایا تمھارے بھائی نے مالِ غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے، صحابہؓ کہتے ہین کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیون کا ایک ہار نکلا جو چند آنون سے زیادہ کا نہ تھا۔[۲]

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے سب لوگ اپنا اپنا مالِ غنیمت لے کر آتے، پھر اس میں سے پانچوان حصہ نکالا جاتا، اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا، اس کے بعد جو لے کر آتا، وہ قبول نہ ہوتا، اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالون کی ایک لگام لے کر آیا، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا کیا تم نے بلال رضی اللہ عنہ کی تین دفعہ منادی نہین سنی تھی؟ اس نے کہا سنی تھی، پوچھا پھر اس

---

[۱] و [۲] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول۔

وقت کیون لے کر نہین آئے، اس نے معذرت کی، فرمایا تم اس کو قیامت مین لے کر آنا ہین نہین قبول کرتا۔[1]

عمّال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانون کے بیت المال مین لاکر پیش کرین، فرمایا "اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو، وہ ایک سوئی بھی چھپا کرے گا، تو وہ غلول" ہے، وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔[2]

---

[1] ابو داود کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول [2] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے،
رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لئے کسی
ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کر لے،[له]

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے
تھے، اہلِ غرض ان کو اس کے لئے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے، اس
کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا، اس پر بھی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی[سه]،

عرب میں یہودیوں کے مقدمے، ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے، اور
چونکہ دولت اور تموّل نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کر دیئے تھے، اس لئے وہ قانون
کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لئے علانیہ رشوت
دیتے تھے، اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے، اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے

له مجمع البحار مادہ رشا
سه منتقی مع نیل الاوطار
باب ما جاء فی اجرۃ الکاہن
و مہر البغی

تھے اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے،[1] چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری تھی، قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ	خدا نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو
اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَ	چھپاتے ہیں، اور اس کے ذریعہ معمولی
یَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا	معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے
اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ	پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، خدا
اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ	ان سے قیامت کے دن بات نہ کریگا
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ	نہ ان کو پاک صاف کریگا، اور ان
وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ؁ (بقرہ-۲۱)	کے لئے دردناک عذاب ہے،

"پیٹ میں آگ بھرنا" اس لئے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں اگر خدا کے احکام میں رد و بدل اور منشاے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے اس لئے یہی سزا ان کو ملے گی، ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علماء کو اس لئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں، وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں، لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام الٰہی میں عام طور سے رد و بدل کیا کرتے تھے، اور اس کے ذریعہ دنیا کی دولت کماتے

---

[1] صحیح بخاری رجم زانی۔

تھے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں اُن کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے، فرمایا،

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ	اور تو اُن میں سے بہتوں کو دیکھے
فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ	کہ وہ گناہ اور زیادتی، اور حرام
السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا	کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام
يَعْمَلُونَ، لَوْلَا يَنْهَاهُمُ ۔	ہیں، جو وہ کرتے ہیں، ان کے درویش
الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن	اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور
قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ	حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے،
لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ	کیا بڑے کام ہیں جو وہ کرتے
(مائدہ - ۹)	ہیں،
سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ	جھوٹ کے بڑے سننے والے، اور
لِلسُّحْتِ، (مائدہ - ۶)	حرام کے بڑے کھانے والے،

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گذر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے،

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم	اور آپس میں ایک دوسرے کا مال
بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى	ناجائز طریق سے مت کھاؤ اور نہ مال
الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ	کو حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے
أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَ	مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ
أَنتُمْ تَعْلَمُونَ ٥ (بقرہ - ۲۳)	اور تم جان رہے ہو،

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے، رشوت کی ممانعت مین صاف و صریح ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے[1]، رشوت دینے والے پر یون کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے، اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں مین منع ہے"

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن رواحہ رض صحابی کو بھیجتے، وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے، اور کہدیتے تھے کہ ان دو مین سے جو چاہو لے لو، یہودیون نے اپنے دستور کے مطابق اُن کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس مین چندہ کر کے اپنی عورتون کے کچھ زیور اکھٹے کئے، اور کہا کہ یہ قبول کرو، اور اس کے بدلہ تقسیم مین ہمارا حصہ بڑھا دو، یہ سن کر حضرت ابن رواحہ رض نے فرمایا "اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق مین مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہین کر سکتا، اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے، وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہین کھاتے" یہودیون نے ان کی یہ تقریر سن کر کہا کہ "یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان و زمین قائم ہیں[2]"،

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی[3]، ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے، اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ

[1] ابوداؤد کتاب الاقضیہ [2] موطا امام مالک کتاب المساقات [3] ابوداؤد کتاب الاقضیہ کتاب الجہاد،

یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، حمد و ثنا کے بعد فرمایا،

"عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمھارا ہے، اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھکر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لیجائیگا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائیگا، اونٹ، گائے، بکری، جو ہو، پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا، "خداوندا میں نے پہنچا دیا"[1]

اس تقریر میں آپ نے جو کچھ فرمایا وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے،

---

[1] صحیح بخاری باب ہدایا العمال،

سُودخواری

سود خواری، حرص و طمع، بخل، اور ظلم کا مجموعہ ہی حرص و طمع تو یوں کہ سود خوار اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اُس کے پاس آجائے، بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا، اور نہ کسی کارِ خیر میں دیگر اپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہی، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود خواری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے، اور ظلم یوں کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے، اور رحم نہیں کرتا، اسی لئے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا،

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ — نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے،

(بقرہ - ۳۸)

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لو، یہ تمہارا ظلم ہے، اور جتنا تم نے دیا ہی اتنا تم کو نہ ملے، تو یہ تم پر ظلم ہے، اس حرام خواری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بدولت

پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے، اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے، یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے،

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا	اور اُن کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ
عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ	وہ اس سے روک دیے گئے تھے، اور لوگوں
بِالْبَاطِلِ ۝ (نساء - ۲۲)	کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب

اسلام آیا تو اُس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جا رہی تھی ہمیشہ کے لئے دور کر دیا،

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا	جو سود کھاتے ہیں وہ ایسے اٹھیں گے
يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ	جیسے وہ اُٹھتا ہے جس کے شیطان
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ	نے لپٹ کر حواس کھو دیئے ہوں یہ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ	اس لئے کہ انھوں نے کہا کہ خرید و
مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ	فروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح
حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَاۗءَهٗ	ہے، اور اللہ نے خرید و فروخت کے
مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى	معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا
فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ	ہے، تو جس کے پاس اس کے پروردگار
وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ	کی نصیحت پہنچی، اور وہ باز رہا، تو

هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ

(بقرہ - ۳۸)

اس کا ہو جو پہلے دیا گیا، اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہی، اور جو پھر لیا کرے تو وہ دوزخی ہیں، وہ دوزخ میں رہیں گے خدا سود کو مٹاتا او صدقہ وخیرات کو بڑھاتا ہی، اور اللہ کسی ناشکر گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔

قیامت میں سود خوار کا بدحواس ہوکر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی، دنیا میں سود خواروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال ودولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کار خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے، آیت کے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے سود خوروں کو ناشکر گنہگار ٹھہرایا ہے، کیونکہ خدا نے جو دولت اُن کو دی تھی، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کار خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا، اور ظلم سے اُن کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا، اور یہ نعمت کی ناشکری تھی،

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے، جو سود کی کاروبار کرنے لگے تھے، جیسے حضرت عباس بن عبد المطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ، اب وہ اور اُن کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرضداروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا تو اس پر یہ آیتیں اتریں، جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ - ۳۸)

اے ایمان لانے والو! خدا کا خیال کرو، اور سود جو رہ گیا ہو، اس کو چھوڑ دو، اگر تم واقعی مومن ہو، تو اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کیلئے ہشیار ہو جاؤ، اور اگر تم باز آؤ تو تمھارے لئے تمھارا اصل سرمایہ ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے، اور اگر وہ (مقروض) تنگدست ہو تو اس کو کشادگی تک مہلت دو، اور معاف کر دینا تمھارے لئے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو اور اس دن سے ڈرو جسمیں تم خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائیگا جو اس نے کیا، اور ان کا کچھ دبایا نہ جائیگا۔

ان آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئیگا جب سب خدا کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے، اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا، اس کا حساب ہوگا تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی، اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا تو خدا کے یہاں پورا پورا مل جائے گا،

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدہ پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے تو مہاجن کہتے ہم مدت بڑھا دیتے ہیں، تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے، اور اسی طرح جب تک وہ قرض نہ ادا کر دیتے، یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا، خدا نے فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا	اے ایمان والو! (اصل سے) دو گنا
الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَ	چوگنا سود مت کھاؤ، اور خدا سے
اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝	تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاح پاؤ، اور
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ	اس آگ سے بچو، جو منکروں کیلئے
لِلْكَافِرِينَ ۝ (آل عمران - ۱۴)	تیار کی گئی ہے،

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خواری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک رویائے صادقہ میں سود خواروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے، فرمایا میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے، اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لئے کنارہ کھڑا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے، اور وہ پتھر

لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سود خوار ہے[1]،

سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں، سود خوار آسانی سے اُس پر قبضہ کر لیتا ہے، تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے، اور جو پتھر لقمہ تربن کر اُس کے منہ میں چلا جاتا ہے تو وہ وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے،

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی[2]،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اولاد المشرکین وکتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح،

[2] ابوداؤد کتاب البیوع،

شراب خواری

شراب خواری اُن عاداتِ ذمیمہ میں سے ہے جن کی بُرائی کھلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں، اسلام سے پہلے جو مذہب تھے، ان میں بھی اس کی بُرائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے،[1] اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے، لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے، شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی، شراب پینا، پلانا، اچھے اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، بی بیاں[2] شوہروں کو اور چھوٹے بچے اپنے بزرگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے،

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی،[3] مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ میں آتے تو جو

---

[1] لوقا، ۱-۱۵۔ [2] سبعہ معلقہ میں قصیدہ الاہبی بصحنک،

[3] صحیح بخاری کتاب الاشربہ،

اونٹ ملتا، اس کو پچھاڑ ڈالتے، اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے، اور ساتھیوں کو اس کے کباب لگا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے اُن کو ذبح کر کے اُن کے گوشت کے حصے کئے جاتے، ان کو سب مل کر آپ کھاتے، اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے،

اسلام آیا تو اُس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی، پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں، خدا نے تم کو کھجور اور انگور دیئے جو بہت بڑی نعمت ہیں، لیکن تم اُن سے نشہ تیار کرتے ہو، اور کھانے پینے کے کام میں بھی لاتے ہو، فرمایا،

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ	اور کھجور اور انگور کے میوے دیئے، تم
تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا	اُن سے نشہ بناتے ہو، اور اچھی روزی
وَرِزْقًا حَسَنًا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ	اس میں ان لوگوں کے لئے خدا کی نشانی
لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (نحل-۹)	ہے، جو سمجھتے ہیں،

اس آیت میں نشہ کو "رزق حسن" کے مقابلہ میں رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ رزق حسن نہیں، ان آیتوں میں میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں، اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں،

۱؎ سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری میں حضرت حمزہؓ کا قصہ ۲؎ تفسیر کبیر امام رازی ۳؎ مفسرین کی مختلف رائیں ہیں،

مدینہ میں آکر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا حکم ہوا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ — تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو،

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی، اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ گناہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا،

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (بقرہ ۔ ۲۷) — (اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے لئے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور انکا گناہ اُن کے فائدے سے بڑا ہے،

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہیں، او دوسروں کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے، لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں، اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا، اور وہ شراب سے تائب ہو گئے، لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا، اس لئے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے آخر یہ آیت اُتری،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ	اے ایمان والو! شراب اور جوا اور
وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ	چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ	کام ہیں، شیطان کے، سو ان سے بچے
لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ	رہو، شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان تو یہی
اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ	چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور
فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ	جوے سے دشمنی اور بیر ڈال دے اور
ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ	تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک
اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ۝ (مائدہ-۱۲)	دے پھر اب تم باز آتے ہو،

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا، خداوندا! ہم باز آگئے[۱] اُس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خم اُلٹے جا رہے تھے، اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی،[۲]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں اوّل یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے، دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں، اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے، ان تینوں اسباب کی سچائی روزِ روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے،

اوپر کی آیت میں شراب اور جوے کو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے یعنی شراب اور جوے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے

---

[۱] ابوداؤد، اشربہ [۲] صحیح بخاری کتاب الاشربہ،

پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور بُرے کاموں میں سے شمار کیا ہے، اس لئے اُن سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں، اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی بُرائی کا اظہار بھی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب اُن کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مرگیا تو فرمایا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (قصص - ۲) "یہ ہوا شیطان کے کام سے" یعنی بہت ہی بُرا کام ہوا، اسی طرح اس آیت اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (بنی اسرائیل - ۳) "بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں" کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوے، بتوں کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانوروں کے بے کار ذبح کر کے پانسوں سے اُن کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے، کون نہیں جانتا شراب خواری، قمار بازی، اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جس کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں،

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں، ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی، معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں، اور وہ کام کر گذرتے ہیں جن کو ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے، کتنے قتل کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کے بدولت روزانہ پیش آتے ہیں، مذہبی بُرائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد، اور نماز سے جو زندگی

کا سب سے بڑا فرض ہے، غافل ہو جاتا ہے، بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کیساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہجاتا، اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے،

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے، قرآن نے اس کے لئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے، خمر کہتے ہیں چھا جانے کو، اسلئے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش کو چھائے، وہ خمر میں شامل ہے، حضرت عمرؓ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا "شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے"[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے"[۲] فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی، اور اس سے توبہ نہ کی، وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا"[۳] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج میں تشریف لیگئے تو آپ کے سامنے دست غیب نے دو پیالے رکھے، ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب[۴] سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا، ناموس وحی حضرت جبرئیلؑ نے کہا اس خدا کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی، اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی اُمت گمراہ ہو جاتی"، گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے،

حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "کوئی مومن شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس[۵] کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے"[۶] یہ بھی فرمایا کہ "قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا"[۷]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [۲] صحیحین کتاب الاشربہ [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] صحیحین کتاب الاشربہ، [۷] ایضاً

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سدِ ذرائع کے طور پر حرام کیے یہانتک کہ شروع شروع میں اُن برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا جنمیں شراب عموماً بنائی جاتی تھی، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو اٹھادیا۔[1]

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہو کہ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ) "گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو" کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا، سب حرام ٹھہرایا گیا، فرمایا "خدا نے شراب پر، اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لئے نچوڑنے والے اپنے لئے نچوڑنے والے، اس کے لیجانیوالے اور جس کے پاس لیجائی جائے سب پر لعنت فرمائی ہو"۔[2]

یہ بھی ارشاد ہوا کہ "ہر نشہ کی چیز حرام ہے" اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو، اس کا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے"۔[3]

---

[1] صحیحین کتاب الاشربہ [2] ابوداؤد کتاب الاشربہ [3] صحیحین وابوداؤد و ترمذی کتاب الاشربہ

غیظ وغضب

غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی بُرائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے، اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لئے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے، اور بے سبب غیظ وغضب کا اظہار نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں، وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (آل عمران-۱۴۰) دوسری جگہ فرمایا، وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ (شوریٰ-۴) "اور جب اُن پر غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں"، انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے، معاف کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اُس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے، اور معاف کر دے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے"۔[1]

[1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب، بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب،

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جاریہ بن قدامہؓ، حضرت ابو درداءؓ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، ارشاد ہوا کہ "غصہ نہ کیا کرو" اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی، تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی، آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا، کہ "غصہ نہ کیا کرو"[1] مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ حقیقت میں ساری برائیوں کی جڑ ہے،

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہؓ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں جن میں سے ایک یہ تھی، فرمایا آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کئے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے، اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور رفع بہت دیر میں ہوتا ہے، تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور جلد ہو جائے اور ان میں سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو، اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو، ہاں غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہیے کہ وہ زمین سے لگ جائے[2]

---

[1] صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و طبرانی (منذری باب الترہیب من الغضب)

[2] جامع ترمذی (منذری باب مذکور)

ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا "غصہ شیطان سے ہی، اور شیطان آگ سے بنا ہے، اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وضو کرے"[1] حضرت ابوذر رض کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے ہے[2]

صحیحین میں ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہو گیا، اور رگیں پھول گئیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا، پھر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہی اور وہ یہ کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کہے[3]

اس اخیر حدیث کی تائید قرآنِ پاک کی اس آیتِ کریمہ سے ہوئی ہی،

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ	معاف کرنے کی عادت ڈال، نیکی
وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ وَاِمَّا	کی بات کہہ، اور نادانوں سے درگذر
یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ	کر، اور شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھارے
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ	تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہ سننے
عَلِیْمٌ (اعراف-۲۴)	والا اور جاننے والا ہے،

اسی قسم کی آیت سورہ حٰم السجدہ (۵) میں بھی ہی، جس کا ترجمہ یہ ہی،

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کظم غیظاً [2] ایضاً [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب،

"نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہوگی، وہ ایسا ہو جائیگا جیسے دوست رشتہ والا، اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے اور اگر ابھارے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہی سننے والا جاننے والا ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیئے کہ خداوندا! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا، اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھیئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے، تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے مقصود اس سے یہ ہو کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی، اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے، اس سے منشا یہ ہے، کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی، اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی،

بغض و کینہ

دل مین کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیرپا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہین، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا	اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے
الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ	بھائیون کو جو ہم سے آگے ایمان مین
وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا	پہنچے، معاف کر اور ہمارے دلون
لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ	مین ایمان والون کا کینہ مت رکھ
رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ؀	اے ہمارے پروردگار تو نرمی والا
(حشر - ۱)	مہربان ہے،

جنت کی خوبیون مین سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس مین جو لوگ ہون گے، آپس مین بھائی بھائی ہون گے، وہان بغض و کینہ کا گذر نہ ہوگا، فرمایا،

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ	اور ہم نے اُن کے سینوں سے جو کینہ تھا
مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ	نکال لیا، بھائی بھائی ہو کر تختوں پر
مُّتَقٰبِلِیْنَ ہ (حجر-۴)	آمنے سامنے بیٹھے،
وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ	اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ
مِنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ	تھا نکال لیا، نہریں ان کے نیچے بہتی
الْاَنْهٰرُ ج (اعراف-۵)	ہوں گی،

ان آیتوں کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا، جنت کا تخت ہاتھ نہ آئے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو جو تعلیم دی ہے، اس کا یہ منشا ہی کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے، فرمایا،

"اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، اے اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے[1]"

مطلب یہ ہو کہ اگر کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے، ابو ایوب رض صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے، دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیرے، اور

[1] صحیح بخاری و مسلم و مالک، ابوداؤد، ترمذی، نسائی،

ان دونون مین بہتر وہ ہے جو سلام مین پہل کرے[1]"

ایک اور روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کسی مومن کے لئے جائز نہین کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے تین دن جب ہو جائین تو ان مین سے ہر ایک دوسرے سے اگر ملے پھر سلام کرے تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونون کو مزدوری ملی، اور اگر اس نے جواب نہین دیا، تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا[2] کئی حدیثون مین ہے کہ آپ نے فرمایا "ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہین، تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہین کیا خدا اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیون مین آپس مین کینہ ہوتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ ان دونون کو ابھی رہنے دو میل کر لین[3]"

اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا "دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہین تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی، اس کو مغفرت دی جاتی ہے، اور جس نے توبہ کی ہوگی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والون کے اعمال اُن کے کینہ کے سبب سے لوٹا دئے جاتے ہین، جب تک وہ اس سے باز نہ آئین[4]" یہ بھی حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا "تین شخصون کی بخشائش نہین، ان مین سے ایک وہ جو اپنے سے کینہ رکھتا ہے[5]"

ان حدیثون پر غور کیجئے شرک اور کینہ دونون کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا (رہا)

---

[1] مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد [2] سنن ابی داؤد [3] مالک و مسلم، ابوداؤد، ترمذی و ادب المفرد بخاری [4] طبرانی فی الاوسط (منذری ج ۲ ص ۴۱۶ مصر)

[5] ادب المفرد بخاری باب الشحناء،

دین دو چیزون سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندون کا حق، جب تک شرک رہے گا اللہ کا کوئی حق ادا نہین ہو سکتا، اسی طرح جن دو آدمیون مین کینہ رہے گا، اُن مین سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا، غرض جس طرح شرک، حق اللہ سے مانع ہے، بغض وکینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے، اور ان ہی دونون حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے،

ظلم

ظلم کا لفظ قرآنِ پاک مین کئی معنون مین آیا ہے، یہان تک کہ کفر وشرک اور عصیان کے معنون مین بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہان مراد اُس ظلم سے ہے، جو بندے بندون پر کرتے ہین، قرآن مین اس کے لئے دو لفظ بغی (سرکشی) اور عدوان (تعدی) آئے ہین، یہ ظلم اسلام کی شریعت مین حرام ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ
وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ
(اعراف - ۴)

کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کامون کو جو کھلے ہون یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے،

دوسری جگہ فرمایا،

وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ
وَالْبَغْیِ ۝ (نحل - ۱۳)

اور خدا بے حیائی اور ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے،

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن وامان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے، اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لئے دی گئی تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ	اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں،
هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ	اور برائی کا عوض اس طرح کی
سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ۔۴)	برائی ہے،

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اُس کے ساتھ کی جائے،

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے تو مظلوم اپنا انصاف خدا کے ہاں پائے گا، اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہے گا،

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ	پھر جو کوئی معاف کردے، اور سنوار دے
عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ	تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے،
الظّٰلِمِيْنَ ۝ (شوریٰ۔۴)	بیشک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا،

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے، اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی،

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ	اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے

وَاُولٰئِکَ مَا عَلَیْہِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ (شوریٰ - ۴) | بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں،

ملامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے۔ اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے،

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ط اُولٰئِکَ لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ | راہ ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں، ان کے لئے دکھ دالی سزا ہے،

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلب قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی،

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ط اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا (اسرائیل - ۴) | اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے، بے شبہہ اس کو مدد دی جائے،

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو، لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا،

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے۔ اس کے دو فائدے ہیں، ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ

ہچکچائیں گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گی، فرمایا،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ	نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (نساء ۲۱)	اللہ سنتا جانتا ہے،

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے، تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگوں کریں،

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى	تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر
الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ	چڑھ آوے، تو سب لڑو اس چڑھائی
حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ،	والے سے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے
(حجرات - ۱)	حکم پر پھر آئے،

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کیجائے، اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے۔ تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، فرمایا،

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ	اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ وہ
اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی، اس
اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ	جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی
وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا	کر بیٹھو، اور نیکی اور تقوی کے کاموں

عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ	پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ إِنَّ اللّٰهَ	اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝	کیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک
(مائدہ - ۱)	وہ سخت سزا دالا ہے،

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا مین مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا موثر حربہ جس کا نام آجکل عدم تعاون اور نان کوآپریشن ہے، اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہی، اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ او ظلم وتعدی کے کامون مین ظالمون کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کامون مین شریک نہ ہوا جائے، البتہ اس عدم شرکت کی صورتین زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہین،

حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانون کو فرمایا کہ "تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم"، صحابہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا "اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے"، اس طریقۂ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالئے. ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والون کے دلون مین توجہ کی خلش پیدا کردی، اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہوگئے، تو اس کمال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہی، کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے،

---

۵ صحیح بخاری ابواب المظالم وصحیح مسلم باب نصر الاخ ظالما او مظلوما،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے موثر انداز میں سنائی، فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ "اے میرے بندو! میں نے اپنے لئے اور تمہارے لئے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو"[۱]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بنیگا"[۲] ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھا پن قیامت کے دن ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے چاہئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے، اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے"[۳] براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا، اور سات باتوں سے روکا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے[۴] حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ نے یمن بھیجا تو ان کو نصیحت فرمائی کہ "مظلوم کی بد دعا سے بچتے رہنا، کیونکہ اس کے اور خدا کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں"[۵]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا

---

[۱] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد جلد ۵ ص ۱۵۴ و ص ۱۶۰ و ص ۷۰، و ادب المفرد بخاری باب الظلم [۲] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و صحیح بخاری ابواب المظالم [۳] صحیح بخاری ابواب المظالم [۴] ایضاً [۵] صحیح بخاری ابواب المظالم

کسی چیز پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہئے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہو گا نہ درہم، ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی، اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی[۱]"۔ فرمایا کہ "ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں[۲]"۔

فرمایا "اہل ایمان دوزخ سے پاک ہو چکیں گے تو جنّت اور دوزخ کے درمیان ایک پُل کے پاس روکے جائیں گے، وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر جو ظلم لئے تھے ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تب اون کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی[۳]"۔

---

[۱] صحیح بخاری ابواب المظالم [۲] صحیح مسلم باب تحریم الظلم [۳] صحیح بخاری ابواب المظالم،

.... ۔۔۔ ....

فخر و غرور

انسان مین جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل مین اس کا خیال پیدا ہوتا ہی، اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہین لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہی کہ وہ اور لوگون کو جن مین یہ وصف نہین پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہی، تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہین، دنیا مین سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ مین اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا، اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ (اعراف ۲) مین اس سے بہتر ہون، وہ مٹی سے بنا ہے، اور مین آگ سے بنا ہون، خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا، اور فرمایا، فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ○ (اعراف-۲) یہان سے اتر جا، یہان تجھے غرور کرنا زیبا نہیں نکل جا، تجھے بڑائی کے بدلہ یہان ذلت کی چھوٹائی ملی،

کبر و غرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے جس کے لئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہین بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگون کی تحقیر بھی ضروری ہے، چنانچہ حدیث شریف مین ہی کہ

ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں، اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے، اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے[1]

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا، پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ط

(ابراھیم - ۳)

اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے روبرو نکل کھڑے ہوں گے، تو (جو لوگ دنیا میں) کمزور تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے، کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے، تو کیا (آج) تم عذاب خدا میں سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیانِ دولت کے پاس بھیجا، لیکن انھوں نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول

[1] ابوداود، کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر۔

کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے،

فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا	تو وہ سب شیخی میں آگئے، اور وہ تھے
عَالِیْنَ) مومنون - ۳)	(ہی) سرکش لوگ،

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے اُن کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں،

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	اس پر اُن کی قوم کے سردار جو ان
مِنْ قَوْمِہٖ مَا نَرَاکَ اِلَّا	کو نہیں مانتے تھے، لگے کہنے کہ ہم کو
بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاکَ	تو تم ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے
اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ	ہو اور ہمارے نزدیک صرف وہی
اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَمَا	لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم
نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ	میں رذالے ہیں، (اور پیرو ہو بھی
بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ،	گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری
	نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے
	سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ ہم
(ھود - ۳)	تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں،

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا، جو نے

آپ کو مذہبی، قومی یا سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے، اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے، تاکہ کبر وغرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں، عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے،

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ	لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی)
شِقَاقٍ (ص - ۱)	ہیکڑی اور مخالفت میں (پڑے) ہیں،

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار اختیار کیا ہے،

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ	جتنے مغرور اور سرکش ہیں، اللہ ان کے
مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (مومن - ۴)	دلوں پر مہر لگا دیتا ہے،

دو موقعوں پر اس کے لئے مختال کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ	اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور
مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝ (نساء - ۶)	اور فخار ہو،
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ (نحل - ۳)	اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا،

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی نہیں دے دی گئی ہے،

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى	کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانا نہیں،
لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (زمر - ۶)	

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ٥ (دمن-۸) تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہی،

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لئے ہے کہ اُن کا غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے،

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں، ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا، اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھکر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگوں سے ملتا ہے، تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا[1]، اور امام غزالی نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے، کہ مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں، وہی جنت کا دروازہ ہیں، اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہیگا،

یہ بد اخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے، اور اس کے نتائج

---

[1] ابو داؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر،

گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لئے اُن سب کا استقصار تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کردیئے ہیں، مثلاً کبر و غرور کے جو مظاہر امراء و سلاطین سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں، اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے" ایک بار آپ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے، تو صحابۂ کرام تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، فرمایا کہ عجمیوں کی طرح تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوا کرو۔[1]

بڑے آداب و القاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا اگر وہ خلافِ واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے، اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں، عجمی بادشاہ اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے بُرا نام خدا کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے"[2]

کبر و غرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے، مثلاً

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۔ (بنی اسرائیل - ۴)	اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر (کیونکہ اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا، اور نہ تن کر چلنے سے پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا،
وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ	اور لوگوں سے بے رُخی نہ کر اور زمین

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل، [2] صحیح بخاری،

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا — میں اترا کر نہ چل، بیشک اللہ اس کو
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ — پیار نہیں کرتا، جس کو گھمنڈ ہو،
فَخُوْرٍ ہ (لقمان-۲) — فخار ہو،

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے،

ثَانِیَ عِطْفِہٖ، (حج-۱) — اینٹھتا ہوا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

مَنْ جَرَّ ثَوْبَہٗ خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ — جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا
اللّٰہُ اِلَیْہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ، — خدا اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھیگا[1]

ایک حدیث میں ہے کہ گذشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو خدا نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جارہا ہے[2] اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع و خاکساری پر دلالت کرتے ہیں اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ
یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا
وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ
قَالُوْا سَلٰمًا (فرقان-۶)

اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں، اور جب جاہل ان سے جہالت کی باتیں کرنے لگیں تو ان کو کہہ سلام

۱؎ ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار ۲؎ ترمذی ابواب الزہد،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا، اُس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے، فرمایا "خدا نے مجھکو شریف بندہ بنایا ہے، متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے"[1]

ایک صحابی نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں، حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں، کمل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ "جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا"[2]

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، قوت اور اعوان و انصار کی کثرت، اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں،

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب و نسب کی برتری کا خیال تھا، اسکو یہ کہہ کر مٹا دیا،

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن	لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم)
ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا	اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا، اور
وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا، (حجرات-۲)	(پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں

[1] ابن ماجہ کتاب الاطعمہ باب الاکل متکئاً [2] ترمذی ابواب البر و الصلۃ باب ما جاء فی الکبر

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ — اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی

(حجرات - ۲) — ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے،

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا کہ "خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقے کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیزگار اور بدکار بدبخت تم لوگ آدم کے بچے ہو، اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں، یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں، جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے[1]"

جہاں تک زیب و زینت اور جسم کی ظاہری آرایش اور پاکیزگی کا تعلق ہے حسن و جمال کو ایک قابلِ قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ سے دریافت کیا کہ مجھکو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتہ عمدہ ہو تو فرمایا کہ "خدا حسن کو پسند کرتا ہے[2]" یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال، غرور و تکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، شریعت نے انکی ممانعت کی ہے، چنانچہ ایک صحابی کو آپ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں، جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہبند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے، اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا[3]۔

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التفاخر بالاحساب [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر

[3] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار،

اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی، مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی، اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا، لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنا لیا جائے، تو اس کی حقیقت جلوہ سراب سے زیادہ نہیں،

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	(لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ	اور تماشا اور ظاہری طمطراق اور آپس
بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ	میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور
وَالْاَوْلَادِ،	ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور
(حدید-۳)	اولاد کا خواستگار ہونا (بس یہی کچھ ہے)،

احادیث میں مال و دولت کی بُرائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، اُن میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بنجاتا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کردیا، آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا اور پہن کر پھاڑ ڈالا۔[1]

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کی تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام

[1] ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا،

انجام دیئے جا سکتے ہیں، اس لئے اس قسم کے موقعوں پر وہ ایک قابلِ ستایش وصف ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "قوی امین" کہا ہے، اور حضرت لوط علیہ السلام نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے،

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ،

(ھود - ۷)

(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھکو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی، یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ پاتا"

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوعِ انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے،

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً

(روم - ۶)

اللہ ہی وہ (قادرِ مطلق) ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے، بنا کھڑا کیا پھر (طفلی) کی کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی،

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامانِ جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا،

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ

اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہانتک تم سے ہو سکے کافروں کے (مقابلہ کیلئے) ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ اپنا

لا تعلمونهم اللہ یعلمھم	کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور دنیز، اُن کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ (ان کو جانتا ہے)
(انفال - ۸)	

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے[1] اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے، تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں، بلکہ تواضع وخاکساری کی فضیلت ہے، جو ایک قابلِ ستائش وصف ہے، اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر وغرور کے ساتھ کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

الا اخبرکم باھل الجنۃ	کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟
کل ضعیف متضعف الا	ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو
اخبرکم باھل النار کل	کمزور سمجھیں، کیا میں تم کو بتاؤں کہ
عتل، جواظ متکبر[2]	دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، اُجڈ خود دار

دوسری حدیث میں ہے،

احتجت النار والجنۃ فقالت	دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا

---

[1] مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز [2] بخاری کتاب الادب باب الکبر

ھٰذہٖ یدخلنی الجبارون	دوزخ نے کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ
المتکبرون وقالت ھٰذہٖ	داخل ہوئے، اور جنت نے کہا کہ مجھ میں
یدخلنی الضعفاء والمساکین[۱]	کمزور اور مسکین لوگ،

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ضعف بجائے خود قابلِ مدح وصف نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف اسلئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے،

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لئے ایک مایہ الامتیاز چیز رہی ہے، بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر وغرور کرتی ہیں، اور اس فخر وغرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں، بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہیں، زمانۂ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان وانصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا، اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی، اور قیامت کبھی نہ آئے گی، اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی، وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے،

اَنَا اَکْثَرُ مِنْکَ مَالًا وَّاَعَزُّ	میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور
نَفَرًا (کہف - ۵)	(میرا جتھا بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہے

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کیلئے اس قدر کبر وغرور جائز نہیں،

---

[۱] مسلم کتاب صفات المنافقین واحکامہم باب النار یدخلہا الجبارون

أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ۔ (کہف - ۵)

کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا، پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا،

نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب الٰہی نے اس کی دولت کو ملیا میٹ کر دیا، اور اس کے جتھا ٹوٹ گیا، اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائدار چیز فخر و غرور کے قابل نہیں، اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور زندوں سے گذر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر و غرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا، اور اس مقابلہ کے لئے ایک خاص لفظ "تکاثر" ایجاد ہو گیا تھا جس نے اُن کو دینی امور سے غافل و بے پروا کر دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک سورہ میں انسانوں کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی،

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ (تکاثر - ۱)

تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو،

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں، بلکہ اجتماعی و تمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابلِ فخر چیز ہے، بشرطیکہ فخر و غرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے،

تزوجوا الودود الولود فانی

محبت کیش اور بچے جننے والی عورت

مکاثر بکم الامم[1] سے نکاح کرو، کیونکہ کثرتِ تعداد میں

میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل

میں فخر کرونگا،

آج تعداد کی اسی اقلیت و اکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رُخ بدل دیا ہے، اور اسلام کی نگاہ میں یہ نکتہ چھپا نہ تھا،

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار،

ریا

ریا کے لغوی معنی دکھاوا اور نمائش کے ہیں، انسانی اعمال کی اصل حقیقت اُن کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لئے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی و بُرائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، صحیح حدیثوں میں ہے کہ إِنَّمَا الاعمال بالنیات عمل نیت سے ہے، اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے، نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی اور بُرائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسنِ ظن پیدا کرے، اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں، اسی لئے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے، اور اُن کی بُرائی بیان کی ہے، جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور، اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا اور ان کافروں جیسے نہ ہو جو مارے

مِنْ دِیَارِھِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ ہ (انفال - ۶)	شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے،

یہ ریا اور نمایش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے، بلکہ اس سے کوئی دنیوی غرض مطلوب ہو، اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر رکھا ہے، کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے، اسی لئے خدا فرماتا ہے،

اَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ، (فرقان - ۴)	کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں تو جو شخص میرے لئے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کر لے تو مجھکو اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسی کے لئے ہے جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے"

ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو جمع کریگا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو خدا کے لئے کیا گیا ہو، کسی اور کو شریک کر لیا ہے، وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے، کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھکو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے، لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگے گی،

بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگوں کے لئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی؟"[1]

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ یہ ہے، کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریا، اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے، وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے لیکن خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے، اس بنا پر قرآن مجید میں جابجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے،

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا	مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر
صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی	اور سائل کو طعن دے کر اس شخص
کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ	کی طرح اکارت مت کرو، جو اپنا
النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ	مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ
الْیَوْمِ الْاٰخِرِ،	کرتا ہے، اور اللہ اور روز آخرت کا
(بقرہ - ۳۶)	یقین نہیں رکھتا.

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا، اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے، پہلا مقصد

[1] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ،

چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے وہ نہایت بے پروائی غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں، اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مصنوعی خشوع وخضوع، للّٰہیت اور محویت و استغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے،

عہد رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں، اس لئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں، اسی لئے ایسے شخص کے عمل میں للّٰہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا،

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا	منافق (مسلمانوں کو دھوکہ دیکر گویا) خدا کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ (حقیقت میں) خدا ہی کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہے، اور یہ لوگ) جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں (ظاہرداری کرکے) لوگوں کو دکھاتے ہیں، اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر کچھ یوں ہی سا،
(نساء - ۲۱)	

فَوَیْلٌ لِلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَاءُوْنَ، (ماعون)

تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں، اور وہ جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں،

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہؓ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ نکلے اور فرمایا کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟ صحابہؓ نے کہا "ہاں" فرمایا "شرکِ خفی" اور یہ کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو، اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے، اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے، کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے"[۱]

چونکہ اور نمائش اعمال کی اصلی شکل وصورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی، اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، بالخصوص عرب کے فضائلِ اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی، اور لوگ محض نام و نمود کے لئے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے، اسلام نے صدقہ و خیرات

---

[۱] ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ،

کا حکم دیا تو اس بد اخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لئے قرآن وحدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ وخیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس میں ریاکاری کی آمیزش نہ ہونے پائے،

إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ
فَنِعِمَّا هِيَ وَإِن تُخْفُوهَا
وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ
(بقرہ - ۳۷)

لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ، اور حاجتمندوں کو دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے، (کہ اس میں نام ونمود کا دخل نہیں ہونے پاتا،

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، خدا سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا[1]

عرب کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نام ونمود کی جو چیز تھی، وہ شجاعت تھی اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لئے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے، اس لئے وہ ریاکاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ بالیمین،

مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی، چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے، ایک شخص شہرت کے لئے، اور ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لئے لڑتا ہے تو ان میں کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے، فرمایا "اس شخص کا جو اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو"

آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہارِ شجاعت کیلئے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہو، تو کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے، وہی پہلا جواب ملا ہو"

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہی، اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی، اس میں ریاکاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی، اس کے نتائج بد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت موثر طریقہ سے بتائے، ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا، جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا، اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے اُن سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا، اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم صرف اسلئے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے، اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا، لوگوں کو علم سکھایا، اور قرآن پڑھا، اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا، علم سکھایا، اور تیرے لئے

ل؎ مسلم کتاب الامارت باب قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ

قرآن پڑھا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اسلئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ، پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا، اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، وہ کہیگا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ بکتے ہو، تم نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں، پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[1]

---

[1] مسلم کتاب الامارہ باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق بالنار،

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی ، خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس مین اور کبر مین یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسرون سے بڑا سمجھتا ہو، لیکن خود بینی کے لئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہان تک کہ اگر انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصافِ کمالیہ پر غلط ناز کرسکتا ہے،

اصل یہ ہو کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیان نظر آتی ہین، وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہو کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے، اور یہ تمام کمالات اور خوبیان اس کو ایسی معلوم ہوتی ہین، گویا وہ خود اس کی اختیاری ہین، اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہین، اسی کا نام عُجب اور خود بینی ہے، اسی سے نفس مین خود نمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے، اور اکثر حالتون مین وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے،

حنین کی لڑائی مین مسلمانون کی تعداد کافرون سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانون مین عُجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کرسکتا ہے، خدا کو اُن کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا

اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرتِ الٰہی نے اُن کے پاؤں تھام لئے، اور شکست فتح سے بدل گئی۔ خدا نے فرمایا،

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا (توبہ۔۴)

اور حنین کے دن جب تمھاری کثرتِ تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کردی تو اس تعداد کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا،

اسی لئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو اُن میں جھوٹا غرور، اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو، بلکہ اُن میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو،

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (انفال۔۶)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے،

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے

جب کسی قوم میں تمدّن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق، ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے، اور یہی اُن کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا،

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ (قصص۔۶)

اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کریں جب وہ اپنے گذران میں اترا چلیں،

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا، لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک تماشا

برباد ہو جائے گی یعنی قیامت آئے گی تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہو کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی، اور اسی پر ناز کریگا اور اترائے گا، اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہئے[۵]،

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہو ان کو اسی عجب و خودبینی کی بنا پر اپنی پرہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی ممانعت فرمائی ہے،

فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ — تو (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو،

بِمَنِ اتَّقَى، (نجم-۲) — پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہی،

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ میں عجب و خودبینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے،

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ — اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ

نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (مائدہ-۳) ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں،

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ — (اے پیغمبر ان یہودیوں سے) کہو کہ اے

زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ — یہود اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہو کہ اَور

مِنْ دُونِ النَّاسِ (جمعہ-۱) — تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے چہیتے ہو،

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب و خودبینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب ہے

[۵] ابو داؤد کتاب الملاحم،

زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا،

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے، حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "تم نے اس کو ہلاک کر دیا"[1] ایک بار آپ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اسکی تعریف کی، آپ نے فرمایا کہ "تم نے اس کی گردن کاٹ لی، اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے، تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں"[1] مدح کی یہ ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے،

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے، اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا،

لَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (حدید) خدا نے جو دیا ہے اس پر اترا و نہیں،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ما یکرہ من التمادح،

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے چونکہ اسلام عرب مین آیا، اور عربون کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لئے تمام مذہبون مین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہو جس نے فضول خرچی کو روکا ہے، اور انسان کو اپنی حد مین رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے، اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہین پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر و غرور اور نمایش کے پردہ مین ظاہر ہوتی ہے اور ان بد اخلاقیون کی برائی چھپی نہیں،

اہل عرب جب جلسون مین شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا مین جو کچھ جیتتے، نشہ کے ترنگ مین اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے، جاہلیت کی شاعری مین اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہین، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کیلئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہانتک کہ دونون مین ایک کے تمام اونٹ

ختم ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل مین مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔[۱]

اہلِ عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر و غرور اور نام و نمود پر قائم تھی، اور اس نے انکی فیاضی مین بے اعتدالی پیدا کر دی تھی، اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی، اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لیے جائز مال کافی نہین ہوتا تھا تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، اور نمایش کے موقعون پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے اس بے اعتدالی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے، اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا،

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ	اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر
وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ	(ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو
تَبْذِيرًا، إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ	اور (دولت کو) بیجا مت اڑاؤ، کیونکہ
كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ	دولت کے بیجا اڑانے والے
وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ	شیطانون کے بھائی ہین، اور شیطان
كَفُورًا (اسرائیل-۳)	اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہی،

آیت کے آخر ٹکڑے سے ثابت ہی کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہی، امام رازی اس

۱؎ ابو داؤد ۲ ذبائح،

آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

"بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے، کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر و غرور کے حاصل کرنے کیلئے صرف کرتے تھے، آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے، اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہیدست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے، بلکہ الٹے تمہیں کو لوگ قابل ملامت ٹھہرائیں گے،

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً	اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا)
اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا	گردن میں بندھا ہے، اور نہ بالکل
كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا	اسکو پھیلا ہی دو (ایسا کروگے) تو تم
مَحْسُورًا،	بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی
(بنی اسرائیل -۳)	کریں گے (اور) تم تہی دست بھی ہو گے،

چونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا	اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی
وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ	نہ کریں، اور نہ بہت تنگی کریں، بلکہ ان کا

قَوَامًا (الفرقان - ۲)　　　　خرچ افراط اور تفریط کے درمیان ہے ہوگا"

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی کو پسند کرتا ہے اور کھانے پینے، پہننے اوڑھنے
مین ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے
اندر رہنا چاہئے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہین کرنا چاہئے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی
فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورۂ اعراف مین خدا فرماتا ہے،

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا اِنَّهٗ　　　　اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو بیشک اللہ
لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ه (اعراف - ۳)　　　　فضول خرچی کرنیوالون کو پیار نہین کرتا،

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہین، مگر اس مین بھی بعض مفسرین
کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہین،

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ　　　　درخت کے پھل سے جب وہ پھلے تم
اٰتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ؗ　　　　کھاؤ، اور اس کا حق ادا کرو جب فصل
وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ　　　　کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے
الْمُسْرِفِيْنَ (انعام - ۱۷)　　　　آگے بڑھنے والون کو پسند نہیں کرتا،

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے تو ان چیزون کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل مین اُن کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہین اور یہ کوئی بد اخلاقی نہین، بلکہ دینی امور مین پسندیدہ ہی لیکن اگر وہ ان چیزون کو دوسرے کیلئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتین اس سے چھین لی جائین تو اسی کا نام حسد ہی اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت میں خدا تعالیٰ نے مسلمانون پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھ کر مسلمانون کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى	یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگون کو
مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	نعمت (قرآن)، عطا فرمائی ہے اس پر
(النساء - ۸)	جلے مرتے ہین،

اور اُن کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانون سے چھین لی جائے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ	(مسلمانو!) اکثر اہلِ کتاب اپنے
لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ	دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہین کہ تمھارے
كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ	ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر
أَنفُسِهِم (بقرہ-۱۳)	بنادین،

حسد کی تین قسمین اور درجے ہین،

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے گو وہ اُس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہو جائین،

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا	ان منافقون کی خواہش یہ ہو کہ جس
فَتَكُونُونَ سَوَاءً	طرح خود کافر ہو گئے ہین، اسی طرح
	تم (بھی مسلمان) بھی کفر کرنے لگو اور
(نساء-۱۲)	وہ اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ،

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت مین اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اس کو مل نہین سکتی، اس لئے بالعرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لیجائے،

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے،

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لئے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید میں ہے:-

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ	اور خدانے تم میں سے ایک کو دوسرے
بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ	پر برتری دے رکھی ہے، اس کا کچھ
(النساء - ۵)	ارمان نہ کرو،

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لئے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں، اسی لئے فرمایا،

وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (نساء - ۵) اور خدا سے اس کا فضل مانگو،

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے، اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں،

حسد کے سات اسباب ہیں،

(۱) بغض وعداوت، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں اس لئے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت

آئے، اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا، اور اسی کا نام حسد ہے،

کفّار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی،

وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ (آل عمران - ۱۲)

چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے، دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو ہی چکی ہے، اور (غیظ و غضب) جو ان کے دلوں میں (بھرے) ہیں، وہ (اس سے بھی) بڑھکر ہیں،

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا، (آل عمران - ۱۲)

(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے، اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے، تو اس سے خوش ہوتے ہیں،

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہوسکتا ہے،

(۲) حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیونکہ امثال و اقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گذرتا ہے، اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب

اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے،

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہو کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع ومنقاد بنانا چاہتا ہے، اس لئے جب وہ کسی شرف وامتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہو تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع ومنقاد ہو سکے، کفارِ قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے،

أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنْ بَيْنِنَا،	کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام) کی توفیق دیکر اپنا
(انعام - ۶)	فضل کیا ہے،

حسد کا یہ سبب اکابر واشراف سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کے لئے کبر وغرور اور دوسروں کی تحقیر وتذلیل لازمی ہو،

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں، اسکو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے، اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اُس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں، کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے،

أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُولًا	کیا خدا نے آدمی (کو پیغمبر) بنا کر
(بنو اسرائیل - ۱۱)	بھیجا ہے،

(۵) حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہو تو دونوں

باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے، تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹیوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسف علیہ السّلام کے بھائیوں نے اُن کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی، اس کا سبب یہی تھا،

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۝

(یوسف - ۲)

جب یوسف کے (سوتیلے) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہیں ہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (ابن یامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت زیادہ عزیز ہیں

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لئے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہیں، جب اُن کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہیم ہو گیا ہے تو یہ ان کو سخت گراں گذرتا ہے، اور اُن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ منزلت میں اُنکا شریک ہو گیا ہے، وہ اس سے چھن جائے،

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لئے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے اُن کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہلِ عرب پر تفوق حاصل تھا، لیکن اسلام کی وجہ سے اُن کا یہ تفوق جاتا رہا، اس لئے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گئے، منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہلِ مدینہ

اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا، اس لئے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا[۵]،

(۷) حسد کا ساتواں سبب خبثِ نفس اور بد طینتی ہے، کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہی اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو اُن کو مسرت ہوتی ہے، اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لئے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں،

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر اُن لوگوں سے تعلق رکھتے جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لئے بیگانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ صرف اُن لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں باہم ربط و اشتراک ہوتا ہے،

ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لئے حسد کرتا ہی کہ ان میں ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے، اس کے بخلاف ایک عالم یا عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا، کیونکہ اُن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہیں،

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا اس لئے اُن میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا

[۵] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین،

اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہیں، وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے،
اس لئے اصولاً جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ برہم کر سکتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
اُن سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:-

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تجسسوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تباغضوا وکونوا عباد اللہ اخوانا (بخاری کتاب الادب باب ما ینھیٰ عن التحاسد والتدابر)	بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو، بلکہ اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ،

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے،

المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقة والرحمة والمحبة والمواساة والمعاونة والنصیحة	اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم و شفقت، غمخواری، محبت، اعانت اور خیرخواہی میں نسبی بھائیوں کی طرح ہو جاؤ،

لیکن یہ اخوت اُسی وقت قائم رہ سکتی ہے، جب ان تمام بداخلاقیوں سے احتراز کیا جائے ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی، اور یہ اور اس قسم کے تمام محاسنِ اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہیں، یا اُن سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، فنا ہو جائیں گے، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں،

كانه قال اذا تركتم هذه	گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا
المنهيات كنتم اخوانا و	کہ جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دوگے
مفهومه اذا لم تتركوها	تو بھائی بھائی ہو جاؤگے، اور اس کا مفہوم
تصيروا اعداء ومعنى كونوا	یہ ہے کہ جب انکو نہ چھوڑوگے تو دشمن ہو جاؤگے
اخوانا اكتسبوا ما تصيرون	اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ
به اخوانا مما سبق ذكره	اخلاقی خوبیاں حاصل کرو جنکی وجہ سے
وغير ذالك من الامور	بھائی بھائی بن جاؤ، اور یہ اخلاقی خوبیاں
المقتضية لذلك نفيا واثباتا	وہ ہیں جن کا ذکر اوپر گذرا اور ان کے
(فتح البارى جلد دهم ص ۴۰۳)	علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں، جو خود بخود

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے مشکل کوئی دل خالی ہوسکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہوسکتا، کہا گیا ان سے نکلنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ فرمایا شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو، اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو، اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ[1] لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسن اخلاق کا خاتمہ ہو جائیگا، اور یہ شرارہ خرمن اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دے گا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور

[1] مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۰۲، مصر،

حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:۔

ایاکم والحسد فان الحسد	تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں
یاکل الحسنات کما تاکل	کو اس طرح کھاجاتا ہے جس طرح
النار الحطب[1]،	آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ہر مسلمان کو اس خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے،

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ	اور بُرا چاہنے والے کی بدی سے جب
(فلق)	وہ حسد کرے،

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الحسد،

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے، اور اسکے مرتکب زیادہ تر رند، بیباک نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن وجمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس قسم کے حالات وواقعات بیان کئے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں،

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں، اور قرآن مجید کی اس آیت میں

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ - ۲۵)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی

اسی کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن زمانۂ حج کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے، اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کئے جا سکتے ہیں، حالانکہ یہ زمانہ صرف

ذکر الٰہی کا ہوتا ہے، ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے، چنانچہ سنن ابی داود میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور مردوں کے ایک[1] مجمع میں خطبہ دیا، اور حمد وثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے، اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے، اور اس طرح خدا کے پردہ میں چھپ جاتا ہے؟" لوگوں نے کہا "ہاں" پھر فرمایا کہ "اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے، تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا میں نے یہ کیا" اس پر سب لوگ خاموش ہو رہے، پھر عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟" اس پر ایک عورت نے دو زانو بیٹھ کر کہا "ہاں" مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں، فرمایا تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی، اور اس نے اس سے مباشرت کی، حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے[2]"

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے، اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدود الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے، ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی، تو وہ اپنی اہمیت کھو دیں گی، اور قول عمل کے لئے ایک دن راستہ صاف کر دے گا، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لئے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں، تو مجاز واستعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے،

[1] دونوں کی نشستیں الگ تھیں، "س" [2] ابو داؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اہلہ،

تاکہ مدعا ظاہر ہو، اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے، چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز واستعارہ ہی کے پردہ میں بیان کئے گئے ہیں، مثلاً

وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ (نساء-۳)	حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بیوی ہم صحبت ہو چکے)
اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (نساء-۷)	یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو، (یعنی ان سے صحبت کی ہو)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے، اسی لئے اس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونا) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لئے اور جو الفاظ پیدا کئے ہیں جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنایے اور استعارے ہیں، اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ، پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہئے، پائخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث میں قضائے حاجت کا لفظ مستعمل ہے، جو ایک کنایہ ہے، قرآن مجید میں اس کے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں،

اَوْجَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (نساء-۷)	یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو،

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہیں، اس لئے استعارۃً اس سے پاخانہ مراد لیا گیا،

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پایں خانہ ہے، چونکہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں، اس لئے استعارۃً ان کو پایں خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہو گیا، اور کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے "برص" کی تعبیر "سوء" کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں،

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ	اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنے بغل میں
تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ	رکھ لو، (اور پھر نکالو) تو وہ بدوں اسکے
آيَةً أُخْرَىٰ	کہ کسی طرح کا روگ ہو، سفید (براق)
(طٰہٰ - ۱)	نکلے گا (اور یہ دوسرا معجزہ ہے)

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے، جس کا نام سبّ و شتم یا گالی گلوج ہی، اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہی، زمانۂ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہی اور اس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے ایک عام لفظ "فسق" سے اس کی ممانعت کی،

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ	حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات
فِي الْحَجِّ ؕ (بقرہ - ۲۵)	کرنی چاہئے نہ فسق کی نہ جھگڑے کی،

گالی گلوج کی مختلف صورتیں ہیں، بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے اس کے نسب میں عیب نکالتا ہی کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہی یہاں تک

کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض شلاً برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی بُرا کام کیا ہے، یا اس کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کیا گیا ہو تو اس کا اظہار کرتا ہے

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ کو بُری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ	مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (وہ ظلم کو برملا بیان کر سکتا ہے)
(نساء - ۲۱)	

اور قرآن وحدیث میں جا بجا بدزبانی سے بچنے کے حکم و مصالح نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں

(۱) ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوج میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے، اگر ایک شخص کسی کے باپ کو بُرا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اسلئے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دیجائے، خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ	اور (مسلمانو!) خدا کے سوا دوسرے جن
دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا	معبودوں کو پکارتے ہیں، اُن کو بُرا نہ
بِغَیْرِ عِلْمٍ،	کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر
(انعام - ۱۳)	خدا کو بُرا کہہ بیٹھیں گے،

اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے، کہا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی اپنے باپ

ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہے گا۔[۱]

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے، اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ "اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے" لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا تو برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے، فرمایا "عائشہ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔"[۲]

(۳) بدزبانی دور وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے، ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی، تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے[۳]، امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

(۴) رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں، اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے، ایک بار کچھ یہود

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ [۲] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا [۳] ایضاً باب ما ینہی من السباب واللعن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے السام علیکم (تم کو موت آئے)، کہا حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا علیکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ علیکم یعنی تم کو موت آئے، خدا تم پر لعنت بھیجے اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "اے عائشہؓ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو"۔[۱]

(۵) گالی گلوج کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منھ سے نکالا جاتا ہے، اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرات پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھکر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا، ارشاد ہے کہ "بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے، اسکو بدنما بنا دیتی ہے، اور حیا جس چیز میں ہوتی ہے، اسکو زینت دیدیتی ہے"[۲] اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے،

(۶) گالی گلوج سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہئے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں[۳]، مُردوں کو بُرا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مُردوں کے عزیز واقارب اور دوست احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے[۴]،

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا۔ [۲] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی الفحش [۳] مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام وای اموره افضل [۴] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الشتم

(۷) گالی گلوج لڑائی کا پیش خیمہ ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے، اس لئے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہو وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق تو ضرور ہے، اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر[۱]	مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے، اور اس کے ساتھ لڑنا کفر،

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی، اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کریگا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لیس المومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی[۲]	جو مسلمان ہو وہ طعن وتشنیع نہیں کرتا، لعنت نہیں بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے[۳]

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوج اور لعن وطعن سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں، مثلاً جب کوئی شخص حوادث زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے مشیت الٰہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے

۱؎ بخاری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن، ۲؎ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعن

۳؎ بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق،

بُرا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے، اور اس مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے، کہ "خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو بُرا بھلا کہتا ہے، حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں"[1] یعنی زمانہ کو بُرا بھلا کہنا خود خدا کو بُرا بھلا کہنا ہے،

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف خدا کی فرمانبردار ہے،[2]

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا،[3] اور یہ اس عورت کی سزا تھی تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے،

اسلام میں گالی گلوج کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دلآزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے، کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی،[4]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا، تو اس کا کہنے والا فاسق کافر نہ ہوگا، تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہوگا،[5]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لا تسبوا الدہر [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعن [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن البہیمۃ [4] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن ومسلم کتاب الایمان [5] فتح الباری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن،

جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ خدا نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے، جس طرح تمہارا دن، تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے،

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحون مین جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی
چھوٹی بداخلاقیون اور بُری عادتون کو گنایا جاسکتا ہے، جن کی ممانعت اسلام مین کی گئی ہو
مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورۂ بالا رذائل مین سے کسی کے تحت مین ہین،
اس لیے اُن کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے، اور چونکہ ان رذائل کے اخذ
رو مین خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہین کی گئی ہے، اس لیے صرف اُن ہی کے بیان
پر قناعت نہین کی گئی جن کو فلسفۂ اخلاق کے مصنفون نے رذائل مین شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی
تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے،

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہو کہ اسلام نے تین اساسی برائیان
قرار دی ہین، اور جس قدر رذائل ہین، ان مین اُن ہی تین مین سے کوئی برائی پائی جاتی ہے،

سب سے پہلی اساسی برائی عدمِ صدق ہی، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان مین
یکسانی نہ ہو، جھوٹ، غیبت، اخلافِ وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغلخوری، دو رخاپن،
جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخین ہین، دوسری اساسی برائی حبِ مال ہی حبِ مال

سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہی، بخالت، حرص و طمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول مین کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہین، تیسری اساسی برائی حبِ ذات ہی، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے، حسد، تکبر، عجب، فخر، بیجا غیظ وغضب، ظلم، کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہین، اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینون اساسی برائیون سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کرے گا، یہ تینون اساسی برائیان ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بیجا خواہشین ہین، جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت مین آرام پائے گا،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَ		اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے
نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی	(نازعات۔۲)	ہونے سے ڈرا، اور اپنے نفس کو غلط
فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰیہٗ		خواہش سے بچایا، تو جنت اسکی آرامگاہ ہی،

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جز ہیں، آداب کہلاتے ہیں، ان ہی آداب کی پابندی وعدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے، ان آداب میں خوبی و لطافت ملحوظ رکھنا حسنِ آدب ہے، اس کی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے، اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے، اور یا یہ کہ وہ کام خوبی بصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلام علیہ السّلام نے اپنی عملی و قولی ہدایات سے مسلمانوں کیلئے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے،

دنیا کی دوسری قومین مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب وعوائد یعنی اٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہین، عیسائی قومون نے مذہب انجیل سے اور آداب وآئین یونان اور روم سے حاصل کیا، لیکن اسلام مین جو مذہب کا سرچشمہ ہے وہی اس کے آداب وعوائد کا ماخذ بھی ہے، اسی لئے اسلام وحشی سے وحشی قومون مین صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لیکر جاتا ہے، اور ان کو چند روز مین مہذب اور شائستہ بنادیتا ہے،

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارم اخلاق سے الگ کردیا ہے، اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب، اور کتاب السلام مین درج کیا ہے، ہم صحاح وسنن کی عام کتابون اور خصوصًا بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کرکے ذیل مین لکھتے ہین،

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہے، اس لئے اُس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام نے اُن کی پیروی کی ہے، یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح[1] کرنا، ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا، یعنی ستر عورت، اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا، اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے، اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ توراۃ کے بیان کے مطابق یہ

[1] ترمذی ابواب النکاح

اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہو۔[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں، ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی، جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصالِ فطرت کہتے ہیں، امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے[2]، ایک حدیث ہے، ایک صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خصالِ فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرنا، موئے زیرِ ناف اور بغل کے بال صاف کرنا، اور ناخن اور مونچھ ترشوانا، ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں، مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال نچوانا موئے زیرِ ناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا، غالباً کلی کرنی ہوگی۔[3]

فطرت کے یہ آدابِ اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب، اور انگلیوں کا دھونا، ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا، بال نچوانا، مونچھیں ترشوانا، صفائی کے ضروری لوازم ہیں، جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں لمبی ہوتی ہیں، وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں جس سے صرف دوسروں کو کراہت معلوم ہوتی ہے، بلکہ خود اُن کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ

---

[1] توراۃ پیدائش [2] باب الختان الکبیر [3] صحیح مسلم باب خصالِ الفطرہ [4] ایضاً۔

ہیں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت کر صاف کرنا، اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلافِ فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں،

مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے، مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے، یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں، اور اُس شعار کے مخالف ہیں جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی اُمت کے لئے مقرر کیا تھا،

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ، اور داڑھی بڑھاؤ"[۱] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ، اور داڑھی بڑھاؤ"[۲] ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرتمند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے، اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم ورواج کا واہمہ ہے، جس رنگ کی عینک لگایئے دنیا اُسی رنگ کی نظر آئے گی،

---

۱ صحیح مسلم باب خصال الفطرۃ ۲ ایضاً

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب وشائستگی کی باتون مین سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے، گو کہ اسلام ایک ایسے ملک مین ظاہر ہوا جہان پانی نسبتہً بہت کم تھا، پھر بھی اس نے بعض خاص حالات مین غسل کرنا فرض قرار دیا، زن وشو کی ہمبستری کے بعد جب تک دونون غسل نہ کرلین نماز جو فرض ہے ادا نہین ہوسکتی، فرمایا،

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوا (مائدہ ۲) — اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو،

کپڑے شرعی طور سے پاک ہون، فرمایا،

وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ ، (مدثر-۱) — اور اپنے کپڑے کو پاک کر،

اگر پاکی کے لئے پانی نہ مل سکے، یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہئے،

فَتَیَمَّمُوا صَعِیْداً طَیِّباً (مائدہ ۲) — تو پاک مٹی کا قصد کرو،

جب نماز پڑھنا چاہین تو پہلے ہاتھ، منہ اور پاؤن دھولین، اور بھیگے ہاتھون کو سر پر پھیر لین

اس کا نام وضو ہے،

اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا — جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منھ اور

وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ — کہنیون تک اپنے ہاتھ دھولو، اور

وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ — اپنے سروں کا مسح کرو، اور اپنے

اِلَی الْکَعْبَیْنِ، (مائدہ-۲) — پاؤں دھوؤ،

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھوکر جماعت مین شریک ہون تاکہ کسی کی گندگی اور بدبوئی سے دوسرے نمازیون کو تکلیف نہ ہو، اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو، قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضو خاص و مقامِ خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا،

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے، فرمایا،

وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ، — اور (اللہ) طہارت کرنے والون کو

(بقرہ-۲۸) — پیار کرتا ہے،

اسی طہارت کی پابندی، اور دلون مین طہارت کا خیال پیدا کرنے کیلئے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے، مثلاً

۱۔ آپ نے فرمایا جب کوئی شخص سوکر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے، اس کو پانی کے برتن مین ہاتھ نہین ڈالنا چاہیے، کیونکہ سونے مین معلوم نہین کہ اس کا ہاتھ کہان

کہان پڑا ہے[۵۱]، اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت مین خیال رکھنا چاہیے، سونے مین کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا،[۵۲]

ہاتھ کی صفائی پر اس لئے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے مین ناپاک ہاتھ پانی مین بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کردے، اس لئے خیال رکھنا چاہیے کہ ہاتھ پانی کے برتن مین اس وقت تک نہ ڈبوئے جائین، جب تک ہاتھون کی طہارت کا یقین نہ ہو،

۲- دانتون کی صفائی جو بہت سی گندگیون اور بیماریون کی جڑ ہے، ضروری تبلائی، مسواک کرنا سنت ٹھہرایا، فرمایا، اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو مین ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا[۵۳]، ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے، تو فرمایا کہ تمھارے دانت زرد کیون دیکھ رہا ہون مسواک کیا کرو،

(مسند احمد ج ۱ ص ۲۱۴)

۳- عام راستون اور درختون کے سایہ مین قضائے حاجت نہین کرنا چاہیے،[۵۴] یہ اس لئے کہ راستہ چلنے والون اور درخت کے سایہ مین بیٹھنے والے مسافرون کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو،

۴- ٹھہرے ہوے پانی مین پیشاب کرکے پھر اس مین غسل کرنا جائز نہین، ایسے ٹھہرے ہوے پانی مین غسل جنابت بھی نہین کرنا چاہیے بلکہ جنب کو چاہیے کہ اس سے پانی لے کر

[۵۱] مسلم کتاب الطہارۃ [۵۲] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [۵۳] ایضاً [۵۴] ایضاً،

غسل کرے، کیونکہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسروں کے لئے ناپاک یا قابلِ کراہت، بلکہ عالم حالت مین خود اسی کی طبیعت کے لئے گھن پیدا کرے گا،

۵۔ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہوکر پیشاب نہین کرنا چاہئے، کیونکہ اس حالت مین یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائین، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے، اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے، اگر یہ احتمالات نہ ہون، یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے،

۶۔ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہئے، کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہین،

۷۔ غسل خانہ کی زمین مین پیشاب نہین کرنا چاہئے خصوصًا جب کہ وہ کچی ہو، کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹین گندی اور ناپاک ہوکر اڑین گی، اور بدن کو ناپاک کرین گی، یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل مین پیدا کرین گی،

۸۔ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہئے، ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو لینا اچھا ہے استنجا بائین ہاتھ سے کیا جائے، اس مین داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے،

۹۔ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہئے،[1]

۱۰۔ ہفتہ مین ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے،

---

[1] یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ مین دیکھئے، ۱۲

بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے،

اسلام نے اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے، اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگدست اور پشمینہ پوش تھے، اور محنت مزدوری کرتے تھے، اُن کی مسجد نہایت تنگ، اور اس کی چھت نہایت پست تھی، جو چھپر کی تھی، ایک بار گرم دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے آئے، تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا، اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو، اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے[۱] جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بدبودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی،[۲]

۱۱- جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیے، چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، تو فرمایا کہ اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا،[۳]

---

[۱] ابو داؤد کتاب الطہارۃ [۲] مسلم کتاب الصلوٰۃ [۳] ابو داؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب وفی الخلقان،

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت ونظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد، غلو اور وہم ووسوسہ کی حد تک پہنچ جائے، اس بنا پر اسلام نے بعض اُن سختیوں کو دور کیا ہے، جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں، مثلاً یہودیوں کے مذہب کے رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لئے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے، تب نہانے والا پاک ہو، لیکن اسلامی تعلیمات کے رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائیں، اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا، تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے، لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔[1]

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے، صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی،

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ　　　اور (اے پیغمبر لوگ) تم سے حیض

---

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین،

قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ	کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو انکو
فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ	سمجھا دو کہ وہ گندگی ہو تو حیض کے دنون
حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ	مین عورتون سے الگ رہو، اور جب تک
فَاْتُوهُنَّ،	پاک نہ ہولیں، ان سے مقاربت نہ کرو، اور
(بقرہ - ۲۸)	جب وہ پاک ہو جائین تو انکے پاس آو،

اس کے مطابق آپنے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو، اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالین قائم کردین، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہین کہ مین اس حالت مین آپکے بالون مین کنگھی کرتی تھی، اور آپکے سرکو دھوتی تھی، ایک بار آپنے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی، مین نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمھارے ہاتھ مین نہین ہے[1]

ناپاکی کی حالت مین مقدس مقامات مثلاً مسجد مین نہین جا سکتے، قرآن مجید کو نہین چھو سکتے، اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہؓ نے حالتِ جنابت مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا، لیکن آپ نے فرمایا کہ "مسلمان نجس نہین ہوتا"[2] یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہین ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے،

ایک عورت نے حضرت اُمِّ سلمہؓ سے دریافت کیا کہ مین عورت ہون اور میرے دامن لمبے ہوتے ہین، اور مین گندے مقامات مین چلتی ہون یعنی زمین مین گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہو کہ

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا [2] ابوداود کتاب الطہارۃ،

دامن میں نجاست لگ جاتی ہو، بولیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کردیتی ہے[1] یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے، وہ اس نجاست کو زائل کردیتی ہے، ایک عورت نے آپ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے، جب بارش ہو تو ہم کیا کریں، فرمایا کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں "ہاں" ہے، فرمایا تو وہ اس کی تلافی کردیتا ہے۔ غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے، اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کرسکتی ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے پاک کردی گئی ہے، اور اسی لئے وہ حالت تیمم میں پانی کی قائم مقام ہوجاتی ہے، جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہوجاتا ہے،

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام[2] کردیا، اور اس کو تمام صحابہ نے ایک برکت سمجھا،

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لئے جائیں، پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کرلی جائے، پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے، پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے، پھر وضو کرتے، لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جڑوں کو ملتے، پھر سارے جسم پر پانی بہاتے، اور آخر میں پاؤں

[1] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [2] بیماری یا پانی نہ ملنے کی صورت میں،

دھوتے، (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے، اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا، لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لئے ہر روز نہائے تو مباح ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہ رہی ہو، اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟[1]

---

[1] صحیح بخاری باب الصلوٰۃ الخمس کفارۃ،

کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہئے، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے، لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اُٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں[1]، اور ابو داؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے[2]، ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا، اور اس کو اس تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہئے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اُس کے لئے جس کے انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں،

(۲) مسلمانوں کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہئے، جیسا کہ حدیثوں میں

[1] ابو داؤد کتاب الاطعمہ
[2] ایضاً

مذکور ہے، اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے، کتنا بڑا کام ہے، یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیے، اس لئے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ کر لینا چاہیے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے، لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا، اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے[1]، اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہہ لے[2]،

(۳) انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے، صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کیلئے خاص کر دیئے جائیں، چنانچہ سب اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لئے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے، اس تخصیص میں ایک طبعی اور فطری مصلحت بھی ہے، انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہیں، اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں، اس لئے زیادہ تر کاموں کے لئے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہیں ہے، یعنی

---

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ، [2] ایضاً،

دایاں پہلو، تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کیلئے لگاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی چستی اور طاقت ہوتی ہے، اسی لیے کھانا، پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہیے،[۱] صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے، ایک بار آپ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا، مجلس میں آپ کے داہنے جانب ایک بدّو بیٹھا ہوا تھا، اور بائیں جانب حضرت ابو بکرؓ تھے، آپ نے دودھ پی کر بدّو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے[۲] ایک بار آپ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، اس نے کہا کہ میں آپ کا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا، مجبوراً آپ نے پہلے اسی کو دیا،[۳]

(۴) کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیے، بیچ سے نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائیگی گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا، اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے، اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا، اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت سے تعبیر کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے[۴]

(۵) اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو

---

[۱] ابو داؤد کتاب الاطعمہ [۲] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [۳] ایضاً [۴] ترمذی باب الاطعمہ باب ما جاء فی کراہیۃ الاکل فی وسط الطعام،

کر کے نہیں[1] کھانا چاہیے، کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تاکہ کوئی دوسرا آکر شریک نہ ہو جائے، اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھالے، یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص و طمع پر دال ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے،

(۶) کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے، کیونکہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فیہ نکالنے کی طرف سے چڑھ اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے، اس لئے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیے، ورنہ چھوڑ دینا چاہیے،[2]

(۷) سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسنِ معاشرت کا ذریعہ ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند فرمایا ہے، کہ دوست و احباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، الگ الگ کھانا بھی جائز ہے، اور ایک ساتھ بھی،[3] لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے، اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا، کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی زیادہ

---

[1] سنن ترمذی ابواب الطعام [2] بخاری کتاب الاطعمہ [3] نور - ۸

کھاتا ہے، سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے، اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے، اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے ایک بار صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے، فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو، صحابہؓ نے کہا ہاں، فرمایا ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ کرو تو برکت ہوگی۔[۱]

(۸) کھانا ٹیک لگا کے بیٹھ کر یا منھ کے بل سو کر نہیں کھانا چاہئے[۲]، کیونکہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لئے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے، کھانے کے لئے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کرکے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے، یا دو زانو بیٹھ کر، اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر،[۳] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، میں بندہ ہوں، غلاموں کی طرح کھاتا ہوں یعنی خاکساری سے۔[۴]

(۹) کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہئے، ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے،[۵] خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے

---

[۱] ابو داؤد کتاب الاطعمہ [۲] ایضاً [۳] ابو داؤد کتاب الاطعمہ و ابن ماجہ کتاب الاطعمہ شرح سفر السعادۃ فیروز آبادی شیخ عبدالحق محدث دہلوی [۴] ابو داؤد و ابن ماجہ مع زرقانی علی السیرۃ ج ۴ ص ۳۹۰

میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لئے لالچ سے بچا ہے اور ایثار سیکھتا ہے،

(۱۰) کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منھ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہئے، اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پوچھنا چاہئے۔[1]

(۱۱) پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہئے،[2] اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے، اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے، اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی،

(۱۲) پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہئے،[3] کیونکہ ممکن ہے کہ منھ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن میں پڑ جائے اور دوسرے آدمی کو مکروہ معلوم ہو، پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لیکر باہر نکلتی ہے، اس لئے اس سانس کو اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہئے،

(۱۳) پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہئے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے، اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے، البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے،[4] مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں، اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے، البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے،

---

[1] بخاری کتاب الاطعمہ [2] بخاری کتاب الاشربہ [3] ابو داؤد کتاب الاشربہ [4] ایضاً وموطا امام محمد،

(۱۴) پانی مشکیزہ کے منھ یا پیالے کے سوراخ سے نہیں پینا چاہئے، کیونکہ اس سے اوّل تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا، پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں،

(۱۵) کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کر رکھنا چاہئے، تاکہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے، یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے،

(۱۶) کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے، کہ اس نے کھلایا اور پلایا، اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں میں آئی ہیں، جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ،

یعنی اُس خدا کا شکر ہے، جس نے ہم کو کھلایا پلایا، اور مسلمان بنایا[۲]،

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الاشربہ [۲] عمل الیوم واللیلۃ ابن السنّی باب ما یقول اذا اکل،

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہو، تاکہ یہ مجلس شرکا کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو، ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں،

(۱) مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے وہیں بیٹھ جانا چاہئے، یہ نہیں کرنا چاہئے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے، کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے، اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے، صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے، انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں

ل ادب المفرد باب مجلس الرجل حیث انتہی،

کیلئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے اسی لئے "تخطی رقاب" یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیر قدم لاکر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور پر سے منع کیا گیا ہے،

(۲) مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہئے[1]، کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے، اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے،

(۳) اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے[2]، دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا، اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا،

(۴) اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا[3]، کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لئے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں مو انست اور بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے،

(۵) اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہئے، ایسے شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے[4]، کیونکہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اسکا منھ ہوگا اور کچھ لوگوں کی طرف بیٹھ ہو گی، جو ایک قسم

---

[1] ترمذی ابواب الاستیذان باب جاء فی کراہیۃ ان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ [2] ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ہو احق بہ [3] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنہما [4] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ القعود وسط الحلقۃ،

کی بدتمیزی ہی، یہ بھی ممکن ہے مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تاکہ سب کو ہنسا سکیں اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے،

(۶) مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہئے،[1] کیونکہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی، اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا تھا، اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزت نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا،

(۷) راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہئے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہی، اور ہر آیند و روند کو تکنا بداخلاقی ہے، لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہئے، یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا،[2]

(۸) انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے، اس لئے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے، ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل [2] ایضاً باب فی الجلوس فی الطرقات،

اس طرح بیان فرمایا ہو کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں جن میں باہم آشنائی ہوتی ہو، ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہو، اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے، اُن میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، ایک مشہور مثل ہو کہ "اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ"، اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہو کہ "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہو، اس لئے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہو" پھر فرمایا کہ "اچھے ہمنشین اور بُرے ہمنشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہو، مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا، یا اس کو خریدو گے یا اس کو خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی"[۲]

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے، کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے، فرمایا کہ "اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے"[۳]

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے، اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے، اور دوسروں کے لئے جگہ بنانے کے لئے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا اور

[۱] ادب المفرد باب الارواح جنود مجندہ، [۲] بخاری کتاب البیوع باب فی العطار و بیع المسک،

[۳] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی الاتکاء،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ	اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں
لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا	میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو، اللہ تمھارے
يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا	لئے کشادگی کریگا، اور اگر کہا جائے اُٹھ جاؤ
فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	تو اُٹھ جاؤ، اللہ انکے رتبے اونچے کریگا جو
مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ	تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا، اور
دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (مجادلہ)	اللہ تمھارے کاموں کی خبر رکھتا ہے

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ انہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، منافقوں کے اس طرز عمل کی بُرائی قرآن پاک نے برملا کی ہے،

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ	یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے
لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (مجادلہ ۲)	کہ دلگیر کرے ایمان والوں کو،

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں، وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمکو اس راز کے قابل نہیں سمجھا دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں اسی لیے ارشاد ہوا کہ تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا اغمگین ہو گا[1]،

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہیے کہ المجالس بالامانة قول نبوی ہے[2]

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب فی التناجی [2] ایضاً باب فی نقل الحدیث،

آدابِ ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لئے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دیگا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لئے ایک مکان بنا لیا،[1]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرے سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہئے، اسی لئے فرمایا کہ "تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے"[2]، ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن وسلامتی کا پیام ہو، جس کو شریعت نے السّلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے، چھوٹے بڑے کو بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں،

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لئے

[1] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی زیادۃ الاخوان [2] ایضاً باب ماجاء فی صنائع المعروف،

کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا، اور ہے، عرب کے لوگ ملاقات کے وقت انعم اللہ بک عینا، وانعم اللہ بک صباحا، کہتے تھے یعنی "تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں" "تمہاری صبح خوشگوار ہو" امراء و سلاطین کے لئے دوسرے الفاظ تھے، ایرانی "ہزار سال بزی" "ہزار برس جیو" کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو "گڈ مارننگ" (اچھی صبح) شام کو "گڈ ایوننگ" (اچھی شام) رات کو "گڈ نائٹ" (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، مگر اسلام نے ان سب کے بجائے "السلام علیکم" کا لفظ ایجاد کیا، اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

(۱) یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں والسلام علی (موسیٰ) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں وسلام علی المرسلین (صٰفٰت) ظاہر ہوتا ہے،

(۲) اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے، دنیوی تمتعات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں، اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے،

(۳) اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے،

(۴) اس میں مبالغہ آمیز تعلیم نہیں پائی جاتی، جو بندگی، کورنش، آداب عرض، اور

دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس ابن سعدؓ نے آپؐ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کریں، تو آپؐ نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی[ل] ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! جب ہم سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لئے جھک جائے، فرمایا "نہیں" اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے، فرمایا "نہیں[ک]" اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے، فرمایا "ہاں[سے]"۔

(۵) دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے، وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل و اولاد، دنیا و آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے،

(۶) جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بے گانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے، اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں،

ل ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ ک یہ ممانعت اس موقع سے مخصوص ہے، جہاں کوئی شرعی محذور ہو، مثلاً ملنے والا امرد ہو، یا کوئی اور کوئی شہوت انگیز صورت ہو،

سے ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی المصافحہ،

(۷) اسلام نے اپنے پیرووں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور "واچ ورڈ" مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بے گانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں، اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں، یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملتِ محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں،

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی :۔

یاایھا الناس افشوا السلام	لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ	
واطعموا الطعام وصلوا والناس[۱]	جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو	
نیام تدخلوا الجنۃ بسلام	یہ سب کروگے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ	

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ "تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوگے، جب تک ایمان نہ لاؤ، اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤگے جب تک آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کروگے تو باہم محبت کرنے لگوگے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ[۲]" سلام کرنے کیلئے شناسا و غیر شناسا جانے اور انجان کی تخصیص نہیں[۳]، مرد اور عورت

---

[۱] ترمذی باب الزہد صفحہ ۴۰۹ [۲] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی افشاء السلام،
[۳] بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ،

کی تفریق نہیں ہے[1]، بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں ہے[2]، البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لئے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب واحترام کا لحاظ کرے اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گذرنے والا بیٹھنے والے کو، اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع وخاکساری کا اظہار ہو، اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیئے[3]۔

ان مصالح کے لحاظ سے آپ نے اپنے اہل وعیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا[4]، مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے[5]، سلام میں رحمۃ اللہ وبرکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "السلام علیکم" آپ نے فرمایا "اس کو دس نیکیاں ملیں" دوسرا آدمی آیا تو کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ آپ نے فرمایا "اس کو بیس نیکیاں ملیں"، تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپ نے فرمایا "اس کو تیس نیکیاں ملیں[6]"۔

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ

---

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء علی الرجال [2] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان [3] کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ [5] ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود [6] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما ذکر فی فضل السلام

اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے، چنانچہ قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے،

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا	اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر
بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا	سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں)
	اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو، یا
(نساء - ۱۱)	(کم سے کم) ویسا ہی جواب دو،

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے، لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے،

(۲) ملاقات کے وقت اظہار محبت اور اظہار مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے، اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لئے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے[۱]، مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے[۲]، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول کر لیا، اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا، بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ممانعت آئی ہے، یوں اگر کوئی شرعی محذور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے، چنانچہ

---

[۱] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی المصافحہ [۲] ابوداود کتاب الادب باب فی المصافحہ

ایک بار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو گلے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا،[1]

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت مین کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہین حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آتی تھین تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے، اور جب آپ ان کے یہان آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھین، ایک موقع پر جب حضرت سعدؓ بن معاذ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھکر جائین اور ان کو لے آئین،[2]

دوسری قومون مین ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو بکلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیرون اور بادشاہون کے لئے کھڑے ہوتے تھے، اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس مین ایک دوسرے کے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہین،[3]

اس قسم کے موقعون پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت مین موجود ہے،[4]

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی المعانقة والقبلة [2] یہ دونون واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء فی القیام مین ہین۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی مرحبا۔

(۳) ملاقات یا کسی اور کام کے لئے کسی کے گھر مین جانے کے لئے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے، اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید مین دیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ

(نور - ۴)

مسلمانو! اپنے گھرون کے سوا دوسرے گھرون مین گھر والون سے پوچھے اور ان سے سلام علیک کیے بغیر نہ جایا کرو یہ تمھارے حق مین بہتر ہے، (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہو) کہ (جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر مین کوئی آدمی موجود نہین تو جب تک تمھین (خاص) اجازت نہ ہو ان مین نہ جاؤ اور اگر (گھر مین کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہین) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ یہ (لوٹ آنا) تمھارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اسکو جانتا ہے۔

غیر محرم عورتون سے ملنے کے لیے ان کے شوہرون سے اجازت لینے کی ضرورت ہے[۱]

[۱] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجہن ۔

کسی کے گھر مین داخل ہونے کے لئے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہین، لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت مین ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہین کرتا کہ دوسرون کی نگاہ اس پر پڑے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازون پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا، اس لئے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے داہنے یا بائین کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہین کھڑے ہوتے تھے تاکہ اندر کی چیزون پر نگاہ نہ پڑے[1] ایک بار ایک شخص آئے اور آپ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہوگئے، تو آپ نے فرمایا، کہ دروازہ کے داہنے یا بائین کھڑے ہو، کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزون پر نگاہ نہ پڑنے پائے[2]، ایک حدیث مین ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر مین تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہین[3]، ایک بار کسی نے آپ کے حجرہ مین تاک جھانک کی، آپ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر مین یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمھاری آنکھون مین کونچ دیتا، پھر فرمایا، انما جعل الاذن من قبل البصر یا فرمایا انما جعل الاستیذان من اجل البصر، یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لیے ہے

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی العورات الثلاث [2] ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب۔
[3] ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقؤا عینیہ فلا دیۃ لہ،

کہ اس کو دیکھو نہیں[1]

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آسکتا ہوں[2]، تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے[3]، البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں[4]، اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو، اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے[5]، دوکانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں[6]، خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہیئے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی، یا گھر میں غیر محرم عورتیں آگئی ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں،

یہ آداب تو اجنبی اور ناآشنا لوگوں کے لیے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں، اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے، یا لونڈی غلام، اس لئے اگر ان کے لئے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے

---

[1] اس کتاب کے ص ۰۰ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں، انما الاذن لاجل الرؤیۃ مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کئے گئے ہیں، دیکھیے صحیح بخاری کتاب الاستیذان باب الاستیذان من اجل البصر و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الاستیذان [3] ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان [4] ادب المفرد باب اذا دعا الرجل فہو اذنہ [5] ادب المفرد باب لا یستاذن فیہ [6] ادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق،

ہیں، ان کے لیے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے، اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کردی ہے، یعنی نماز عشا کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہو اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لیے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ	مسلمانو تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی
الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ	لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سن بلوغ
لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ	کو نہیں پہنچے، تین وقتوں میں تمہارے
مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ	پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں
حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ	(ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے)
الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ	جب تم دوپہر کو (سونے کے لیے معمول
الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ	کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو، اور
لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ	(تیسرے) نماز عشا کے بعد (یہ) تین وقت
جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ	تمہارے پردے کے وقت ہیں، ان
عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ	(اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ	دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن
الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ	چلے جانے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ)
وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ	اکثر تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں
الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا	(اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی

اسْتَأْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے
جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے، (تو بار
بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف
ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے
کھول کھول کر بیان کرتا ہے، اور اللہ
جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور (مسلمانو!)
جب تمہارے لڑکے حد بلوغ کو پہنچیں
تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے
بڑی عمر کے گھر دن میں آنے کے لیے) اذن
مانگا کرتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی اذن
مانگنا چاہیے،

(نور - ۸)

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السّلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو،

فَقُولَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰه ۲) تو تم اُن سے نرم بات کہنا

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند، اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لیے فرمایا،

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ ۱۰) اور لوگوں سے اچھی بات کہو،

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو، یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو، یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے اُنْظُرْنَا (ہمارا خیال کیجیے) کی جگہ رَاعِنَا کہتے، جس میں تخفیف کا چھپا ہو پہلو نکلتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا اے ایمان والو! راعنا نہ کہو،

وَرَاعِنَا وَقُوْلُوْا انْظُرْنَا (بقرہ ۱۳) اُنْظُرْنَا کہو،

اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء رکوع ۸ میں ہے،

باتیں ایسی کرنی چاہئیں جو منصفانہ اور درست ہوں، اگر جماعت کے جملہ افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ	اے ایمان والو خدا سے تقوی کرو
وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ	اور بات سیدھی کہو، اللہ تمہارے
لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ	کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے
ذُنُوْبَكُمْ (احزاب ۔ ۹)	گناہ معاف کرے گا،

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا،

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ	تو (اے نبی کی بی بیو) دبی زبان سے
الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ	بات نہ کیا کرو ایسا کروگی تو جس کے دل
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا	میں کسی طرح کا کھوٹ ہے وہ خدا جانے
	تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کریگا
(احزاب ۔ ۴)	اور بات کرو تو معقول بے لاگ،

مردوں کو نرم، معقول اور دلجوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید کی، اور اس کا ثواب

صدقہ کے برابر بتایا ہے، فرمایا،

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ	نیک بات کہنی اور درگذر کرنا اس
مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى،	خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے
(بقرہ ۔ ۳۶)	دل آزاری ہو،

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ	اور کچھ اپنی آواز پست کر کہ سب
اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ	آوازوں میں بری آواز گدھوں
الْحَمِيْرِ (لقمان ۔ ۲)	کی ہے،

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہو،

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ	اور جو لغو باتوں سے اعراض
مُعْرِضُوْنَ (مومنون ۔ ۱)	کرتے ہیں،

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے، اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے،

خدا فرماتا ہے،

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ	آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا لیکن ایک
رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق ۔ ۲)	نگران اس پر حاضر رہتا ہے،

اس لیے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے،

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخرت

پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے [1]" اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضورؐ کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے [2]" یہ حدیث اُن جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کو دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بنجائیں،

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لیے ملی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد ومعنی درست اور صحیح ہوں، پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو، اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے،

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ — اور جب نا سمجھ ان کو خطاب کریں تو

قَالُوْا سَلَامًا (فرقان - ۶) — وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں،

گفتگو بضرورت کرنی چاہیے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف [2] موطا و شرح للباجی باب ماجاء فی الصدق والکذب و ترمذی کتاب الزہد،

باتین کرتے ہون، اور کو اس مین مبتلا رہتے ہون، اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بد ترین افراد ہین[1]، یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تا قیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے، اور یا اس کی تا قیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے[2]، یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے، کہ دین اور دنیا کے بہت سے کامون کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے، یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے، اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے، اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی، اور اسی سے دونون کے کام بگڑ بھی جاتے ہین، اسی لئے آیا ہے کہ جو دونون جبڑون کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت مین جائے گا[3]۔

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے، بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے، تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے، اسی غرض سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے[4]، اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہین کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت مین نہ لا سکے ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پہلو مین بیٹھ کر حضرت ابوہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہین کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا[5]، حضرت جابرؓ بن عبداللہ

---

[1] ادب المفرد باب فضول الکلام [2] موطا امام مالک باب مایومر بہ من التحفظ فی الکلام [3] موطا امام مالک باب ماجاء فی مایخاف من اللسان [4] ابوداؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث [5] ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ترتیل اور ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا، اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اسطرح ادا فرماتی ہیں،

کان کلام رسول اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایک دوسرے
صلی اللہ علیہ وسلم کلاما فصلا یفھمہ	سے الگ الگ ہوتا تھا، اور جو شخص اسکو
کل من سمعہ[1]	سنتا تھا سمجھ لیتا تھا،

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے،[2]

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لئے لوگ نہایت مسجع مقفّٰی اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں، گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ "خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہو جو اپنی زبان کو اسطرح توڑ تاموڑتا ہو جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہو" نیز فرمایا کہ جو شخص اسلوب کلام

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب الھدی فی الکلام [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام

مین اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگون کو اپنا[1] گرویدہ بنائے خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ دتوبہ نہ قبول کرے گا،[2]

جب چند لوگون کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے، بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منھ کیا جائے، تاکہ دوسرون کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے،[3]

---

[1] یعنی حق کی تبلیغ نہین بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو [2] ابو داؤد کتاب الادب باب ما جاء فی المتشدق فی الکلام [3] ادب المفرد باب اذا حدث الرجل لا یقبل علی واحد،

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ مین متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے، خدا اچھے مسلمانون کی تعریف مین فرماتا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ	اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہین
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (فرقان-۲)	جو چلتے ہین زمین پر دبے پانون

اکڑ کر نہین چلنا چاہیے یعنی چال مین غرور اور تکبر کے انداز نہ ہون، فرمایا،

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا	اور زمین مین اکڑ کر نہ چل (کہ اس
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ	طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے
لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا	اور نہ پہاڑون تک اونچائی مین پہنچ
(بنی اسرائیل-۴)	جا سکتا ہے

دوسری جگہ فرمایا،

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمان-۲) — اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بیشک اللہ مغرور، اور فخار کو پسند نہیں کرتا،

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہئے، کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشار خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گذرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لئے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا،

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (نور-۴) — اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو،

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپالے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں، اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منھ پر بھی آجائے تاکہ مردم کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہیں، پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں،

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ — اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہدے کہ نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی

جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰىٓ	اپنی چادریں، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی[1]
اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (احزاب)	پڑیں، تو کوئی نہ ستائے،
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ	اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہدے
مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ	کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا
فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ	ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا	مگر جو (فطرۃً) کھلا رہتا ہے، اور اپنی
وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى	اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں
جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ	اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، لیکن شوہر
اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ الاٰية (نور-۴)	وغیرہ محرم، کو (آخر تک پڑھئے)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہئے[2]، کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے، اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں، اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے،

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہئے اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے، عورتوں کو وسطِ راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارہ سے چلنا چاہئے، ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل

---

[1] یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتون ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں، [2] سنن ترمذی باب ما جاء فی خراج المرأۃ متعطرۃً،

گئے تو آپ نے یہ حکم دیا، اور اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں[1]،

راستہ چلنے میں ادب و وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لئے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو، بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آکر جماعت میں ملو[2]،

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لئے جوتے پہنے جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو یعنی جوتے پہن کر چلا کرو کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے[4]،

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہیے، یا دونوں پاؤں ننگے رہیں یعنی یہ نہیں کرنا چاہیے، کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو، اور دوسرا پاؤں ننگا ہو[5]، کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے، لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں[6]،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق [2] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار [3] ابوداؤد باب الانتعال [4] ایضاً [5] ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعلٍ واحدۃٍ،

آدابِ سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ میں سفر فرمایا، اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لئے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب وہوا، اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت و مطابقت رکھتے تھے، عرب کی زمین خشک بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارتگری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں، جن میں سے بعض کی، حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں، تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں اُن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں، جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے، اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضروریاتِ زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جنکی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہے

ا۔ سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہیے اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہیے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہیے، جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ

فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے[1] اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکُمْ وَاَمَانَتَکُمْ وَ خَوَاتِیْمَ اَعْمَالِکُمْ یعنی تمھارے دین، امانت اور خاتمۂ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہوں،

(۲) سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہیے[2]، اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا، بلکہ پورا دن کام میں آجاتا ہے، اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کرکے دوپہر کے وقت آرام کرسکتا ہے،

(۳) سفر تنہا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونا چاہئیں[3] اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اور اسباب سفر کی حفاظت ونگرانی میں سہولت پیدا ہوتی ہے،

(۴) اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو اُن میں ایک کو اپنا امیر بنالینا چاہیے[4]، اسی شخص کو کارواں سالار کہتے ہیں،

(۵) سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیے[5]،

(۶) اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے[6]،

(۷) سفر رات کو کرنا چاہیے، حدیث میں اسکی مصلحت یہ بتائی گئی ہو کہ رات کو مسافت

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعاء عند الوداع [2] ایضاً باب فی الابتکار فی السفر [3] ایضاً باب فی الرجل یسافر وحدہ [4] ایضاً باب فی القوم یسافرون یومرون احدہم [5] ایضاً باب فی الطروق [6] ایضاً باب فی التلقی،

خوب طے ہوتی ہے[1]، اور درحقیقت لو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہرحال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لئے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت،

(۸) مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسایش کا خیال رکھنا چاہئے[2]

(۹) رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہئے، کیونکہ راستہ سے جانور گذرتے رہتے ہیں، اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے[3]،

(۱۰) جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے، تو فوراً واپس آجانا چاہئے، کیونکہ سفر بہرحال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے[4]،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سرعۃ السیر [2] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق [3] ایضاً [4] باب السفر قطعۃ من العذاب،

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے، اور فرمایا ہے،

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ	اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک
(روم - ۳)	تمہارا رات کو سونا ہے،

سورۂ فرقان میں فرمایا:۔

وَھُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ	اور اسی نے تمہارے لئے رات کو پردہ
لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ	اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے
النَّھَارَ نُشُوْرًا (فرقان ۵)	ہونے کو بنایا،

سورۂ نبا میں ہے،

وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا وَّ	اور ہم نے نیند کو تمہارے لئے آرام
جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا	اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار
النَّھَارَ مَعَاشًا (نبا - ۱)	بنایا،

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لئے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت

کاروبار اور محنت کے لئے ہے یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گذرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہلِ عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے جس کا ذکر سورۂ نور ع۔۸ میں ہے، حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ، اور رات آرام میں گذاری جائے، اور ہو سکے، تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے، جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات، اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہانتک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، یہ تو عام افراد کے لئے ہے، لیکن خاصانِ خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے،

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (ذاریات-۱) (یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے،

(۱) سُنّتِ نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہیں، نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہئے، کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے، اور نمازِ عشا پڑھکر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو، فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہئے[۱]، یہ اس لئے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے، اور اخیر رات میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے سستی نہ ہو،

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشا کے بعد اسکے لئے بات چیت

---

[۱] بخاری کتاب النکاح [۲] ابوداؤد کتاب الادب باب النھی عن السمر بعد العشاء،

کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نمازِ عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں، اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے،[۱]

(۲) احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہئے، پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے،[۲]

(۳) ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو،[۳] کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے،

(۴) پاکی کی حالت میں سونا چاہیے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے،[۴]

(۵) پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں،[۵]

(۶) ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے[۶] کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہ بند باندھتے تھے، اس لئے اس میں کشفِ عورت کا احتمال ہے، البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طریقہ سے لیٹتے تھے،[۷]

---

[۱] صحیح مسلم باب اکرام الضیف [۲] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم [۳] ایضاً باب فی النوم علی سطح غیر محجر [۴] ایضاً باب ما یقال عند النوم و باب فی النوم علی طہارۃ [۵] ایضاً باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ [۶] ترمذی ابواب الاستیذان باب جاء فی کراہیۃ فی ذلک [۷] ایضاً باب جاء فی وضع الرجلین علی الاخری مستلقیاً

(۷) سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کرلینا چاہئے، کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہئے، چراغ کو بجھا دینا چاہئے، کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھالیجاتے ہیں جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے، یہی حال آگ کا بھی ہے، ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگ تمہاری دشمن ہے جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو،[۱]

(۸) سوتے اور سوکر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہئے سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے اللّٰھم باسمک احیی و اموت (اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں) اور جاگے تو کہے الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور[۲] (اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے) حدیثوں میں اس موقع کے لئے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں،

---

[۱] بخاری کتاب الاستیذان باب لا تترک النار فی البیت عند النوم و باب اغلاق الابواب باللیل، مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے، جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے،

[۲] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم،

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی، جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے، اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہئے وہ چھپے رہیں، اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزء ٹھہرایا، یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہوسکتی،

مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لئے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں اور گٹوں تک اور لونڈیوں کے لئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر[1] قرار دیا گیا ہے، جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں، یہاں تک کہ تنہائی میں بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں، ایک صحابی

[1] عورت کا چہرہ، قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں،

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا، خدا تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہئے[۱] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا، کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں، جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو[۲]

حضرت آدمؑ اور حوا کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے، خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے،

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا — تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا

سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ — ان کے ستر ان پر کھل گئے تو اپنے اوپر

عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (اعراف ۲-۱) درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے،

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا میں آکر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرمگاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انھوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورت خانۂ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اُتار دیتے تھے، اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے[۳] ورنہ یوں ہی ننگے پھرا کرتے تھے، وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب سلیقہ کا یہ سبق دیا

---

[۱] سنن ترمذی ابواب الاستیذان الآداب باب ما جاء فی حفظ العورۃ [۲] ایضاً باب ما جاء فی الاستتار

[۳] صحیح مسلم وطبری تفسیر آیات ذیل،

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ (اعراف-۳)	اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمھاری ستر اور زینت کا سامان، اور یہ پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے،
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف-۳)	اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو،
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (اعراف-۴)	کہدے! کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے،
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (اعراف-۴)	کہدے کہ میرے رب نے تو بیحیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی منع کیا ہے،

ان آیتوں میں جس بیحیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے، اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے، ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصولِ کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف-۳) اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے،

پرہیز گاری کے لباس سے کیا مقصود ہ؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمالِ صالحہ اور یا شرم و حیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہی کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے، اسی لئے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہی، مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباسِ تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں لے لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہی، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیزگاری ہی کا لباس مراد ہے یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقوی اور پرہیز گاری کا منشا ہو اور جو لباس تقویٰ اور پرہیز گاری کا منشا ہے اسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے، شاہ عبد القادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمۂ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں،

"اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے، اور جو منع ہوا ہے، سو نہ کرے، اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے، اور اپنی زینت نہ دکھاوے" (تفسیر اعراف آیت مذکور)

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے، اس حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے،

ا۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہیے،

لے روح المعانی تفسیر آیت مذکور،

کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے، جو مردوں کی جد و جہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے، ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اس کی لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں، یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگائے تو اس کی بھی اجازت ہے

۲- مردوں کے لئے عورتوں کی سی پوشاک، اور عورتوں کے لئے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں، کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور و طریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور و طریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے،

۳- عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے، اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لئے گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائیگا، اسی لئے مرد کو پاجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائیں، بلکہ آپ نے پسند فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک

ورنہ کم ازکم ٹخنوں سے اونچا رہے، فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں فرماتا، البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے،

۴۔ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں، پہننا ٹھیک نہیں، خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں، یا مولویوں کا نمایشی عبا، جبہ، یا صوفیوں کا گیروا رنگ، کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے، اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے،

۵۔ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ "کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں"،

ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو، یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں جائز نہیں، ایک دفعہ حضرت عائشہ رضؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی کپڑا پہن کر حضورؐ کے سامنے آئیں تو آپ نے فرمایا، اے اسماء جب عورت جوان ہوجائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا حلال نہیں،

۷۔ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے

۱؎ یا باریک،

پہنے جاسکتے ہیں، آپ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے، البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں، اور خوشبو کے لئے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا، مردوں کے لئے منع ہے، سبز رنگ کی چادر بھی آپنے اوڑھی ہے، اور اس رنگ کا تہبند بھی آپنے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرمایا ہے،

۸۔ مردوں کے لئے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپنے پسند فرمائے ہیں،

۹۔ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہئے،

۱۰۔ نیا لباس پہنتے وقت آپ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی ان نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا پڑھتے تھے،[1]

الحمد للہ الذی کسانی	اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا
ھذا ورزقنیہ من غیر	اور روزی کیا میری قوت کے بغیر
حول منی وقوۃ	(یعنی محض اپنے فضل سے)

---

[1] اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں، میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد اور ترمذی ہیں، ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی،

آدابِ مسرّت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں، مال و دولت علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہار مسرت کے سیکڑوں موقع پیش آتے ہیں، لیکن یہ مسرت جب حدِ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا،

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ — جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت،

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ (قصص) — اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے،

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لئے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے،

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا — اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے

رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ — مہر پھر وہ چھین لیں اس سے تو وہ ناامید

اِنَّهٗ لَیَئُوْسٌ كَفُوْرٌ، وَلَئِنْ — ناشکر ہو، اور اگر ہم چکھادیں اس کو

وَلَئِنْ اَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّیْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ، (ہود-۱) — آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو کہنے لگے گیئں برائیاں مجھ سے تو وہ خوشیاں کرتا بڑائیاں کرتا،

اور اس کی ممانعت کی ہے،

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰکُمْ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، — اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اتراتے بڑائی مارتے کو،

(حدید-۳)

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہار مسرت کی اجازت دی ہے، اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں،

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجالانا چاہیے، تاکہ غایتِ مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے،

ایک بار مکہ سے مدینہ کو جارہے تھے، جب عزوراء کے قریب پہونچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اس کے بعد دیر تک ٹھہرے رہے، پھر ہاتھ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے اسیطرح تیسری بار بھی

دعا کی، اور سجدہ میں گر پڑے، اور فرمایا کہ میں نے خدا سے اپنی امت کیلئے شفاعت کی دعا کی، تو اس نے میری ثلث اُمت کے لئے شفاعت قبول کر لی، اس لئے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کیلئے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے سر اُٹھا کر اپنی امت کے لئے یہی درخواست کی تو اُس نے میری ثلث امت کے لئے اور میری درخواست قبول کی، اس لئے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کیلئے اور میری التجا کو قبول کیا، تو میں اپنے خدا کے لئے سجدہ میں گر پڑا،[1]

صحابہ کرام کا بھی یہی دستور تھا، چنانچہ حضرت کعبؓ بن مالک کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدے میں گر پڑے، اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارکباد دیکر اُس کی مسرت میں شریک ہوں، چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جوق درجوق آئے اور ان کو مبارکباد دی،[2]

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے اس موقع پر اعزہ و احباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا،[3] اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر [2] بخاری کتاب المغازی حدیث کعبؓ بن مالک

[3] ابوداؤد کتاب الاطعمہ باب الطعام عند القدوم من السفر،

آنے والے کا استقبال کریں تاکہ اس طریقے سے اُن کی مسرت کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جاکر آپ کا استقبال کیا جس میں بچے بھی شریک تھے،[1]

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لئے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو نکاح کی خبر ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے،

فصل ما بین الحلال و الحرام الدف والصوت[2]	حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے،

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے، اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے،

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ کا نکاح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاکر اُن کے پاس بیٹھے، چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیعؓ بنت معوذ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں، جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے، اسی حالت

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی [2] ترمذی کتاب النکاح باب ما جاء فی اعلان النکاح

میں ایک نے یہ مصرع گایا،

وفینا نبی یعلم ما فی غد — ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہو جو کل کی بات جانتا ہو،

تو آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور جو گا رہی تھیں اسی کو گاؤ[1]،

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا، کیونکہ انصار کو گیت پسند ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی[2]،

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعودؓ انصاری بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے، اتنے میں عامر بن سعد ایک تابعی آگئے، انھوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا کہ آپ دونوں صاحب بدری صحابی ہیں، اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے، انھوں نے کہا تمہارا جی چاہے تو تم بھی بیٹھ کر سنو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے، (نسائی باب اللھو والغناء عند العرس)

عربوں میں رسم تھی کہ دولھا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی،

---

[1] بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ [2] بخاری کتاب النکاح باب النسوۃ التی یھدین المرأۃ الی زوجہا ودعائہن بالبرکۃ مع فتح الباری،

بارک اللہ لک وبارک — تمہارے لئے اللہ مبارک کرے،
علیک وجمع بینکما فی — تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں
خیر[1]، — بھلائی میں میل ملاپ رکھے،

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیمہ کہتے ہیں، جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو،[2] اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں،[3] اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں، (نسائی باب الھدیۃ لمن عرس)

مسلمانوں کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن پیش آتا ہے، زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کئے تھے، جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دو دنوں میں خوشیاں مناتے تھے اب خدا نے ان کو تمہارے لئے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا یعنی عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن،[4] خوشی کے ان دو دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا، بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب مایقال للزوج [2] بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولو بشاۃ،
[3] نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر، [4] نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین،

مسرت کے لئے پسند کیا گیا، عید ضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بنا اور فتح کی اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے

ان دونوں دنوں میں اظہار مسرت کے لئے عمدہ لباس پہننا، خوشبو لگانا مسنون فرمایا، اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا، اور دوسرے قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں، وہ اشعار گا رہی تھیں جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت میں حضرت ابو بکرؓ آئے اور کہا کہ "شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں!" لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابو بکر! ہر قوم کے لئے عید کا ایک دن ہوتا ہے، اور یہ ہماری عید کا دن ہے[1]" یعنی اس دن گانا مباح ہے[2]،

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے تھے، ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا، اور حبشیوں سے کہا کہ "ہاں بنو ارفدہ!" اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہانتک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ "بس" انھوں نے کہا کہ "ہاں" ارشاد ہوا

[1] بخاری باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام، [2] بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے بُرے نہ ہوں،

تو جاؤ،[۱]

مسرت کے اس طریقۂ اظہار کا نام "تقلیس" تھا، جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کے لئے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں، عہدِ رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہارِ مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا، تو ان کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ "تقلیس" کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے،

حضرت قیسؓ بن سعد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں، بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے "تقلیس" ہوتی تھی،[۲]

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقۂ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں، اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساطِ خاطر کا اظہار کرے، اسی لئے ان دونوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے، اور آپ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے، اہل و عیال سے لطف اٹھانے اور یادِ الٰہی

[۱] بخاری باب الحراب والدرق یوم العید [۲] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی التقلیس یوم العید

کے ہیں[1]،

اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو، اسی لئے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عیدگاہ کو جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو، اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (بقرہ - ۲۳) کی تعمیل ہو،

[1] شرح معانی الآثار طحاوی صـ ۲۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل و عیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے،

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توام ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے، عربوں میں فخر و غرور اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہو گئی تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لئے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہئے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے،

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے،

اذا مِتُّ فابکینی بما انا اھلُہ　　　وشقی علیّ الجیب یا ابنۃ معبد

جب میں مر جاؤں تو میرے لئے میرے درجہ کے موافق رونا اور میرے لئے گریبان کو چاک کر ڈالنا

منھ پر تھپڑ مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا عام رسم تھی، اور شعراء اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے،

من کان مسروراً بمقتل مالک — فلیات نسوتنا بوجہ نہار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا — تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آکر دیکھے

یجد النساء حواسراً یندبنہ — یلطمن اوجھھن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں — اور صبح کے وقت اپنے گالوں پر طمانچے مار رہی ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ نے فرمایا کہ "جو شخص گریبان پھاڑتا، اور گالوں پر طمانچے مارتا، اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت میں سے نہیں"[1] یعنی یہ میری امت کے کام نہیں،

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ "ان کے منہ میں خاک بھر دو"[2]

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں، اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کرآتی تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخلِ رسم ہو گئی تھی، یعنی کسی میت کے لئے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا، ایک دفعہ ایک خاتون نے

---

[1] ترمذی کتاب الجنائز باب ما جاء فی النہی عن ضرب الخدود [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہ الحزن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "وہ کون سی بات ہے جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے؟" آپ نے فرمایا کہ "نوحہ نہ کرو" وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آکر روئی تھیں، ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں، بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی، لیکن وہ خاتون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی منشا سمجھ گئی تھیں، اس لئے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہیں ہوئیں[1]۔

دستور تھا کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو عام منادی کرا تے کہ لوگ کثرت سے آئیں، اس کو عربی میں "نعی" کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا، حضرت حذیفہ جب مرنے لگے تو (فرمانِ نبوی کی اس قدر احتیاط مدِ نظر تھی کہ) وصیت کی کہ "میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانِ مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے، اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو[2]۔"

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے، اور بخور دان[3] جلا کر لے جاتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے، راگ سے مقصود کفارِ ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہو سکتا ہے، تب یہ مطلب ہوگا کہ "جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجہ نہ لے جائے[4]۔"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں شریک تھے، ایک عورت انگیٹھی

---

[1] ترمذی تفسیر سورۂ ممتحنہ [2] ترمذی کتاب الجنائز باب کراہیۃ النعی [3] باب الاسلام یہدم ما قبلہ واحمد ج۲ ص۱۹۹ [4] ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بہا المیت مع بذل المجہود فی شرح ابی داؤد

لیکر آئی آپ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی،[1]

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا ارادہ ہوا کہ میں تمھارے حق میں ایسی بد دعا کروں کہ تمھاری صورتیں بدل جائیں، لوگوں نے فوراً چادریں اُوڑھ لیں، اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا،[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی، اور فرمایا کہ کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے، البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے، خوشبو نہ لگائے، اور نہ کوئی اور آرائش وزیبائش کرے،[3]

کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے آنسو نکلنا جو فطرت کا تقاضا ہے، بُرا نہیں، لیکن زور زور سے چیخنا چلانا، بین کرنا منع ہے، اور اس پر سخت تہدید فرمائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے جب وفات پائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے، اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں، لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے،[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے"

---

[1] اسد الغابہ جلد ۴ صفحہ ۲۹۵ مصر [2] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی النہی عن التسلب مع الجنائز [3] ترمذی کتاب الطلاق باب ما جاء فی عدۃ المتوفی عنہا زوجہا [4] مسلم کتاب الفضائل باب رحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال

صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلافات ہیں، جس بات پر سب کا اتفاق ہے، وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر و غرور کے لئے حسب حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، اسی وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے[1]،

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو، تو مناسب ہے کہ عزیز، دوست یا محلہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں، کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا، اور فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا[2]،

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، صبر اور دعا دفع غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے، وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ ۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے، یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے، اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی، سمجھایا، مگر وہ نہیں مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو معذرت کرنے آئی، اور صبر کا کلمہ ادا کیا، آپ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہئے[3]،

---

[1] فتح الباری جلد ۳ ص ۱۲۶ [2] ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعۃ الطعام لاہل المیت [3] ایضاً باب الصبر عند الصدمۃ

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں، اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے، قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ - ۱۹) اسی لئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہی،

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارۂ کار ہے، جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا، یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے، اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتا دیا ہے،

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ — تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے، اس پر غم نہ کرو،

(حدید - ۳)

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جمہائی لینے میں انسان کا منھ کھل جاتا ہے، آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منھ سے نکلتی ہے۔ اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے "جمہائی شیطان کی جانب سے ہے، اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے"[1] بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمہائی لے تو اپنے منہ کو بند کرے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے[2]، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت ومجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے[3]، اس لئے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے،

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء فی التثاؤب [3] حجۃ اللہ البالغہ آداب الصحبۃ،

(۱) پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمہائی روکنے کی چیز ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو اسکو روکنا چاہئے، اور ہاہ ہاہ نہیں کہنا چاہئے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منھ پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے[1]"

(۲) جمہائی کے برخلاف آپ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہی، بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے[2]، ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے لیکن جمہائی بدن کے ثقل اور کسل وسستی کا نتیجہ ہے، اس لئے چھینک عمل کے نشاط اور جمہائی اسکے لئے کسل پیدا کرتی ہے" شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں، اور اس طریقے سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرے اور الحمد للہ کہے، دوسرے لوگ اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہیں[3]،

(۳) تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے، بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہی، اس لئے چھینکتے وقت منھ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہئے، اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا[4]،

(۴) انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہی، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہی، خصائص کی بعض

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب [2] ایضاً،

[3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء کیف تشمیت العاطس [4] ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس

کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمائی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے، اور ان کی تضعیف و تردید نہیں کی ہے، بلکہ بعض کی تائید کی ہے[1]، بہر حال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں، لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بد نمائی پیدا کرتی ہے، اس لئے مجمع عام میں اس سے احتراز کرنا چاہئے،

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے، کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے ڈکار لی تو آپ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو، کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں، وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے[2]، اس حدیث سے پُرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے،

آداب کا فلسفہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے، جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے،

تمام متمدن ملکوں کے باشندوں نے خورد و نوش، نشست و برخاست اور وضع و لباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی و معاشرتی حالات میں فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے، اور اس میں مختلف طریقے اختیار کئے ہیں،

(۱) بعض لوگوں نے ان کی بنیاد حکمتِ طبعی کے قواعد پر رکھی ہے، اور ان آداب کو اختیار کیا ہے، جو طب اور تجربہ کے رو سے مفید ہیں،

[1] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۵۰۶ [2] ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۹،

(۲) بعض لوگوں نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے، اور اس میں اپنے مذہب کی پابندی کی ہے،

(۳) بعض لوگوں نے اس معاملہ میں اپنے بادشاہوں، حکیموں اور راہبوں کی تقلید کی ہے، ان کے علاوہ اور اصول و قواعد بھی ہیں جن میں بعض مفید اور بعض مضر ہیں، اور بعض میں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے، اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے، اور جن میں نفع و نقصان کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی اباحت کی حالت میں قائم رکھے جائیں، ان مصلحتوں کی بناپر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس میں امور ذیل کا لحاظ رکھا،

۱۔ ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہے اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی، اس لئے شریعت نے ان سے پہلے، ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائیں مسنون کردیں، جو خدا کو یاد دلاتی ہیں،

۲۔ بعض افعال و اشکال شیطانوں کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں، مثلاً ایک جوتہ پہن کر چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا، اس لئے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، اس کے بخلاف بعض باتیں ایسی ہیں جو فرشتوں سے قریب کردیتی ہیں، مثلاً گھر میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا، اس لئے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے،

۳۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے تجربۃً تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں،

۴۔ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت،

۵ بعض چیزیں وقار اور تمدن کے منافی ہیں، اور انسان کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے[۱]،

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسولِ انام علیہ السلام کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں اور مذہبی اخلاقی تمدنی اور طبی غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، روح اور جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار اور طریقِ زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے، اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے،

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۶۳،

باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں پوری تاکید کر دی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، لیکن ان میں بعض ایسے امور بھی ہیں جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لئے انکے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو، یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید[1] فرمائی گئی ہو، اور اسی لئے انکے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتادیے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے، تو وہ برا نہیں، جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے، وہاں اگر مٹی کی جگہ صابون استعمال کیا جائے، تو یہ کام میں لائے جا ئیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت[2] کاٹا جائے پلیٹیں بدلی جائیں یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں، یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہو، لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لئے زمانہ کچھ ہی بدل جائے، مگر اُن کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں،

---

[1] ہمارے فقہانے اسی کو سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہو۔ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری سے کاٹ کر گوشت کھایا ہو،

حکمتِ ربّانی کا چشمۂ نور

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۝

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آگیا، آپنے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل، اس کے تہذیب و تمدّن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں؛ اور یہ سب کچھ ایک نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا، اگر حضور علیہ السلام کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تھی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ، فلاسفۂ روزگار اور قوموں کے معلم پہونچنے سے عاجز رہے، معلمِ امی صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہونچ گئے،

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب و تمدّن سے ناآشنا، اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ اور سلیقۂ و شعور سے

عاری تھی نہ صرف اخلاق وتمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے، بلکہ اپنی تعلیم وتربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کردی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوؤں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی، اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہئے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسمٰعیلی نسل کے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لئے کی گئی تھی، یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ "یعنی "ایسا نبی جو ان امیوں کو احکام اور اخلاق وحکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم وتربیت سے پاک صاف کر کے نکھار دے" وہ نکھارنے والا آیا، اور نکھار کر دنیا کو پُر بہار بنا گیا صلی اللہ علیہ وسلم۔

امیدوار رحمت

سید سلیمان ندوی

۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ